چولستان
سفرنامہ
آغا سلمان باقر

چولستان

سفر نامہ

آغا سلمان باقر

آب حیات پبلیکیشنز، انارکلی، لاہور

August 2018	Baqir, Agha Salman Cholistan (Safarnama) 280 pages Ab-e-Hayat Publications, Lahore

چولستان، سفرنامہ ایڈیشن اوّل، اگست 2018ء

مصنف : آغا سلمان باقر

فوٹوگرافی : آغا وجدان باقر اور آغا سلمان باقر

کمپوزنگ : ندیم اشرف

ٹائٹل : قیصر علی

پرنٹر : نواز پرنٹنگ پریس، 2 موہنی روڈ، لاہور

پبلشر : عمران الطاف

تعداد : 500

قیمت : Rs. 1000/-

یکے از مطبوعات

آب حیات پبلیکیشنز، 186، نیو انارکلی، لاہور

فون نمبر 042-37324311—042-37320114

☆ موبائل رابطہ برائے ارجنٹ آرڈر 0334-9700890

اِنتساب

چولستان کی بے آب و گیاہ خوبصورتی کے نام

اُن بادلوں کے نام جو رُوہی پر بے نمُ سے گذر جاتے ہیں

اُن ٹوبوں اور قدرتی تالابوں کے نام

کہ اُن کے سُوکھ جانے سے

ہزاروں ذی رُوح، پرندے اور جانور پیاس سے مَر جاتے ہیں

اُن پودوں، جھاڑیوں اور کانٹے دار درختوں کے نام

جو بے آب و گیاہ صحرا میں نہ جانے کیسے زندہ، ہرے بھرے ہیں

دریائے ہاکڑہ کے نام جو صحرا کی ریت کے نیچے آج بھی بہتا ہے

اُن اُونٹوں اور اُونٹنیوں کے نام جو رُوہی میں بے تھکان

چلتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں

اُن سیاہ آبنوسی جلد والی پنہارنوں کے نام

کہ جن کے ننگے پیروں میں آبلے اور سر پر پانی کے گھڑے ہوتے ہیں

اُن ساربانوں کے نام جو اپنی بیویوں سے زیادہ اپنی اونٹنیوں سے

پیار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں

ہم سیاحوں کے نام

جو اس دشتِ ویراں میں

مسرت تلاش کر کے گیت گاتے ہیں۔۔۔!

آغا سلمان باقر

ستمبر ۲۰۱۷ء

فہرست

باب		صفحہ نمبر
-1	ایک سیدھی سڑک جو لاہور سے چولستان جاتی ہے	11
-2	دَم گٹ گوں، دَم گٹ گوں ملنگ، کبوتر، صبح اور شاہ رکن عالمؒ	19
-3	جیناں ملنگنی، پرندے اور دانہ حضرت بہاؤالدین زکریا کی ڈیوڑھی میں صبح	32
-4	صوفیوں کی سرزمین سائیں جی کی جُوئیں، میرے سر میں	40
-5	ہم سمجھے کہ وہ بلیوں کے بلونگڑے ہیں، مگر وہ نکلے چوہے حرم گیٹ کے ریستوران میں ناشتہ ہوتا ہے	45
-6	ملتان سے بہاولپور بہاولپوری نوابوں کی پاکستان سے محبت کا المیہ	49

-7 غلام فریدا، اوتھے چاہ نہ رکھیں
جتھے نا ہیں عشق دا ڈیرا--! 56

-8 محلات کی سرزمین بہاولپور
نورمحل، جس کے انگ انگ سے نور جھلکتا ہے 62

-9 کبھی جمعدارنی کی نورمحل
مہترانی کیسے اپنی نسل بدلتی ہے--!!! 68

-10 نورمحل ایک جیتا جاگتا طلسم خانہ ہے
ملکہ نورفاطمہ کو نورمحل سے نفرت ہو جاتی ہے--! 74

-11 عجیب ڈھنگ ہیں فطرت کے
اعلیٰ لباس خون کی غلاظت نہیں بدل سکتا--! 87

-12 کالے ہرن، سنہری ہرنیاں، لال سوہانرا
غزال آنکھیں، ہی سرخ اور گربہ ہائے وحشی 95

-13 حکایتیں، شکایتیں
کل صبح سے چولستان ایڈونچر شروع ہوگا--!
خرم شکیب نے خبر دی 106

-14 ہمارے سفر کے ہم سفر
شخصیت، خاکے اور کردار 112

-15 صبح سویرے ڈائننگ ہی ڈائننگ
بہاولپوری ناشتہ اور ولایتی لوٹے--! 117

16- چولستان سے محبت کی کہانی
جو پہاڑوں سے اُتر کر صحرا میں دَم لیتی ہے--! 124

17- خواجہ غلام فریدؒ کے دیس میں
جہاں صوفی بستے ہیں، حق ہُو کی صدائیں ہیں 128

18- زرخیزی، دشتِ ویراں میں بدلتی ہے
کبھی گلستان اور کبھی صحرا جھلک دکھاتے ہیں--! 132

19- چولستان کے قلعہ دراوڑ کے اردگرد
ایک عجیب سی، بے مہار دنیا آباد ہے--! 136

20- کئی ہیولے، کئی عکس
میں اُسے مزید اُجڑتے دیکھ رہا ہوں 144

21- عجیب داستان ہے، پیلو کے درخت کی
اس درخت پہ آسیبوں کا سایہ ہے اور میں نیچے بیٹھا ہوں 149

22- میں ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہوں
قلعہ دراوڑ کی دیومالائی مگر حقیقی داستان 157

23- فروری میں جلتی دوپہر اور قلعہ دراوڑ
میں قلعے کے گرد چکر لگا رہا ہوں اور آنسو بہاتا ہوں--! 164

24- فصیل کی اینٹوں سے گھر بنتے ہیں
ہم لوگ قلعہ دراوڑ کو گرا کے دم لیں گے--! 172

-25 قلعے میں سلنڈر پر جگہ جگہ لکھا ہے
سب کافر ہیں، ہمارے سوا --!!! 179

-26 کشمیر کے بچھڑے سیاح دوست چولستان میں ملتے ہیں
دراوڑ کی شاہی مسجد کے زیر سایہ 185

-27 چولستان کا گم شدہ دریائے ہاکڑہ
جو آج بھی رُوہی میں زیر زمین بہتا ہے --! 192

-28 وہ بیویوں سے زیادہ اُونٹنیوں سے پیار کرتے ہیں
صحرا میں ہمارا اونٹوں پر یہ سفر یادگار ہوتا ہے --! 197

-29 میں چولستانی اونٹ پر صحرا میں جاتا ہوں
ایک ہم سفر دراوڑ میں گم ہو جاتا ہے --! 205

-30 راج ہنس کوسٹر کی چھت پر پتنگیں لڑاتے ہیں
ویران ریتیلے رستے، تاریک کھنڈر اور جگمگاتا قلعہ دراوڑ 213

-31 اُس رات چولستان حالتِ جشن میں تھا
سردی، انتظار، بھوک اور پھر پیدل سفر --! 222

-32 اور ہم اُس رات صحرائے چولستان میں
جب راستہ بھول جاتے ہیں --! 226

-33 جب راستہ بھول کر ہم صحرا میں گول گول گھومتے تھے،
تب بھوت جھاڑیاں رستہ روک لیتی تھیں --! 235

-34	چولستان کے صحرا میں آخری ٹون فائر اور وہ کہتی ہے میں پیاسی ہوں اور تم اس سفید چاندی پانی سے منہ کیوں دھوتے ہو--!	242
-35	چولستان جیپ ریلی 2016ء آسمان پر فوٹو ڈرون اور زمین پر دبیز دھول اُڑتی تھی--!	247
-36	میں کوسٹر کی چھت پر کھڑا چینل کو انٹرویو دیتا ہوں، اُدھر حسین بلتی، ٹیپو کرمانی کے ساتھ جیپ دوڑاتا ہے--!	253
-37	دن میں قلعہ دراوڑ کا رُوپ نرالا ہے دیو مالائی داستانیں اور قلعے میں خزانے--!	261
-38	قلعہ دراوڑ میں خوبصورت خواب محل جس کی بربادی دیکھ کر دل خون کے آنسو رُو دیا	266
-39	طلسمات کی دیو مالائی دنیا سے واپسی جنات کے بنا، چولستانی رُوہی کا سفرنامہ ادھورا ہے--!	273

☙

چولستان سفر کے ہم سفر

ہماری ٹیم

آغا سلمان باقر

محمد حیدر

آغا وجدان باقر

عمر فرحان

کمپنی کے نمائندے

خرم شکیب

علی رضا چنگیزی

کرامت علی

یحییٰ قیصر (کک)

خرم شہزاد (ڈرائیور)

فوٹو گرافی:

آغا وجدان باقر اور آغا سلمان باقر

شریک سفر لوگ

ارشاد عالم خان (پشاور)

اسامہ جاوید

ابرار

عمر سعید

رضوان ملک

محمود احمد

عمران کریم

جاذب بابر

صبا اشرف

فاطمہ

سدرہ

تعبیر

ملک عمران کریم

باب ۱

ایک سیدھی سڑک
جو لاہور سے چولستان جاتی ہے

پاکستان کی سرزمین ایک طلسماتی اور حسین دنیا ہے--!
پُراسرار مشرق کا ایک ایسا انوکھا اور رنگین خطہ کہ جس کی دنیا میں کوئی دوسری مثال یقیناً نایاب ہے--!
یہاں کے پہاڑ ہیبت ناک اور اپنے شباب و جمال کی لاجواب تمثال ہیں--!
کوہ قاف سے زیادہ پُراسرار مخلوق ہمارے ملک کے حسین ویرانوں میں بستی ہے--!
ہمارا شمال طلسم خانہ ہے--!
ہمارے شمالی علاقوں میں برف کے پُراسرار اور ریت کے نایاب صحرا ہیں--!
سنسنی خیز جنگل اور گلیشیئر ہیں، جو ایسی ایسی مخلوق سے لدے پھندے ہیں کہ بیان کرو تو جھرجھری آ جائے، کوئی یقین نہ کرے--بس، حیرت سے سن کر منہ تکتا رہ جائے اور اتنا کہے کہ کیا آپ نے دیکھا--؟
آپ کو یقین ہے--؟
پھر بے یقینی کے عالم میں بڑبڑا کر کہے کہ آپ تو وہاں گھومتے پھرتے رہتے ہیں--آپ کہتے ہیں تو

شاید ٹھیک ہی ہوگا--!!!

پہاڑوں کی ناقابلِ بیان اُونچی چوٹیوں کے دامنوں میں ایسے ایسے صحرا ہیں کہ جہاں دن میں کبھی لُو چلتی ہے، تو کبھی خنک، برف، سرد ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہیں اور رات میں ان پہاڑی صحراؤں میں سرد ہواؤں کے ساتھ برف کے گالے اُڑتے پھرتے ہیں-- برفیلی ریت ایسی سیٹیاں بجاتی اور چیخیں مارتی اُڑتی ہے کہ لگتا ہے، جیسے نظر نہ آنے والی مخلوق، برسرِ عام چیختی چلاتی، آپ کے گرد بھاگی پھر رہی ہو-- آوازوں کے یہ ارتعاش، روح و جسم کو اپنی بے نام چیخوں سے لرزا کے رکھ دیتے ہیں--کوئی کہتا ہے، دیکھو تو دیو لڑ رہے ہیں--کوئی کہتا ہے، پریاں اپنے چاہنے والے جنات سے مستیاں کر رہی ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ چڑیلیں ان بلند و بالا برفانی صحراؤں میں بھوت پریتوں سے جب جنسی اختلاط کرتی ہیں تو برفانی ریت بہت زور اور طاقت سے جھکّو اُڑاتی پھرتی ہے اور جب یہ چڑیلیں فرطِ جذبات میں چیخیں مارتی ہیں تو ان کے ہاتھ پاؤں چلانے سے ایسی دہشت ناک آوازیں نکلتی ہیں کہ میرے اور آپ جیسے انسانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں--!

غرض جتنے منہ، اُتنی باتیں ہیں کہ عقل ششدر اور ہوش پریشان ہو جاتے ہیں۔

ایک دن مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے ہر بار پہاڑوں کا ہی رُخ کیا ہے، جہاں گھنے سبزی مائل سیاہ جنگل، ناقابلِ تسخیر پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر، کسی آسرے کے بنا ایسے کھڑے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر کبھی ہوش اُڑ جاتے ہیں اور کبھی رُوح فنا ہو جاتی ہے--!

ایسی ندیاں، جھرنے، دریا اور آبشاریں ہیں کہ کبھی اُن کو دیکھنے، قریب جانے اور عبور کرتے ہوئے، دل دھک دھک کرنے لگتا ہے--اور--کبھی ایسی شادمانی کا روح و جسم کو احساس ہوتا اور سکون ملتا ہے کہ دل و دماغ عالمِ حیرت میں عش عش کرتا ہے، محبت کے گیت خواہ مخواہ گانے لگتا ہے اور مہینوں کے لیے شانت ہو جاتا ہے--!

ان جنگلوں کے کنارے پر تنگ پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے، ایسے ایسے پرندے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ بندہ دنگ رہ جاتا ہے--وہ قدرت کے اِن چھوٹے چھوٹے شاہکاروں کے لاجواب حسن و جمال میں بے اختیار گم ہو جاتا ہے اور تب--تب مجھے تو لگتا ہے کہ میری ہستی، اس دنیا میں کہیں بے معنی تو نہیں ہے--مگر جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب جو میرے گرد منڈلا رہا ہے، چہچہا رہا ہے اور لہرا رہا ہے، بنیادی طور پر میرے لئے اور میرا دل لبھانے کے لیے قدرت نے تخلیق کیا ہے تو دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے--ارد گرد پھیلے نایاب اور حیرت انگیز مناظر، میری روح کو قرار دینے کے لیے بنائے گئے ہیں تو مسرت کا نامعلوم مگر توانا احساس، نئی زندگی میں ڈھل کر رنگ

بکھیرنے لگتا ہے--!

اب کی بار میں نے پہاڑوں کی ہریالی، ان کی فلک شگاف بلندیوں اور ہیبت ناک لامحدود اُونچائیوں سے اپنا رُخ موڑا اور ایک نئی سمت کو اپنی سیاحت کے لیے منتخب کیا--!

صحراؤں کی زرد ریت کو دیکھنے کی خواہش نے بڑی بے چینی سے کروٹ لی--!

جہاں دن ہو یا رات، خشک، ناآسودہ اور گرم ریت بھری ہوائیں اُڑتی ہوں۔

جہاں پانی کی ٹھنڈک نایاب ہو--ہواؤں میں بے چینی بھری خشکی اور گرمائی ہو اور سرسبز وشاداب درختوں کے جھنڈوں کے بجائے، خشک ریت میں خود رَو اُگی کانٹوں بھری جھاڑیاں ہوں کہ جن کی جڑوں میں صحرائی سانپ پورا دن قیلولہ کرتے ہوں--اور راتوں کو کھلے صحرا کی ریت پر سرگشت کرتے ہوں--!

ایسی جھاڑیاں کہ جن میں ایک ایک پُور کے برابر خشک اور بے رحم زہریلے کانٹے اُگے کھڑے ہوں کہ اگر پیر کی مضبوط جوتی کے تلوے میں دھنس جائیں تو پاؤں کے تلوے تک کو چھید کر رکھ دیں--!--منہ سے بے اختیار، کانٹے کی چُبھن سے آہ نکلے--آپ وہیں جلتی، تپتی، خشک ریت پر دھڑ سے بیٹھ جائیں--جب تک کانٹے کو جوتے سے نکال نہ لیں، پاؤں کو راحت نہ ملے اور جب کانٹا نکل جائے اور راحت مل جائے تو گرم پانی کی چھاگل جو آج کے دَور میں بوتل ہوا کرتی ہے، سے ایک گھونٹ گرم پانی نہ پی لیں تب تک سکون نہ ملے--!

دُور دُور تک کوئی سایہ دار درخت نہ ہو--کوئی چھایا، کوئی سائباں نہ ہو--!

دن میں بار بار، رُک رُک کر دیوانے اور مستانے، ریتیلے بگولے اُڑتے ہوں--منہ لپیٹ کر چلو تو سانس گھٹے--منہ کھول کر چلو تو ریت پھانکتے ہوئے چلنا پڑے--!

اونٹ کے کوہان پر سفر ہو تو ہچکولوں سے کسی کل چین نہ آئے--!

رات کی تاریکی ہو تو خنکی کا پالا مارے دیتا ہو--!

چاند نکلا ہو تو صحرا میں دور دور تک وحشت رقص کرتی نظر آتی ہو--!

تاریکی چاندنی میں مدہوشی گھولتی ہو--!

صحرا کی فضاؤں میں سرمئی رومان گھل مل جاتا ہو--!

بے اختیار دل چاہے کہ کسی ریتیلے ٹیلے کی اوٹ میں، کسی خاموش ویرانی کے سحر میں، کسی رنگین آنچل کی چھاؤں میں، ضابطے سے بالاتر، حنا کی خوشبو پھیل جائے اور اپنے آپ میں بانہیں وا کر کے سمیٹ لے اور پاس سے

ریت میں گندرتا سیاہ بچھو، ڈنگ مارنے کو موقع کی تلاش میں ہو کہ اس وقت اس کا زہر بھی نشہ سا لگے--!

صحرا کے لق ودق ریتیلے میدانوں کی اونچی نیچی نشیب وفراز میں، چاند اور چاندنی کا دور تک نام ونشان نہ ہو--اندھیری اور کالی رات، اِدھر کے افق سے اُدھر کے افق تک چھائی ہوئی ہو--ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو--بس آسمان پر تارے ہی تارے ہوں اور وہ لمحہ بہ لمحہ اتنے قریب دکھائی دینے لگیں کہ دل کرے کہ ہاتھ بڑھا کر کسی من پسند تارے کو میں پکڑ لوں--جگنو سمجھ کر--اور اسے اپنی ہتھیلی پر سجا لوں اور اپنی آنکھوں کے قریب کر کے بہت غور سے دیکھنے لگوں--اتنا قریب کر کے ہتھیلی کو دیکھوں کہ میرے ہونٹ اس جگمگاتے تارے کے لبوں کی جھل جل کو چھونے سا لگیں--لشکارے مارنے لگیں اور اپنی ذات میں چمکتے جگنو، روشنی کے مناروں میں ڈھل جائیں اور مناروں کی یہ روشنی، تاریکیوں میں اُجالے بھر دے اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو مگر گداز تمازت روشنی بکھیرنے لگے--!!!

دور تاریکی اور ریت کے چمکتے میدان کے پار، ایک انہونے اور نامعلوم ہیولے کی طرح دیو قامت قلعے کے آثار کبھی نظر آتے ہوں اور کبھی معدوم ہو جاتے ہوں--خاص طور پر جب میدانوں کی ریت مزید ٹھنڈی اور ہوا یخ بستگی سے اٹھکیلیاں کرتی ہو تو ریت میں موجود ابرق، شیشے اور پتھروں کے ذروں کے جگنو زمین سے جوق در جوق اُگنے سے لگیں--کبھی ستاروں کے کہکشاں جگنو بن جاتے ہوں اور کبھی ریت کے چمکیلے ذرّے مہتابی میں ڈھل جاتے ہوں--تب وہ ہیبت ناک، مہیب دیو نما قلعہ پہلے سے بھی زیادہ ہول ناک اور آسیب زدہ نظر آنے لگتا ہو--!

صحرا کے میدانوں میں دُور دُور بکھری جھاڑیاں رُوپ بدل بدل کر اپنی شکلیں دکھائیں--کبھی لگے کہ کچھ بھوتنیاں آپس میں سر جوڑے، بیچ میدان کے بیٹھی ہیں اور کسی کو کچا کھا رہی ہیں--ہوا کا جھونکا آئے تو جھاڑیوں کی بھوتنیاں اپنے زمین پر جھکے کولہے اس انداز میں مٹکائیں کہ خوف کی لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتی جائے--کبھی ایسے لگے کہ بھوت جھاڑیاں صحرا میں ہوا کے زور سے اِدھر اُدھر کبڑی اور بڈھی مائیوں کی طرح بیٹھے بیٹھے چلتی پھرتی ہیں--پھر لگے کہ کبڑی بڈھی بھوتنیوں کی ٹولی ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر خرمستیاں کرتے کرتے غائب سی ہو گئی ہیں--میں اسی طلسماتی دنیا کے حسین فریب میں کھو جانا چاہتا ہوں--مجھے اسی دھوکے اور فریب کا شکار ہو جانے کا اشتیاق ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ رات کے اُجالے اور اماوس کے خوف زدہ کر دینے والے اندھیروں میں صحرا کیسے جاگتا، سانس لیتا اور نظارے بدلتا ہے--!

سنا تھا کہ صحراؤں میں رات کو ریت اور تاریکی بولتی ہے--!

میں سننا چاہتا ہوں کہ صحرا کی بے باک خاموش راتوں میں ریت کیسے بولتی ہے--!

خاموشی کیسے بولتی بلکہ چیختی ہے--سن رکھا ہے کہ جب وہ خاموشیاں ویرانوں میں بولتی ہیں تو مزید خاموشی چھا جاتی ہے--اصل میں اس خاموشی اور تاریکی سے گھبرا کر آپ کا اندر بولنے لگتا ہے--جس کا ایسے میں بولنا، آپ کی زندگی کے ہونے کا پتہ دیتا ہے--!

ہاں، کبھی کبھی گرمیوں کی راتوں میں کونجوں کی ڈاریں، جب صحرا کے آسمان کی سیاہی مائل نیلی چھت پر سے ایک تکون کی صورت میں گذرتی ہیں تو سب سے آگے والا سردار کونج ایک چیخ کی صورت میں بولتا ہے--جب وہ کونج بولتا ہے تو اس کے عین پیچھے اڑتی ملکہ کونج اور اس کی داسیاں جواب میں اپنے اپنے نر کونجوں کو اپنی سریلی آوازوں میں دعوت مبارزت حُسن دیتی ہیں--نر کونج کی آواز میں وجاہت ہوتی ہے اور اس کی مادہ کونج کے جواب میں خوش لحنی کے ساتھ ساتھ محبت اور جنسی خواہش کی مبہم تمازت صاف سنائی دیتی ہے--!

مجھے انہی وحشی اور خواہشوں سے بھری آوازوں کو سننے کی تمنا صحرا کی طرف کھینچ رہی ہے--!

میں چولستان کے صحراؤں میں جانا چاہتا ہوں--!

میں نہیں کہتا کہ چولستان کی صحرائی ہوائیں اور بگولے مجھے پکار رہے ہیں--!

بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں چولستان کو پکار رہا ہوں--!

مجھے چولستان کے گرم دن کی بھاپ اڑاتی اور سراب لہراتی ریتوں بھرے، اونچے نیچے میدانوں میں جانا ہے--!

صحرا میں جگہ جگہ اُگی نوکیلے کانٹوں والی جھاڑیوں میں سے گذرنا ہے--!

مجھے چولستانی صحرائی اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے گجر سننا ہے--!

میں چولستان میں تیز دَوڑتے اونٹوں کے ننگے کوہانوں کے سہارے بیٹھ کر ایک لمبا سفر کرنا چاہتا ہوں--!

مجھے دیکھنا ہے کہ چولستان کے صحرائی اونٹ، صحرا میں سفر کرتے ہوئے اپنی تھوتھنیوں سے کیسے سفید جھاگ اڑاتے ہیں کہ اس جھاگ کا کچھ حصہ ریت میں گر کر جذب ہو جاتا ہے اور کچھ جھاگ خشک ہوا کے زور سے اڑ کر میرے جسم اور منہ پر گرتا ہے--!

مجھے چولستان کے اونٹوں کی رنگین سجاوٹ کو بھی دیکھنا ہے، جو چولستانی صحرائی عورتوں نے بڑی محنت سے

تیار کر کے رنگین دھاگوں، کلابتو اور گندھے ہوئے رنگین پراندوں کو گھنٹیوں میں پرو کر اپنے اونٹوں کو پہنا رکھے ہوتے ہیں---!

مجھے چولستانی اونٹوں کی لمبی گردنوں پر لکھے ان کے مالکوں کے ناموں کو غور سے دیکھنا ہے، جن سے ان کے مالک کا نام پتہ اور نشانی ملتی ہے---!

مجھے چولستان کے اونٹوں کے رنگ دیکھنا ہیں---سفید نایاب اونٹ، سیاہ مشکی اونٹ، بھورا صحرائی اونٹ اور زرد شاہی اونٹ--- مجھے ان کو قریب سے دیکھنا ہے اور ان کے ماتھوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنا ہے---!

مجھے چولستان کے صحرائی میدانوں میں سیاہ مشکی اونٹنی کی پشت پر سوار ہو کر ہچکولے لیتا ہیں اور رومان بھرا سفر کرنا ہے---!

مجھے چولستان کے ریگ زاروں میں قطار اندر قطار، خوبصورت سجے ہوئے اِن اونٹوں کو بھی دیکھنا ہے کہ جن کے گلے میں بندھی پیتل کی گھنٹیاں، جب صدائے جرس بلند کرتی ہیں اور بستیوں کی عورتیں اور بچے ان کے استقبال کو اپنے گھاس پھونس کے جھونپڑوں سے باہر نکل آتے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمکیلے دیپ، طویل انتظار اور جدائی کے بعد ستاروں کی طرح روشن ہوتے ہیں---تو کیسا لگتا ہے---!

مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ چولستانی لباس پہنے، پن ہارنیں، قطار اندر قطار، میٹھے پانی کے گھڑے سر پر اٹھائے اور بغلوں میں دبائے کس طرح صحرا کی ریت پر ننگے پاؤں چلی جاتی ہیں---!

مجھے ان پَن ہارنوں کے لباس میں کڑھائی کے وہ شوخ نمونے اور بیل بُوٹے بھی دیکھنے ہیں کہ جن سے ان کا آہوی حُسن نکھر کر نظر آتا ہے---اور---ان کی پراندوں سے سجی، گُتھی ہوئی چوٹیاں بھی کہ جن کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں رنگین دھاگے اور آئینے گندھے ہوتے ہیں---پھر یہ بھی کہ جب وہ سر پر شیریں پانی سے بھرا گھڑا، بلا کسی سہارے کے رکھ کر چلتی ہیں تو ان کی کمر کے خم اور گہرے اور دل آویز شکل اختیار کر جاتے ہیں---اور تب باہر کو نکلے اور جسم کے آہنگ کے توازن کو قائم رکھنے والے گول اور ابھرے ہوئے کولہوں پر رنگین پراندوں میں گندھے، چھوٹے چھوٹے، لشکیں مارتے شیشے، کس طرح ہر قدم کی دھمک پر کولہوں کے گداز اور گول ابھاروں کو تھپتھپاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ جوان دل پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور بوڑھے اور بوسیدہ کلیجے کانپنے اور آنکھیں جھپکیں مارنے لگتی ہیں---!

مجھے ان چولستانی حسین آہوی حسیناؤں کو بھی دیکھنا ہے کہ جن کی رنگتیں، بچپنے میں گوری ابرق ہوا کرتی

تھیں، مگر صحرا کی جھلسا دینے والی تپش نے جلا کر سیاہ آبنوسی کر دی ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی بھوری اور سیاہ آنکھیں یوں مچلتی اور کشش کے تیر چلاتی ہیں کہ مردانہ جسموں کے حواس گم ہو جاتے ہیں--!

چولستانی دوشیزائیں کہ جن کی کلائیوں سے کہنیوں تک ہاتھی دانت جیسی سفید چوڑیاں، ایک دوسرے سے جڑی، بڑی آہستگی سے چھن چھناتی ہیں-- کہتے ہیں کہ ان چوڑیوں کے نیچے ان کی کلائیوں کی رنگت وہی سفید اور سنہری ہے کہ جو ان کی پیدائش کے وقت تھی-- پھر کہنیوں سے بازوؤں کے ڈولوں تک ایک اور سفید چوڑیوں کی چڑھتی بہار ہے کہ اگر اُتار دی جائیں تو ڈولوں کی تنی ہوئی مچھلیاں، صحرائی مشقت کے سبب کسی ناگن کے بے طرح پھن کی طرح پھڑ پھڑائے چلی جاتی ہیں-- یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی مرد کی نگاہ ان کے پھڑ پھڑاتے ڈولوں کی مچھلیوں کی بے قرار تڑپن پر عریاں پڑ جائے تو وہ اپنے حواس بھی اس جادو سے کھو سکتا ہے--!

غرض چولستانی صحرا ایک طلسم خانہ اور عجائب دنیا ہے۔

میلوں دور پانی کے ٹوبے، تالاب ہیں کہ جن کا پانی انسان، حیوان اور حشرات الارض ایک ہی گھاٹ سے پیتے ہیں-- پانی سوکھ جائے تو حیات تنگ پڑ جاتی ہے۔ موت کے بے رحم پنجے، سُوکھے ٹوبوں، تالابوں کی تہوں سے نکل آتے ہیں اور یوں روحیں قبض کرنے لگتے ہیں کہ ہر ذی روح بے بس ہو جاتا ہے-- سوچئے کہ پیاس سے موت کتنی کرب ناک اور اذیت بھری ہوتی ہو گی-- موت کی اس بے بس اذیت سے چولستانی صحرا کے باسی بخوبی آشنا ہیں، جیسے کربلا والے پیاس کی اذیت سے آشنا تھے۔ مگر جب پیاس کا ملک الموت صحرا میں آتا ہے تو صحرا العطش العطش کی خاموش چیخوں سے گونجنے لگتا ہے مگر کچھ سنائی نہیں دیتا-- زبان سوکھ کر حلق سے چمٹ جاتی ہے کہ کوئی لفظ زبان اور حلقوم سے باہر نہیں آ سکتا، فقط جسم اور روح العطش پکار پکار کر جب تھک جاتی ہے تو پھڑ پھڑا کر موت کی گہری نیند خاموشی سے سو جاتی ہے-- صحرا تب بھی خاموش تھا اور اب بھی خاموش ہوتا ہے--!

چولستان کے صحرا میں سیاہ ہرن اپنی عاشق مزاج ہرنیوں کے ساتھ ساتھ پھرتے ہیں-- کہتے ہیں کہ اگر ایک کالا ہرن مر جائے تو ستر ہرنیاں بیوہ ہو جاتی ہیں--!

اُدھر چولستان میں دَراوڑ کا ویران قلعہ اپنی تعمیراتی خوبصورتی میں بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اس قلعے میں جنات کے زرّین بسیرے ہیں-- عجیب عجیب کہانیاں اس سے وابستہ ہیں؛ مجھے اس قلعے کو بھی دن کے اجالے اور رات کی تاریکیوں میں دیکھنے کی آرزو ہے--!

میں اسی لئے چولستان کی طرف رخ کیے کھڑا ہوں-- چلنے کو بس تیار--!

چولستان بذات خود ایک خوبصورتی اور تاریخ ہے۔ اس کے اپنے رنگ ڈھنگ اور ناز و انداز ہیں--!
کاش جب میں چولستان پہنچوں تو بارش ہو جائے اور اتنی مدّت سے کہ اُس کے صحرا کی ریت کا فرش، بھیر بوٹیوں سے سرخ ہو کر بھر جائے-- کسی صحرائی دلہن کے آنچل کی طرح کہ بھیر بوٹی اپنی اداؤں میں بہت نازک مزاج، شرمیلی اور صحرائی دلہن کی طرح، طرح دار ہوتی ہے--!!!

باب ۲

دَم گُٹ، گُوں دَم، گُٹ گُوں
ملنگ، کبوتر، صُبح اور شاہ رکن عالمؒ

یہ سڑک سیدھی چولستان کے رومانوی صحرا کی طرف اڑی چلی جارہی ہے--!

ملتان میں اسی راہ گذر کے کنارے، اونچے ٹیلے پر حضرت شاہ رکن عالم علیہ رحمہ اور حضرت بہاؤ الدین ذکریا علیہ رحمہ کے کبوتروں سے اٹے بھرے مزار تھے کہ جہاں زائرین کے ساتھ ساتھ فقیروں اور ملنگوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور اپنی اپنی دھن میں مست تھے--!

پھر ذرا آگے چل کر بہاولپور میں نواب صادق آف بہاولپور کا طلسماتی نور محل تھا کہ جس کی شان و شوکت آنکھوں کو خیرہ اور سبزہ زار کی وسعت ایک ناقابل بیان سحر انگیزی کو بیان کرتی تھی۔

اس وقت ہم احمد پور شرقیہ کے مین بازار میں کھڑے تھے۔

یار لوگ صحرائی مٹی اور ریت کے بگولوں سے اپنے چہروں کو بچانے کے لئے کسی پرنے فروخت کرنے والی دکان پر یلغار کئے ہوئے ہیں--!

احمد پور شرقیہ کے تنگ سے پُرہجوم بازار میں میری نظر ایک ملنگ پر پڑتی ہے-- میں اپنی کوچ میں بیٹھا ہوا

ہوں۔ ملنگ بھرے بازار میں بے خود ہو کر دھمال ڈالنے لگتا ہے۔

یکا یک کوئی کوچ کا دروازہ کھولتا ہے۔۔ تب ملنگ کے مست نعروں کی فلک شگاف آواز کوچ میں گھس آتی ہے، جس سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور کچھ کو راحت۔۔!

وہ اپنی ذات میں مست ہے اور علیؑ علیؑ کر رہا ہے۔

"۔۔دم مست قلندر علیؑ ۔۔دم، دم دے اندر علیؑ ۔۔"

"۔۔حق علیؑ علیؑ، حق علیؑ علیؑ ۔۔"

کوچ کا دروازہ دھم سے بند ہو جاتا ہے۔۔اس کی آواز کہیں باہر ساکت ہو جاتی ہے۔۔اور خاموشی چھا جاتی ہے۔

ملنگ نیم کے پیڑ کے نیچے، عالم بے خودی میں والہانہ رقص کر رہا ہے۔

اس کے ہاتھوں میں گھنگروں سے سجا ہوا چمٹا، ایک لے میں بج رہا ہے، جس کے سُروں سے حق حق کی صدا دور تک، بند دروازے اور کھڑکیاں چیر کر جا رہی ہے۔ یکا یک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے چمٹے سے نکلنے والے سُروں کی آواز، ہر دوسری آواز پر چھاتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے پیروں کے گھنگروؤں کے لچھے بھی خواہ مخواہ متحرک رہے ہیں۔ نیم کے درخت پر بیٹھے پرندے بھی دم بخود ہیں اور سامنے والی دوکان کسی کبوتر فروش کی ہے! اس کے کبوتر بھی گردنیں پھلا کر جھوم رہے ہیں۔۔اس کا چہرہ ایک خاص جذب سے دمک رہا ہے۔۔!

سفید، کالے، بھورے، چترے، سرمئی اور طرح طرح کے کبوتر نیم کے گھنے سایہ دار درخت کے نیچے دالوں کا دانہ چگ رہے ہیں۔ کوئی کُنالی کے کنارے پر چڑھ کر پانی پیتا ہے اور گردن آسمان کی طرف اٹھا کر پانی عطاء کرنے والی ذات کا بے کراں شکر ادا کرتا ہے اور کوئی کبوتر اپنی کبوتری کے آگے پیچھے، کسی زن مرید کی طرح پھرتا ہے اور گردن پھلا کر اور اچکا کر اسے لبھانے کی کوشش میں تن، من، دھن سے مصروف ہے۔ کبوتوں کے بچے اپنے اپنے ڈربوں میں خوراک اور بھوک کی شدت سے بے قرار ہو کر چُوں چُوں، چُوں چُوں کر رہے ہیں۔۔ بہت سے کبوتر دانے کو اپنے پوٹے میں بے تابی سے بھر رہے ہیں، غالباً وہی ان چوزے بچوں کے ماں باپ ہیں، جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے بچوں کو دانا چگانے کی فکر میں ہیں۔۔ پاس ہی ایک بھوری کالی بلی بیٹھی ہے۔ مگر اس بلی کی آنکھوں میں حیا ہے۔ وہ کبوتروں کی بجائے، پاس لگے مرغی کے گوشت کے لوتھڑے پر نظریں جمائے بیٹھی ہے کہ مرغی والا کب کوئی مرغی ذبح کرتا ہے اور سری، کلیجی، پوٹا اور چھچھڑے، پہلو میں رکھے کنستر میں پھینکتا ہے اور وہ آگے

بڑھ کر ان کو کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتی ہے۔ شائد وہ مریل سی، صابر بلی یہ دعا کر رہی ہے کہ اللہ میاں-- پیارے اللہ میاں جی--مرغی والے کے پاس کوئی مرغی کا گاہک بھیج کہ میں بھی بھوک کی اذیت سے نجات پاؤں--!

ملنگ کا رقص قدم بہ قدم، لمحہ بہ لمحہ عالم وجد میں تیز تر ہوتا جا رہا ہے--!

کبوتر اپنی دنیا میں، عالم سکون میں مگن ہیں، جیسے وہ اس رقص سے صدیوں سے آشنا ہوں--!

سبز چوغا، سیاہ رنگت، زردی مائل سفید چوڑے مضبوط دانت--گھنگھریالے اور بکھرے ہوئے سیاہ مگر بھوسلے بالوں کا کشادہ مگر پھیلا ہوا چھتا، الف فقیر کی طرح چوڑی، گھنی اور کٹی ہوئی مونچھیں، جو دونوں باچھوں سے اتر کر داڑھی میں مدغم سی ہو گئی ہیں--گول تراشیدہ داڑھی جس میں کوئی کوئی سوتا سفید بال درویشی کی علامت بن کر نظر آ رہا ہے۔ بالکل بابا بلھے شاہ والی مست فقیرانہ داڑھی، جس کی گولائی ڈھنگ سے تراشی ہوئی ہے۔ مجھے لگا کہ ملنگ اپنے سراپے میں فقط داڑھی کے حُسن کا خاص خیال رکھتا ہے، مگر سچی بات یہ لگی کہ اس گول اور گھنی داڑھی نے اس کی شخصیت اور سراپے میں سب سے اہم کردار ادا کر رکھا ہے۔ اگر وہ داڑھی کو سر کے گھنگھریالے بالوں کی طرح، بے طرح چھوڑ دیتا تو اس کی شان میں کئی گستاخیاں جنم لے لیتیں۔ مگر ایسا ہر گز نہیں تھا۔ مونچھوں، داڑھی اور سر کے گھنے گھنگریالے بالوں میں سے جھانکتی چمکتی آنکھیں، آنکھوں میں سرخ ڈورے اور ان کا بادامی حسن، سیاہ چہرے کی چمکیلی جلد میں ایک ٹھہرے ہوئے طوفان کی طرح مدغم تھا--یہی اس ملنگ کی شخصیت کا مرکزِ اظہار تھا--سبز چوغا، کھلی چنٹ دار آستین اور کلائیوں میں طرح طرح کے رنگ برنگی کڑے؛ کوئی کڑا ابری شیشے کا اور کوئی کڑا عقیق کے رنگ کا اور کوئی چاندی کا نقشین کڑا--دونوں ہاتھوں کی ہر ہر انگلی میں رنگ رنگ کے پتھروں والی بڑی چھوٹی چاندی اور پیتل کی انگوٹھیاں، حتیٰ کہ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں میں نقشین چھلے، گلے میں سرخ دوپٹہ، جس کے چاروں کناروں پر گوٹے کی جھالر لگی ہوئی--پیروں میں ٹخنوں سے ذرا اوپر گھنگروں کے سیاہ پٹے، جن میں پیتل کے گھنگرو، ہر پاؤں کی دھمک پر ایک مستانہ وار لہر کی صورت چھن چھن بولتے تھے--!

ہاتھ میں موجود گز بھر کے چمٹے کے اوپر والے سرے پر بھی ایک گھنگرو لہراتا تھا کہ ایک خاص عالم اور حرکت کی حالت میں بولتا تھا، ورنہ چپ دم سادھے رہتا تھا--میں نے محسوس کیا کہ وہ فقط تب ہی بولتا ہے کہ جب ملنگ بابا کی زبان سے علی علی نکلتا تھا، ورنہ خاموش ہی رہتا تھا۔

--"دم گٹ کوں--دم گٹ کوں"--

جب ملنگ اپنے سُر میں آتا تو کبوتر بھی بولتے ۔۔ دم گٹ کوں ۔۔ دم گٹ کوں ۔۔

میں نے بہت غور سے دیکھا ۔۔ وہ نیم کے ڈی فیوز سبز سائے تلے، عالم بے خودی میں ایک ہی جگہ پر کھڑا، ایک ہی رخ پر رقص کر رہا تھا ۔۔ صرف ایک ہی نام کو لیتے ہوئے، اپنے گرد، اپنی ایڑیوں کے بل پر گھومتا تھا؛ جب وہ گھومتا تو اس کے سبز چولے کا گھیر، ہوا میں پھول کر اپنے اندر ہوا بھر لیتا تھا۔ تب ایسا لگتا کہ کائنات کو اس نے اپنی ذات میں بے خود ہو کر جذب کر لیا ہے ۔۔ ایسی حالت میں اور ایسے وجد کے عالم میں نیم کے درخت کے نیچے سائے تلے کبوتر ذرہ بھر بھی اپنی جگہ سے نہ اُڑتے اور نہ ہی اپنی جگہ بدلتے ۔۔ بس ذرا دیر کو دانا چگنا بند کر دیتے اور اسے حیرت سے دیکھنے لگتے ۔۔ اور میں عالم حیرت و استغراق میں اس کی ہر حرکت و جنبش کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔

پھر کبوتر مل کر بولتے ۔۔ دم غٹ کوں ۔۔ دم غٹ کوں ۔۔

ملنگ ہلکا سا چمٹا بجاتا اور چمٹے کے اوپر والا گھنگرو بولتا سنائی دیتا۔

"۔۔ دم مست قلندر علی علی ۔۔ دم دم دے اندر علی علی ۔۔"

چمٹے، گھنگرو اور غٹرغوں کی آوازیں خود بخود اور آہستہ آہستہ کہیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔

کھلی آنکھوں سے دکھتا منظر فلیش بیک میں بدل جاتا ہے۔

تب صبح ٹھیک ۶ بجے کا وقت تھا۔

ملتان کی فضاؤں میں اندھیرا اور سردی تھی۔

۱۲ فروری ۲۰۱۶ء کو فجر کا گجر بُولتا تھا ۔۔ ملتان کی سڑکیں اداس پڑی تھیں، کہیں کہیں کُہر اور دُھند کے آثار بھی تھے ۔۔ باہر مسجدوں سے اذان کی آوازیں دھیمی اور شیریں ہو کر کانوں میں رس گھولتی تھیں، خصوصاً اس لمحے جب کوچ کسی مسجد کے برابر سے سنسان سڑک پر گذرتی تھی ۔۔ سردی کا احساس گرم کوچ میں ناپید تھا۔

سامنے، آسمان کے ملگجے اندھیرے اور ذرا سی سحر کے پُو پھٹنے کا حسین منظر طلوع ہو رہا تھا؛ جس کے پیش منظر میں حضرت شاہ رکن عالم علیہ رحمہ کے مزار کا فلک بوس گنبد ایک عجیب روحانی تاثیر فضا میں ایک نور کی طرح دور دور تک بکھیر رہا تھا۔

آسمان کے نیلے پن میں سفیدی دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔

ایک سوفٹ اونچا ہشتہ ہیضوی وسیع احاطۂ گنبد چاروں سمتوں سے پڑنے والی بجلی کے قمقموں کی روشنی میں کشادہ آسمان کی وسعتوں میں جلالی مگر روحانی رنگ بھر رہا تھا۔

اس کی بناوٹ میں ترک کمانستانی بناوٹ، ایرانی اور ملتانی کاشی کاری کے نیلے اینٹ دار رنگ نمایاں تھے۔قندھار کی قدیم پچی کاری کے نقش اس کے دروازوں، جھروکوں اور محرابوں کے حسن و جمال کو دل آویز بنائے دے رہے تھے--سرخ اینٹوں سے تعمیر کیے گئے محرابی گنبد کی کشش دل کش تھی--وسیع احاطہ گنبد کو دیکھنے سے ایسے لگتا تھا کہ کسی ایسے شاہ کا مقبرہ ہے کہ جس کی شہنشاہیت آج بھی زندہ و تابندہ ہے--میں سمجھتا ہوں کہ ایسا محسوس ہونا ہی چاہیے تھا، اس لیے کہ حضرت شاہ رکن عالم علیہ رحمہ اس خطے کی ایسی روحانی شخصیت تھے، روحانی شخصیت ہیں اور رہیں گے کہ ان کے یہاں ہونے کی برکتوں سے اللہ کی رحمتیں ہمہ وقت بارش انوار کرتی رہتی ہیں--میں جوں جوں آہستہ آہستہ چلتا ہوا حضرت شاہ رکن عالم علیہ رحمہ کے مزار کی طرف بڑھ رہا تھا، توں توں انوارِ رحمت کی فراوانی کا احساس رُوح میں جاگتا چلا جا رہا تھا--!

میں سوچ رہا تھا کہ یہی وہ اللہ کی پیاری ہستیاں ہیں کہ جو ہمیشہ سے مرجع الخلائق تھیں اور تا قیامت رہیں گی--درود و سلام ہو محمدؐ و آلِ محمدؐ پر اور ان کے وسیلے سے اِن درویش صفت ہستیوں پر کہ ان کے ہونے سے گناہ گار بستیوں پر اللہ کی رحمت کے بے بہا احسانات کی بارش دن رات جاری ہے--!

صبح میں طلوعِ آفتاب کی بے نام سپیدی، آنے والی روشن صبح کی دھیرے دھیرے نوید دے رہی تھی--برف پانی کے وضو نے بند آنکھوں کو ایسے کھول دیا، جیسے حیات نو دندناکر بدن میں سرایت کر جاتی ہے--ڈیوڑھی کا فرش اپنی برفیلی ٹھنڈک، پاؤں کے تلووں سے اعصاب کے سوئے سوئے سِروں تک اپنے ہونے کا بے بہا احساس دے رہا تھا--اُدھر ڈیوڑھی کے فلک بوس شاہی دروازے کے بیضوی جھروکے سے حضرت کا سحر انگیز گنبد ایک زُمرّد و آئینے کی طرح دکھائی دیتا تھا--دالان کا فرش اپنی صفائی کے سبب مثل آئینہ تھا کہ اس میں حضرت کے مزار کا آسمانوں کی طرف بلند، وسیع اور کشادہ گنبد ایک ٹھنگنے لہریے کے عکس کی صورت چمکیں مارتا تھا کہ اُس کے جلالی اظہار پر پاؤں رکھتے خوف آتا تھا کہ کہیں کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔

بے شمار اور لاتعداد کبوتر بائیں جانب کے وسیع و عریض دالان میں بڑے اطمینان سے دانہ چگ رہے تھے، جو زائرین نے ان کی نذر کیا تھا۔خوبصورت کم و بیش چوکور مسجد بھی اسی کبوتروں والے دالان میں ٹھیک میرے بائیں طرف تھی، جس کے چاروں بونے سے مینار ایک غیر روایتی مسجد سے ہم آہنگ تھے۔مسجد کے چاروں سمت

دروازے اور کھڑکیاں قندھاری روایات کی امین تھیں اور بیرونی در و دیواروں پر ملتانی نیلی روایتی پچی کاری اور نقش نگاری آنکھوں کو بھلی لگتی تھی---سردصبح کی نرم زردروشنی نے اس مسجد کے در و بام میں ایک ناقابل بیان سحر انگیزی کو سمو رکھا تھا---یہ صبح کا کمال تھا یا اس نور کا، جو حضرت کے دم قدم سے یہاں چار سُو بکھرا ہوا تھا---اللہ ہی جانے--!

مزار اقدس کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی ایک ماورائی خوشبو نے مشامِ جاں کو معطر کر دیا اور دل و دماغ میں روحانیت کو بیدار کر کے عالم وجدانیت کے بے شمار چراغ روشن کر دیے--!

چونکہ صبح کا وقت تھا، سپیدہ سحر ابھی طلوع کے مرحلے میں تھا، اس لیے بس وہی عقیدت مند حاضری میں تھے کہ جو روحانی خوبر یگانہ خاموشی سے سمیٹنے کے آرزو مند تھے--!

سفید بلبوں کی روشنیوں نے گنبد کے اندر مزار اقدس میں ایک طلسماتی روحانی ماحول کی کیفیت بیدار کر رکھی تھی کہ نیک روحوں کی موجودگی کا ماورائی احساس ہر سمت سے جاگتا تھا--!

مزار کا گنبد عجیب حیرت انگیز تعمیر کا اچھوتا نمونہ تھا---یہ گنبد فرشِ زمین سے کم و بیش سوفٹ فضا میں بنیادوں سے اٹھایا گیا تھا---باہر سے دیکھیں تو ہشت پہلو تھا مگر اندر سے پورا کا پورا گولائی میں گول تھا---دیواروں کی اٹھان کے دو مرحلے تھے۔ پہلے مرحلے کی پرشکوہ اٹھان کے بعد محرابی کھڑکیاں، ہوا کی آمد و رفت کے لیے کھلی چھوڑی گئی تھیں---پھر دیواریں جو گولائی میں تھیں مزید اوپر کی جانب اٹھتی تھیں کہ جب وہ اپنی اٹھان کی انتہا کے قریب پہنچتی تھیں تو پھر فاصلے فاصلے سے محرابی جھروکے مخصوص فاصلے پر قائم تھے---اس عملِ تعمیر سے اندر کی فضا ٹھنڈی اور ہوادار تھی کہ کسی قسم کی گھٹن کا احساس ناپید تھا---پھر چھت میں گنبد کی راہ ہموار ہوتی تھی---گنبد کی چھت نقشین اور پرشکوہ تھی---کوئی کوئی کبوتروں کا جوڑا اندر گنبد میں نہایت ادب اور احترام سے حضور اقدس کے مرقد مبارکہ پر سلامی دینے آتا تھا---ایک چکر گنبد کے نیچے ایک خاص فاصلے سے اڑان کا لگاتا اور کسی دوسری محرابی کھڑکی سے سلام کر کے نکل جاتا---جو میں نے محسوس کیا اسے تحریر کر دیا ہے۔ مبالغے سے اجتناب کیا ہے---روحانی کیف کا ایک مرقع ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، بیان کرنے کو ضبط تحریر میں لانے سے ہو سکتا ہے کہ کوئی کسر رہ جائے، سو بہتر ہے کہ خود جا کر اس کیفیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، روح سے محسوس کریں--!

نیچے فرش زمین کے بیضوی کناری پر حضرت شاہ رکن عالم قدس سرہ علیہ رحمہ کی قبر کا نشان ذرا اونچا کر کے ایک پرشکوہ چبوترے کے احاطے میں بنایا گیا ہے کہ اس پر سیاہ چادریں بڑی عقیدت سے روایتی طور پر ڈلی ہوئی ہیں---چبوترہ لکڑی کے نقشین ڈھانچے سے اپنی شان دکھاتا ہے اور سفید روشنی کے بلب اس میں اپنی روشنی سے نور سا

بکھیرتے ہیں--!

چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ جو اس بات کی نشانی ہیں کہ یہ کبھی قبرستان سا ہوا کرتا تھا-- کسی قبر پر کوئی تختی یا نشانی نہیں لگی ہوئی ہے۔ قبروں کے احاطے اور تخت ایک سے اونچے ہیں۔ قبریں بڑی ترتیب سے ایک ہی انداز میں بنائی گئی ہیں۔ جن پر بڑی نفاست سے سفید روغن کیا گیا ہے-- گنبد کی فرشی بنیادوں کے برابر برابر چاروں طرف راہ گذر کشادہ ہے کہ زائرین آسانی سے زیارت مزار اقدس کرسکیں اور درود وسلام اور فاتحہ پڑھ سکیں۔ البتہ خواتین کے لیے اس راہ گذر میں دائیں جانب کا حصہ اور مردوں کے لیے بائیں جانب کا حصہ مخصوص ہے۔

داخلے کا دروازہ آبنوسی لکڑی کا، اونچائی میں ڈھائی آدمیوں کے قد کے برابر نقشین ہے کہ اس کی چوبی کشادہ چوکھٹوں پر آیات کلام پاک نہایت خوبصورتی سے کندہ ہیں کہ دیکھ کر اور پڑھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ ایسے تین بند دروازوں کے جھروکے مشرق اور مغرب کی سمت میں بھی لگے ہیں مگر یہ دروازے آمد و رفت کے لیے نہیں ہیں-- بس جھروکے دار ہیں۔ آپ ان میں داخل ہو کر کھڑے ہو سکتے ہیں، نماز قرآن پڑھ سکتے ہیں یا عالم روحانیت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

ہر دروازے کی چوبی محرابوں کے کشادہ ستونوں پر آیات الٰہیہ منقش ہیں کہ بڑی خوبصورتی سے کاریگر نے چوب کاری کر کے ان کو لکڑی میں سے ابھارا ہے-- مجال ہے کہ خطاطی میں کہیں ذرّے بھر کے توازن کا فرق ملے۔ زیر زبر شد موتیوں کی طرح پُر دیے ہوئے ہیں-- صاف لگتا ہے کہ یہاں جو لکڑی استعمال کی گئی ہے، وہ دنیا کی سب سے قیمتی اور نایاب لکڑی آبنوس کی ہے-- دل نے بے اختیار کہا کہ آفرین ہے ان خطاطوں پر کہ جنہوں نے ایسی بے مثال اور نفیس خطاطی سے ان دروازوں کے حسن کو نکھارا اور دائمی اور لافانی حسن عطا کیا--!

میں اور وجدان بائیں طرف کے ایسے ہی محرابی نقشین دروازے کی محراب میں آ کر بڑی عقیدت سے کھڑے ہو گئے-- یقین مانیے کہ یہاں کے روحانی ماورائی ماحول کے نامعلوم طلسم نے بہت دیر کے لیے ہمیں ساکت اور دم بخود کر دیا-- اتنا دم بخود ہوئے کہ بہت دیر بعد ہوش بحال ہوئے اور نہایت ادب سے کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھی اور یہاں پر مدفون خوش نصیب مرحومین کو ایصال ثواب کیا-- تب ہوش آیا--!

ہمارے بائیں طرف ایک اور محراب کے قالین پر ایک بزرگ قصیدہ بردہ شریف نہایت خوش الحانی اور رقت کے ساتھ ایسی نرم اور سحر انگیز آواز میں پڑھ رہے کہ اس کو سن کر عالم ہوش، عالم جذب میں منتقل ہو گیا-- ان کی آواز میں کچھ ایسا گداز اور سوز تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہ سنا تھا-- ایک سحر تھا کہ ہر ذی ہوش کو اپنی

روحانی گرفت میں لے کر مدہوش کیے دے رہا تھا-- ان کی آواز اس گنبد میں کچھ اس طرح حرکت کر رہی تھی کہ لگتا تھا کہ پوری کائنات قصیدے کے لحن، سوز اور معنی سے سربستہ راز میں تبدیل ہو گئی ہے-- دل نے کہا کہ یہ وہ لمحہ ہے کہ جو مانگو گے ملے گا، جو دعا کرو گے قبول ہو گی-- فرشتے اور نیک روحیں آپ کی دعاؤں کو لے کر خود عرش پر جائیں گی اور اللہ پاک کے حضور پیش کر دیں گی کہ کبھی رد نہ ہوں گی--!

بس اتنا کہوں گا کہ یہ احساس اتنا قوی اور سچا تھا کہ عین اس وقت جو دعا مانگی تھی، من و عن پوری ہو گئی اور جو رہ گئی، وہ جلد پوری ہو جائیں گی--!

خرم شکیب تو ایسے روحانی سکتے میں آئے کہ اندر داخل ہوتے ہی عین داخلی دروازے کے درمیان میں ہاتھ باندھ کر ساکت ہو گئے-- ایسا سکتہ طاری ہوا کہ اگلا قدم اٹھانا ہی بھول گئے-- عالم حیرت میں جہاں آ کر رکے تھے، وہیں کے وہیں جامد ہو گئے-- عالم کیف میں ان کا جسم اور آنکھیں جیسے پتھر کی ہو گئی ہوں-- ان کی یہ روح پرور کیفیت دیکھ کر اُن کے اندر کے روحانی اضطراب اور بے چینی کا احساس بے پایاں ہوتا تھا-- انہوں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھی، فاتحہ پڑھنے کے بعد ان میں حرکت و سکت پیدا ہوئی۔ شاید یہ حضرت قدس سرہ کی روحانی ہیبت تھی کہ ہر صاحب ایمان، اس ایمان افروز ماحول میں سمٹ کر جامد ہو جاتا ہے-- ہم بھی اسی کیفیت سے گذر چکے تھے، سو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس حالت میں روح کی کیفیت کا کیا عالم ہوتا ہے--!

میں نے دیکھا کہ گنبدِ دربار میں قدم رکھتے ہی اس کیفیت سے بہت سے لوگ گذر رہے تھے۔ مگر ایسے بھی تھے کہ جو احترام کی اس کیفیت سے ناآشنا تھے یا ان کے قلب اس ہیبت کیف سے لاتعلق تھے-- جب وہ اندر داخل ہوتے تو نہ بزرگوں کو سلام کرتے، نہ ان کے قدم رکتے، نہ ان کے چہروں پر ملاحت کا نزول ہوتا-- بس دندناتے ہوئے کسی مشینی انداز میں احاطہ مزار میں بے کیف داخل ہوتے اور فرض ادا کر کے باہر کی جانب نکلتے چلے جاتے۔ مجھے لگا کہ ان سے اچھے وہ کبوتر ہی ہیں جو ایک روشن دان سے داخل ہوتے ہیں۔ اپنے پروں سے سلامی دیتے ہیں اور گردن جھکا کر دوسرے درّے سے نکل جاتے ہیں--!

جو بھی اندر آتا، رکتا، ساکت ہوتا اور کیف کے بے ساختہ مراقبے میں ساکت ہو جاتا تھا-- عجیب عالم تھا-- مرزا محمد حیدر، ارشاد عالم خان، رضوان ملک، عمر فرحان اندر داخل ہوئے اور جامد و ساکت ہو کر خرم شکیب کے برابر پتھر ہو گئے--!

دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس نورانی آستانے کی قدم بوسی سے اتنی جلدی آگے روانہ ہوا جائے، کیونکہ ابھی

پڑوس میں حضرت بہاؤالدین زکریا کے دربار میں بھی جلدی سے جا کر حاضری دینے کی گھد بد تھی --اگر میرے پاس وقت ہوتا تو شاید ایک یا دو، پہر یہیں رکتا اور فیض حاصل کرتا --!

مجھے یاد پڑتا ہے کہ تقریباً ۳۵ برس قبل میں یہاں آیا تھا-- یہ جگہ تب بھی ایسے ہی انوار سے منور تھی اور آج بھی --!

سردیوں کی یہ صبح روحانیت سے لبریز تھی-- آج کی صبح میں تیز خنکی، ہلکی اور نرم روشنی میں مدغم ہو کر روحانیت سے لبریز ہو گئی تھی-- میں سوچ رہا تھا کہ جس سفر کا آغاز پاک بزرگوں کے زیر سایہ جنم لے، وہ آگے چل کر کتنا پراسرار اور رمزو کنائے سے بھرپور ہوگا--!

دل نہیں چاہتا تھا کہ اس در کو چھوڑ کر کہیں اور کا رخت سفر باندھا جائے مگر وقت بڑی ظالم شے ہے--بس، انسان کو اپنی نامعلوم طاقت سے آگے کو دھکیلتا ہے--دل چاہے یا ناں چاہے، آگے کو چلنا ہی پڑتا ہے--شائد یہی انسانی زندگی کی بے بس روانی کا اوئی سا ثبوت ہے--!

صوفی شیخ رکن الدین ابوالفتح عالم (۱۲۵۱ء تا ۱۳۳۵ء) حضرت سردار الدین عارف کے صاحب زادے اور حضرت بہاؤالدین زکریا کے پوتے تھے۔ وہ ۲۶ نومبر ۱۲۵۱ء بمطابق ۹ رمضان ۶۴۹ھ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ عالم تصوف میں ایسے غرق ہوئے کہ ساری زندگی شادی کا ہوش نہ آیا۔

حضرت شاہ رکن عالم علیہ رحمہ صوفی منش اور صاحب کرامت ولی تھے اور میں یہ کہوں گا کہ اب بھی ہیں--ان کی اُولیائی صفات کے تمام آثار ان کے مزار کے اندرونی احاطے میں بہر طور ہر جانب، ہر صاحب باطن بصیرت کو آج بھی نظر آتے ہیں--یہی صاحب کرامت ہونے کی اول دلیل ہے--!

دل کے ناں چاہنے کے باوجود میں نے حضرت شاہ کو خدا حافظ و ناصر کہا اور خرم شکیب اور وجدان کے ساتھ چلتا ہوا روضہ اقدس سے باہر آ گیا۔

"--آپ نے روحانیت کو محسوس کیا--؟" خرم شکیب نے بیرونی ڈیوڑھی عبور کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"--بہت شدت سے کیا، خاص طور پر جب نذرانہ عقیدت میں قصیدہ بردہ شریف پڑھا جا رہا تھا۔ تب وہاں ایک عجیب عالم طاری تھا--صبح کے اس وقت میں قبولیت دعا اور روحانیت کی عجیب تاثیر کا احساس ہوا--خرم شکیب، آپ نے یہاں آنے کے لیے بڑے صحیح وقت کا انتخاب کیا--" میں نے کہا۔

"--- مجھے اجازت دیجئے --- میں ذرا نیچے چوک گھنٹہ گھر کے اطراف میں جا کر کسی ہوٹل کا انتخاب کرنا چاہتا ہوں تا کہ چولستان کے شیدائی مسافروں کے ناشتے کا بندوبست کر سکوں ---" خرم شکیب نے کہا۔

"--- ٹھیک ہے --- مجھے اس سردی میں چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے، خاص طور پر ٹھنڈے، یخ بستہ فرش پر چلنے کے بعد --- آپ بندوبست کیجئے --- اس اثناء میں ہم لوگ حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے کے مزار اقدس پر حاضری دے لیتے ہیں ---" میں نے خرم شکیب سے کہا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے، ٹیلے سے نیچے اترتی چوڑی سڑک سے چوک گھنٹہ گھر کی جانب صبح کے نیم اندھیرے میں اترتے چلے گئے --- مگر جاتے جاتے کہہ گئے کہ فکر نہ کیجئے گا، کرامت علی آپ کے ساتھ ہوگا۔

مشرق کی سمت بڑھتی سڑک کے افق سے سورج، زمین سے ذرا اوپر ہو کر جھانکنے لگا تھا --- سورج کے پیش منظر کی سنہری اُبھرتی روشنی میں حضرت بہاؤ الدین زکریا کے مزار کے آثار ایک سیاہ مگر تیکھے ہیولے کی صورت میں نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔

بائیں طرف اُجاڑ اور جھاڑی دار پوٹھوہاری زمین تھی، جہاں ویرانی اور بے کیفی، لوگوں کی جہالت اور غلاظت کے سبب ڈیرے ڈالے تھی --- اس کے پس منظر میں بہت نیچے قاسم اسٹیڈیم جھلک مارتا تھا --- میں نے خاص طور پر رک کر دیکھا --- وہاں سنگلاخ زمینی حالات تھے --- مجھے یاد آیا کہ جب ۳۵ برس قبل میں قاسم اسٹیڈیم میں آیا تھا تو یہاں سبز گھاس کا زرخیز اور خوبصورت کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ اسٹیڈیم کے سیڑھی دار انکلوژر صاف ستھرے تھے --- جو بھی غیر ممالک سے کرکٹ ٹیم آتی تو یہاں سہ روزہ میچ بڑے تزک و احتشام اور اعلیٰ جذبات و احساسات کے ساتھ ضرور کھیلا جاتا تھا --- اب یہ اُجڑ چکا تھا --- گھاس، مٹی کی راکھ میں تبدیل ہو چکی تھی، تماشائیوں کے بیٹھنے کی صاف ستھری سیڑھیاں، رفع حاجت کا میدان بن چکی تھیں --- اس کی شان و شوکت کے قصے، پارینہ ہو چکے تھے --- ایسی عظیم ہستیوں کے یہ میدانی پہلو غلاظت میں بدل دیئے گئے تھے --- نہ عوام کو احساس تھا اور نہ ہی حکام کو کہ انھوں نے اپنی ہوس کاری کے سبب پاک ہستیوں کے پہلو کے میدانوں کو سنوارنے کی بجائے، اُجاڑ دیا تھا --- اور اس عمل کے بعد اگر کوئی دعویٰ عقیدت کرے تو صاف لگتا ہے کہ قومی سطح پر جھوٹ بول رہا ہے۔ پاک ہستیوں کے پہلو ناپاک کیسے ہو سکتے ہیں --- میں صرف یہی کھڑا سوچ رہا تھا --- مگر جب ماننے والوں کا دعویٰ عقیدت باطل ہو تو ایسے ہی روح فرسا مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں --- میں نے دل ہی دل میں قوم کے حالات پر ماتم کیا اور خاموشی سے کئی کترا کر آنسو بہاتا ہوا حضرت بہاؤ الدین زکریا علیہ رحمہ کے مزار کی طرف قدم، بے دلی مگر عقیدت سے بڑھاتا

چلا گیا--!

دادا حضور، اپنے راج دلارے پوتے سے صرف پانچ سو گز کے فاصلے پر پڑے سوتے تھے--!

اتنے ڈھیر سارے بنے سنورے ملکی سیاحوں کو دیکھ کر سڑک کے کنارے بیٹھے، خانہ بدوش فقیروں، ملنگوں اور نادار لوگوں کی آنکھیں سردی کے باوجود، امید سے پھیل گئی تھیں--یہی امید کہ کچھ نہ کچھ تو ملے گا ہی--!

سڑک کی دائیں جانب اوقاف کے دفاتر کے ساتھ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کا دفتر اور پھر اس کی ساتھ ہی لائبریری تھی کہ اتنی صبح پولیس کے آفس کا دروازہ خدمت عوام الناس کے لیے کھلا تھا باقی سب کچھ سیل بند تھا--!

سردی سے ٹھٹھرے ملنگ اور فقیر، فقیرنیاں آس اور امید کے چراغ جلائے، ہر کسی کو بڑی توقع بھری نظروں سے دیکھتے تھے--!

حضرت شاہ رکن عالم علیہ رحمہ کے دادا حضرت بہاؤالدین زکریا کا مزار بالکل سامنے تھا--بیرونی احاطے کے باہر ایک کنواں تھا--مگر کنویں سے چند قدم پہلے ایک قدیمی درخت کو جڑ سے غالباً دو فٹ اوپر ترچھا قلم نما کاٹ کر ایک اطلاعاتی حکیمانہ سٹین لیس اسٹیل کی تختی درخت کے تنے کے مرکز میں کیلوں سے ٹھونک کر ہم جیسے سیاحوں کے لیے، بابت تاریخ کنواں لگائی گئی تھی--کٹے درخت کی جڑیں اور ان کا پھیلاؤ اور سرخی مائل قدامت بتاتی تھی کہ یہ درخت یقیناً سینکڑوں سال پرانا ہوگا، جس کو محفوظ کرنے کی بجائے حکام اعلیٰ نے کاٹ کر ذبح کر دینا زیادہ مناسب خیال کیا ہوگا--!

اور سب سے دلچسپ تذکرہ یہ ہے کہ اس سٹیل کی تختی پر جو عبارت لکھی گئی تھی، اس کا لب و لہجہ اور تذکیر و تانیث بھی درست نہ تھی کہ کسی نا اہل منشی نے اپنی علمی قابلیت دکھاتے ہوئے سراسر بے ادبی اور جہالت کے مرکب سے ترتیب دے کر عوام الناس کی فلاح کے لیے بہ طور اطلاع آویزاں کر کے سرخ روئی کا ثواب حاصل کیا تھا--!

لفظ بہ لفظ عبارت ملاحظہ فرمائیے تا کہ آپ بھی زبان و بیان اور ادب و تہذیب کے ثواب دارین میں شامل ہو کر سر کو دھنیں--!

"--یہ کنواں، باقر خان، جس کو شہنشاہ جہانگیر نے ۱۰۳۸ ہجری میں مولتان اور بعد میں آگرہ اور اودھ کا صوبہ دار (گورنر) مقرر کیا، جو دور شاہجہان میں گجرات اور الٰہ آباد کا صوبہ دار بھی رہا، نے شہنشاہ جہانگیر کی حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی عقیدت اور لوگوں کے استعمال کے لئے تعمیر کروایا--مولتان میں باقر آباد اور وہاں کی قدیمی مسجد اس کی یادگار ہیں۔ باقر خان کی

شادی ملکہ نور جہاں کی بھانجی سے ہوئی اور باقر خان کا انتقال ۱۰۴۷ہجری میں الٰہ آباد میں ہوا--"

بالکل ساتھ ہی کنواں تھا، جو پکی اینٹوں سے خوبصورت گولائی میں کشادہ تعمیر شدہ تھا--کنویں کی جنوبی سمت میں پانی نکالنے کی چرخی، سرخ رنگ روغن سے آراستہ لگی تھی، جس سے ایک موٹی مگر بوسیدہ، لیراں پتیراں رسی کنویں میں شاید بطور علامت لٹکی تھی--کوئی پانچ فٹ نیچے کر کے کنویں پر موٹے سریے کا خانے دار جال فکس تھا اور اس لوہے کے جال کے چندرہ فٹ نیچے کنویں کی خشک تہہ نمایاں نظر آتی تھی--البتہ لوہے کے جال کے ایک کنارے پر لوہے کے جال کا ایک دروازہ کنڈی سے بند تھا کہ جس میں نیا، تازہ بہ تازہ تالا لگا ہوا تھا--کنواں بالکل خشک تھا کہ جس کی تہہ میں دنیا زمانے کا کچرا انہی عقیدت مندوں نے ڈال رکھا تھا، جو تہذیب، صفائی اور اعلیٰ اقدار کے ٹھیکے دار ہیں--!

ہاں البتہ اس غلیظ کچرے کے ساتھ جگہ جگہ دس، بیس اور پچاس کے نئے نکور کرنسی نوٹ بھی عقیدت مندوں نے ڈال رکھے تھے کہ جن کی خصوصی حفاظت کے لیے کنویں کے اوپر چوروں اور راہ زنوں سے بچاؤ کی خاطر سرکار باکمال نے لوہے کا جال نصب کر رکھا تھا۔ میں کیا عرض کروں کہ ان نوٹوں کے علاوہ کس قماش کی غلاظت سکہ رائج الوقت کے ہمراہ وہاں دیکھنے، سونگھنے اور منہ پھیرنے کو موجود تھی--ہائے افسوس--ان گنواروں کو عقیدت تو آ گئی مگر طہارت نہ آ سکی--!

سب سے دلچسپ اور افسوس ناک بات کا ذکر کیے بغیر، میرے نزدیک اس تاریخی کنویں کی موجودہ تاریخ کا احوال مکمل نہیں ہوتا--خشک کنویں کے اندرونی کنارے پر ایک سبز اور ایک دوسرا سیاہ بورڈ اندر کی سمت نہایت احتیاط سے لگایا گیا تھا، جو ہرگز ہرگز بوسیدہ نہیں تھا--دونوں بورڈوں کے اطلاع نامے کی عبارات حرف بہ حرف نقل کرتا ہوں اور نتیجہ آپ کی سوچ وفکر پر چھوڑتا ہوں--!

سبز بورڈ کی عبارت کچھ اس طرح تھی--!

"--زائرین اور عوام سے التماس ہے کہ کنویں کے پانی سے وضو کرنا، کلی کرنا اور کنویں میں تھوکنا سخت منع ہے--کیوں کہ کنویں کے نیچے قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق ہیں، تا کہ ان کی بے حرمتی نہ ہو اور پانی ناپاک نہ ہو--"

بہ حکم مینیجر اوقاف سرکل ملتان

دوسرے سیاہ اطلاع نامے کی عبارت کچھ یوں تھی--!

"--نوٹ فرمالیں--سبیل فی سبیل اللہ

پانی ضائع مت کریں--کنویں میں نذرانے اپنے ہاتھ سے ڈالیں، کسی کے ہاتھ میں نہ دیں--!

سبحان اللہ، سبحان اللہ--گراہی ہو تو ایسی ہو، ہدایات ہوں تو ایسی معصومانہ ہوں۔ خود راغب کرتے ہوں؛ مال کے ہاتھ آنے سے انکار نہ ہو اور طہارت کا بھی خیال ہو، جب کہ کنواں خشک بنجر ہو--کمال ہے بھئی کمال ہے--!!!

باب ۳

جیناں ملنگنی، پرندے اور دانہ
حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی ڈیوڑھی میں صبح

حضرت شاہ رکن عالم ابوالفتح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزار سے مشرق کی سمت اُن کے دادا حضرت بہاؤ الدین زکریا کا مزار تھا--- مگر سچ کہوں اور سچ کے سوا اور کچھ نہ کہوں اور یہ کہ میرا کہا بزرگوں کی شان میں گستاخی شمار نہ ہوتا ہو تو عرض یہ ہے کہ جو کیف و سرور اور عالم وجدانیت میں نے دادا حضور کی نسبت پوتے کے مزار میں محسوس کیا، وہ یہاں نصف کے قریب تھا---!

مزار کے احاطے کی ڈیوڑھی سے پہلے واقع دالان میں وسعت تو تھی مگر نہ جانے کیوں اُداسی کا پہرہ تھا--- داخلے کی ڈیوڑھی میں کشف خانہ تھا کہ جہاں زائرین اپنی جوتیاں خدام کے سپرد کر کے ننگے پیر احاطہ مزار کے صحن میں داخل ہوتے تھے--- ایک دو ملنگنیاں اپنی دھن میں مست زائرین کے جوتوں کی ایسے دل و جان سے حفاظت کر رہی تھیں کہ ان کے سپرد، اپنا میلا جوتا کرتے ہوئے مجھے شرم سی آئی--- مجھے لگا کہ ان کا مرتبہ مجھ جیسے گناہ گار سے کہیں بڑھ کر ہے--- ایک سبز پوش ملنگنی جوتے لیتی، کشف بردار جوتے کا ٹوکن دیتا--- پھر وہ پہلی ملنگنی، زائر کا جوتا اٹھا کر دوسری ملنگنی کے سپرد کر دیتی، وہ اپنے کندھے سے میلا جھاڑن اتار کر جوتے کو بڑی احتیاط اور ادب

سے کپڑا جھاڑن مار کر صاف کرتی اور جوتوں کی الماریوں میں قرینے سے سجا دیتی -- اللہ، اللہ کیا عقیدت کا مقام تھا کہ اس عزت افزائی کے احترام میں میرا تو دل کانپتا تھا --!

حضرت شاہ رکن عالم قدس سرہ کی خواہش اور وصیت تھی کہ ان کو وفات کے بعد اپنے دادا حضرت بہاؤ الدین زکریا علیہ رحمہ کے پہلو میں دفن کیا جائے، سو ایسا ہی کیا گیا -- مگر کہتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے گدی نشینوں اور اس وقت کے صوفیا کو خواب میں آ کر ہدایت کی کہ حضرت رکن عالم رحمۃ علیہ کی میت کو وہاں سے نکال کر اس جگہ دفن کرو کہ جہاں اَب ہے -- جب بہت سے صوفیا اور علماء اور گدی نشینوں کو روزانہ عالم خواب میں یہ بشارت ہونے لگی تو اس فیصلے کو برحق تسلیم کر کے میت منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا -- نئی جگہ کی نشاندہی بھی کر دی گئی تھی سو انتقال قبر کا مرحلہ منعقد قرار پایا -- اللہ جانے اس منتقلی میت وزمین میں کیا حکمت پوشیدہ تھی، اللہ ہی جانے -- بعض جگہوں پر تاریخ کے مصنفین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت غوث پاک نے یہ حکم جاری فرمایا تھا -- واللہ اعلم بالصواب --!

ان دونوں صوفیوں کے مزارات کی ابتدائی تعمیر غیاث الدین تغلق نے کرائی۔ کیونکہ ان صوفیا کے مزارات ملتان میں مرجع الخلائق تھے، اس لیے حکم دیا کہ ان بزرگوں کے شان شایان تعمیر کیے جائیں -- موجودہ نقشہ اور تعمیر ۱۹۷۰ء میں محکمہ اوقاف نے بڑی خوبصورتی سے کی ہے --!

کشف خانے کے ہاتھی کے قد کے برابر نقشین دروازے میں کھڑے ہو کر جب پہلی نظر دربار حضرت بہاؤ الدین زکریا پر پڑی تو ایسا محسوس ہوا کہ ادا سی غالب ہے -- ملتانی نیلی نقشین روایتی ٹائلوں سے مزار کی وسیع و عریض پیشانی اور در و بام خوبصورتی اور نفاست میں اپنی مثال آپ نظر آئے --!

ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کی دو سرخ چھوٹی اینٹوں کی سیڑھیاں اتر کر بالکل دائیں جانب کوئی کبوتروں کا دانہ فروخت کرتا تھا -- مگر وہ اپنے تھڑے پر موجود نہیں تھا - دانہ فروش کے بالکل برابر میں ایک بڑا، وسیع و عریض صحن تھا کہ جہاں سینکڑوں کبوتر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے، فرش پر پڑا دانہ چگتے تھے، مگر دانہ فروش کے پڑے دانے پر نگاہ بھی نہ ڈالتے تھے --!

دانے کے انداز فروخت نے نہ صرف مجھے چونکایا بلکہ پوری طرح متوجہ کیا -- عجیب خوبصورت انداز تھا پرندوں کے لیے دانہ فروخت کرنے کا، جو میں نے پہلی بار ایک نئی اختراع اور نفاست کے ساتھ دیکھا -- طرح طرح کے رنگین ملتانی چھابوں میں یہ دانہ سجا کر رکھا گیا تھا -- چھابے صرف دو سائز میں تھے، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا

چھابا، بڑے چھابے کا تقریباً نصف تھا-- پرندوں کے اس دانے میں کئی طرح کے صاف ستھرے، چمکتے دمکتے اجناس تھے کہ ذرا دور سے بڑے رنگین اور پرکشش موتیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے--سفید ٹکڑا چاول، مسور کی دھلی ہوئی گلابی دال، چمکتا ہوا باجرہ، سرخ دیسی جوار اور اس کے ساتھ سفید دریائی جوار، باریک زرد پہاڑی مکئی، دودھیا سفید پنجابی مکئی، دیسی باریک دانے کالے اور سفید کابلی چنے، صاف ستھرے چھلکوں سے نکلے ہوئے جَو، باریک خوش شکل دیسی ثابت گندم اور باریک سیاہ ماش--ان سب کو الگ الگ چھابوں میں مختلف ڈیزائنوں میں کاریگری کی خاص ترتیب اور رنگوں کے لحاظ سے باقاعدہ نستعلیق ترتیب سے سجایا گیا تھا۔ ہر چھابے میں اجناس کا ڈیزائن الگ، منفرد اور جاذبِ نظر تھا--جس کو لفظوں میں بیان کرنا اور ہر چھابے کی ترتیب کا بیان کرنا خاصہ تفصیل طلب اور مشکل کام ہے--میں نے اس فن کاری کے عجوبے کی بہت سی تصاویر بنائیں تا کہ اس فنکاری کی سند رہے۔ ڈیزائن بنانے میں اجناس کے چمکتے رنگوں نے ہی اہم کردار ادا کیا تھا۔ سب سے خاص بات یہ تھی کہ اجناس کے رنگوں کو ایسی ترتیب دے کر سجایا گیا تھا کہ ہر جنس نے اپنی رنگینی کی انفرادیت کے وجود کو قائم رکھ کر چھابوں کی کشش اور خوبصورتی کی سجاوٹ میں دل موہ لینے والی نفاست اور دلچسپی پیدا کر دی تھی--!

افسوس کے دانہ فروش موجود نہیں تھا، مگر اس کی کمی اس ملنگنی نے پوری کر دی جو جوتے جھاڑ جھاڑ کر قرینے سے الماریوں میں رکھتی تھی--وہ شائد یہ سمجھ کر میرے پاس آئی کہ میں پرندوں کے لیے دانہ خریدنے کا خواہش مند ہوں--مگر جب میں نے اس کو بتایا میں اِن چھابوں میں اجناس کی ترتیب خوبصورتی سے دلچسپی رکھتا ہوں تو اس نے اس جملے سے بات شروع کی۔

''--صاحب جی--میرا ناں جیناں ملنگنی ہے--''

''--یہ پرندے اللہ کی طرف سے یہاں کے عاشق اور حضرت صاحب کے مرید ہیں، یہیں پیدا ہوتے ہیں، یہیں روکھی سوکھی کھاتے ہیں، یہیں دیواروں کی منڈیروں پر سوتے ہیں اور یہیں طواف کرتے ہیں، پھر یہیں انڈے بچے دیتے ہیں اور کسی دن جب اجل آتی ہے تو اسی دَر کے صحن میں گر کر جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں--بڑا چھابہ سو روپے کا ہے اور چھوٹا پچاس کا ہے--لوگ اس دانے کو اپنے بچوں، بیماروں اور محبت کرنے والوں پر سے صدقہ کر کے بھی ڈالتے ہیں--کچھ بڑے سائیں سے محبت کرنے والے حضرت مآب کے نام پر بھی کبوتروں پرندوں کو یہ دانہ عقیدت سے ڈالتے ہیں--ایسے ایسے چاہنے والے بھی ہیں، جو روز آتے ہیں، حضرت مخدوم کو فاتحہ پڑھ کر بخشتے ہیں اور پھر واپسی پر اجناس کے دانے کا چھوٹا یا بڑا چھابہ اپنے ہاتھ سے ان معصوم کبوتروں کی نذر کر دیتے

ہیں۔ بس ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ ہے، جو دن رات پرندوں کے لنگر کی صورت چلتا ہی رہتا ہے-- بڑی دعائیں دیتے ہیں-- اللہ ان کی دعا اور شکر ہم سے زیادہ سنتا ہے اور فوراً قبول کرتا ہے-- جو لوگ ان بے زبانوں کو رزق دیتے ہیں، اُن کے رزق میں ہر دانے کے بدلے، بے حساب برکت آتی ہے-- دنیا میں ہر ذی روح کی ضرورت بلکہ سب سے بڑی طلب رزق کی ہے-- جب بندہ بھوکا ہوتا ہے تو اس سے رزق کی قدر و قیمت پوچھو-- بھرے پیٹ والے کو کیا پتہ کہ رزق کی قدر و قیمت کیا ہوتی ہے--"

مائی جیناں اپنی رُو میں بولے چلی جارہی تھی-- رزق کی قدر و قیمت فقط حقیقی بھوک سے مرتا ہوا ہی جانتا ہے-- یہی فلسفۂ زندگی تھا اور میں اس سے بخوبی آشنا تھا--!!!

میں حیرانگی سے دیکھ رہا تھا کہ درجنوں اجناس کے چھابے سجے ہوئے کھلے پڑے تھے اور چند ہاتھ، چند گز دُور ہزاروں کبوتر صبح صبح فرش زمین پر پڑا دانہ بڑی رغبت سے چگ رہے تھے-- دانے کا مالک دور دور تک نہیں تھا-- مگر مجال ہے کہ کوئی کبوتر یا چڑیا آ کر ان سجے ہوئے اور اپنے پسندیدہ رزق سے بھرے ہوئے چھابوں پر ہلّہ بول دے-- وہ یقیناً بھوکے تھے مگر صرف اسی کو کھا رہے تھے کہ جو ان کو فرشِ زمین پر عطا کیا گیا تھا-- یہ سجا ہوا دانہ ایک امانت تھی-- وہ امانت کا لحاظ رکھے ہوئے تھے، ورنہ چاہتے تو موقع سے حضرت انسان کی طرح فائدہ اٹھا کر اور داؤ مار کر اس کھلے دانے پر حملہ کر سکتے تھے-- تب مجھے لگا کہ اِن آستانۂ صوفی کے پرندوں میں ہوس نام کی کوئی شے نہیں تھی، ہوس صرف حضرت انسان میں ہی ہے، پرندے، چرندے اور درندے ہوس سے عاری ہیں، ورنہ ایک شیر ایک دن میں ہی پورے جنگل کے ہرنوں کا صفایا کر دیتا--!!!

میں نے نظر اٹھا کر صحن کے پار دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا-- صبح کی ابھرتی تابناک سفیدی میں ایک اور ملکوتی منظر میرے سامنے تھا--!

حضرت بہاؤ الدین زکریا علیہ رحمہ کے مزار کا چوکور احاطہ بہت نورانی اور سحر بھرا تھا--!

میرے سامنے بائیں طرف مسجد تھی جس کی پشت پر مسجد کی دیوار سے جڑا حضرت قدس سرہ کا مزار تھا-- مگر میری نظر تو مسجد کے در و بام کے حسن پر ٹھہر کر اٹک گئی--!

مسجد کا ماتھا ملتانی نیلی منقش ٹائیلوں سے مزین تھا، ان ٹائیلوں پر آیات کلام پاک جس خوبصورتی، نفاست اور حسن التزام کے ساتھ خطاط نے لکھی تھیں، اس کا بیان، سمجھئے کہ ناقابل بیان حد تک جمیل تھا-- مسجد کے دونوں بڑے منارے اور ان کے چاروں ستون انہی نیلی ٹائیلوں سے مزین تھے۔ یہ مینارے، گنبد سمیت زیادہ سے

زیادہ تین گز بلند نظر آتے تھے۔ میناروں کے روایتی گول گنبد فقط سفید تھے۔۔۔ مسجد کے ماتھے پر بھی دو چھوٹے گنبد اور مینارے، بڑے میناروں سے پورے پورے نصف تھے؛ ان کے نیچے تین محرابی کھلے در تھے۔ درمیان والا چوڑا جب کہ اس کے دائیں بائیں والا تنگ، مگر اونچائی تینوں کی ایک سی تھی۔۔۔ درمیانی تین محرابوں کے دائیں بائیں مزید دو، در تھے۔۔۔ فقط ان دروں کے گرد حاشیہ سفید تھا باقی نیلی ٹائیلوں کا کام اور ان کے اوزان مربع تھے۔ بائیں طرف، کچھ الگ الگ سادہ سی قبریں، چبوتروں کے ساتھ تھیں کہ جن پر منقش چادریں احتراماً ڈالی تھیں۔۔۔!

حضرت بہاؤ الدین زکریا کے مزار، مسجد اور دالانوں کا نقشہ اور تعمیر چوکور تھی۔۔۔ مسجد بھی مربع، مزار بھی مربع، صحن اور دالان بھی مربع۔۔۔ بلکہ مزار اقدس کی مسجد کی چھت کے پس منظر میں نظر آتی پہلی منزل بھی بہ شکل مربع تھی کہ جس کے چاروں کونوں پر سفید مینار اس کی تعمیراتی خوبصورتی میں بہت روحانی قسم کی چکا چوند پیدا کرتے تھے۔۔۔ اس چوکور میناروں والی چھت کے عین درمیان سے گنبدِ مزار آسمان کی طرف سر اٹھائے استادہ تھا۔۔۔ مزار کی تمام عمارت جو نیلی اور سفید منظر کے پس منظر میں نظر آتی تھی سرخ چھوٹی اینٹ سے تعمیر شدہ تھی۔ گنبدِ مزار شش پہلو تھا کہ جس کے ہر پہلو کے درمیان بیضوی درّہ کھلا تھا کہ جس سے ہوا بھی اندر آتی ہوگی اور کبوتر بھی سلامی دینے حاضر ہوتے ہوں گے۔۔۔ دروں کی محرابوں پر بھی نیلی منقش ٹائلوں کا مستطیل حاشیہ اس کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کرتا تھا۔۔۔!

مسجد کے دائیں جانب مزار میں داخلے کا برآمدہ تھا کہ جس میں بہت سی قبریں کشادہ رستہ چھوڑ کر بنی تھیں، جن کے کتبوں سے معلوم ہوتا تھا کہ گدی نشین مخدوموں کی ہیں۔

پھر برآمدے کے اندر جا کر ذرا آخر میں بائیں طرف حضرت کے مزار میں داخلے کا چھت تک اونچا دروازہ تھا کہ وہ بھی آبنوس کی نایاب لکڑی سے بنایا گیا تھا۔۔۔ اس دروازے کی چوکھٹ اور محرابوں پر لکڑی میں گل کاری اور نقش نگاری بالکل اسی خوبصورتی، نفاست اور جمال کے ساتھ کندہ تھیں کہ جیسے ابھی میں نے حضرت بہاؤ الدین زکریا رحمۃ علیہ کے پوتے حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ علیہ کے مزار میں دیکھی تھیں۔۔۔ دروازہ بہت قدیم تھا۔ اس کی لکڑی اور نقش ونگار بتاتے تھے کہ قدیم کاری گروں کی فن کاری کا تحفہ ہے۔۔

امتیاز یہ تھا کہ اس دروازے کی چوکھٹ اور پٹوں پر نقش ونگار تھے۔۔۔ آیات نہیں تھیں۔۔۔!

اندر داخل ہوتے ہی قبریں ہی قبریں اور ان کے باترتیب نشان تھے۔ کسی بھی قبر پر صاحب قبر کا اتہ پتہ درج نہیں تھا۔۔۔ سب قبریں سفید روغن، ایک ہی سائز اور ایک انداز میں تعمیر شدہ تھیں۔ مگر ذرا فاصلے فاصلے پر

تھیں--قبروں کے آخر میں حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ علیہ کی قبر ایک لکڑی کے خوبصورت احاطے، مچان اور چھت کے ساتھ تھی--سادگی اور نفاست درو بام سے جھانکتی تھی--لکڑی کے مخصوص احاطے مین دو قبریں تھیں۔ ایک چوڑائی میں بڑی اور دوسری چوڑائی میں ذرا چھوٹی۔

چھوٹی قبر اصل میں، اُس قبر کا نشان تھا کہ جہاں حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ علیہ کے پوتے، نورِ نظر حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ علیہ بھی دفن ہوا کرتے تھے۔

بے شمار زائرین بیٹھے قرآن حکیم کی تلاوت میں مصروف تھے اور قرآن پاک کی آیات کو زیرِ لب پڑھے جانے سے مزار کے اس اندرونی احاطے میں ایک ماورائی قسم کی گونج کا احساس تھا کہ لگتا تھا کہ کچھ ماورائی مخلوق بھی اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے--!

میں نے حضرت کے قدموں کی جانب سے کھڑے ہو کر اور محراب کو چھو کر طریقہ سہروردیہ کے آداب کے ساتھ فاتحہ پڑھی اور وہی دعائیں اس ہستی کے توصل سے مانگیں جو اُن کے پوتے کے یہاں قصیدہ بردہ شریف کو سن کر مانگ رہا تھا--میں سمجھتا ہوں کہ یہ کیسی نیک ہستیاں ہیں کہ جن کی قبروں پر دن رات قران پاک، درود و سلام اور آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت جاری رہتی ہے--خواہ کسی دن کے پہر میں آ ؤ یا رات کے کسی پہر میں نذرانہ عقیدت ہر خاص و عام کی زبان سے جاری ملتا ہے--یہ فضیلت کسی عام آدمی کو حاصل نہیں ہوتی اور جن کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے، وہ بارگاہ خداوندی میں اللہ کے ایسے نیک بندے ہوتے ہیں کہ بعد از موت ہزاروں سینکڑوں سال کے بعد بھی ان کی مغفرت جاری ہوتی ہے--ایسی ہستیوں کا دعا میں توصل یقیناً قبولیت کی سند کا درجہ رکھتا ہے--اور جن نامعلوم ہستیوں کی مرقدگاہیں، ان کے احاطے میں ہیں، وہ بھی شرف کی اعلیٰ منزل پر فائز ہوں گے--!

پھر میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مرکزی دروازے کی اندرونی چوکھٹ پر آ کر بے ساختہ فرشِ زمین پر نہایت ادب کے ساتھ بیٹھ گیا اور بے ساختہ حضرت بہاؤالدین زکریا کے نقشِ قبر کو عالم بے خودی میں تکنے لگا--سچ پوچھیے میرا دل ہر خیال سے خالی تھا--فقط یہی خیال دل و دماغ میں روشن تھا کہ ایسی عظمت صرف ولی کا حصہ ہوتی ہے--باقی سب خالی خولی اور دنیاوی ہے۔

میں نے رات بھر کے سفر کے رت جگے میں تھکاوٹ کو محسوس کیا--مجھے لگا کہ ہر طرف نور کی برسات ہو رہی ہے--روشنی میں نامعلوم نور گھلا ہوا ہے اور سب حاضر نور کے پس منظر میں جا کر عالم علوی کے وجدان میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے--!

میں نے مشرقی دیوار کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا -- مجھے نیند سی آ رہی تھی، مگر دل اور دماغ جاگ رہا تھا -- میں خود کو عالم استغراق میں محسوس کر رہا تھا -- کہ لگا کہ عالم محویت ظاہری ہے یا خاموشی میں قرآن پاک کے آہستگی سے پڑھے جانے کی پر سکون تلاوت فضا اور میری طبیعت میں کوئی نا معلوم سا نشہ گھولتی ہے --!

دل نے کہا، اس بزرگ کے آستانے کے فرش خاک پر دونوں ہاتھ رکھ کر جما دے -- میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر کھول کر رکھ دیے -- نیند تھی یا کوئی عالم کیف و سرور تھا کہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا، مگر تھکن ہرگز ہرگز نہ تھی، بس بعد میں احساس ہوا کہ عالم نروان سے بھی اعلیٰ کوئی کیفیت تھی کہ جس کو یہاں بیان کرنا آسان نہیں ہے -- شاید میں گہرے استغراق کے عالم میں مست تھا کہ جس کا سرور یا تو دھمال ڈالتا ملنگ جانتا ہے، یا پھر استنبول کا درویش -- یا پھر میں، کہ اس عالم بے خودی کے لمحے میں غلطاں تھا کہ کسی نا معلوم ہستی کے سر پر کھڑے ہونے کا احساس جاگا -- نہ سر اٹھا کے دیکھا اور نہ میں نے آنکھیں کھول کر جانچا --!

بس اتنا احساس تھا کہ کوئی ہستی ہے کہ اس کے زیر سایہ آنکھیں بند ہیں، دل پُر سرور ہے اور مرکزِ نگاہ دل مدہوش ہے --!

کوئی سر پر کھڑا آہستگی سے کہہ رہا ہے --

"-- دکھ نہ لے، فنا قریب ہے، لفظ جاگتے ہیں اور ہمیشہ لوح پر جاگتے رہیں گے، خیال عالم لطف میں سر برہنہ ہیں، موج دریا میں ہے اور تحریر عالم علوی میں زندہ رہنے والی چیز ہے -- لوح اور قلم ساتھ ساتھ ہیں؛ بس یہی کائنات کا عالمِ روحانیت کے درجہ علوی میں عالم ثبات کا بے کراں کنارہ ہے -- کہ آدمی جب فطرت شیطان کے حاوی ہو جانے کے سبب، بے بس کر دیا جاتا ہے اور بے بسی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے، کوئی چارہ نہیں رہتا۔ شیطانی وار ہر سمت سے چھا جاتے ہیں تو منہ گالیاں بکنے لگتا ہے -- مگر یاد رکھ کہ وہ بدکلامی دل کے نہاں خانوں سے نہیں ہوتی -- بس، بے بسی میں ہوتی ہے اور جب حد اس سے بھی گذر جاتی ہے تو راہ نجات میں موت کی تمنا بڑھ جاتی ہے۔ جیسے دکھ میں بچے کو ماں کی گود یاد آتی ہے -- بے بسی بے کراں ہو جاتی ہے -- تب عالم علوی تیری ذات کی بے بسی اور تیری تمنا پر فقط مسکراتا ہے اور ابلیسِ شیطانی کو عرشِ معلیٰ پر یک سَر رد کر دیتا ہے کہ تو نیک نفس ہے -- پھر وہ تجھ میں معرفت کے سُوتے جگا دیتا ہے کہ وہی اس عالم سفلی کے ہر فاسد خیال اور جذبے سے نجات کا سبب ہوتے ہیں -- خودکشی وہی لوگ کرتے ہیں، جن کو عالم علوی سے رد کر دیا جاتا ہے -- جاگ جا کہ ہر طرف نور کے چشمے فروزاں ہیں -- سب کچھ درخشاں ہے -- تو عالم حیات میں ہے اور ایک نیا جہاں تیرے چاروں جانب، اوپر سے

نیچے اور نیچے سے اوپر کی طرف اپنی تابنا کی بکھیر رہا ہے--!

یاد رکھ کہ جیسے عورت، مرد کو تاؤ دلاتی ہے کہ عورت کے مرد کو تاؤ دلانے سے، مرد کی عمر گھٹتی ہے اور عورت کی عمر بڑھتی ہے--ایسی عورت حکمرانی چاہتی ہے--حکمت کے اس پوشیدہ راز کو فقط وہی جان سکتا ہے کہ جو تاؤ کے جوش کے بعد فکر کرے اور کھرے اور کھوٹے میں پہچان قائم کر سکے--!''

فون کی گھنٹی بجتی ہے--

ادھر کبوتروں کی ایک جوڑی بہاؤ الدین زکریا علیہ رحمہ کے مزار کے گنبد کی کشادگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گول گول گنبد کے اندر اڑان بھر رہی ہے کہ جیسے فضائے بسیط یہی ہو--میری گھبرا کے آنکھ کھل جاتی ہے--کوئی سورہ کہف کی تلاوت کر رہا ہے، کوئی دھیرے دھیرے نعت گنگنا رہا ہے--

فون کی گھنٹی پھر بجتی ہے--

ادھر عندلیب ہے--

''--کہاں ہیں آپ--؟''

''--میں حضرت بہاؤ الدین زکریا علیہ رحمہ کے مرقد مبارک کے سرہانے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں--''

''--اوہ--دعا کر دیجئے، ہم سب کے لیے، بچوں کے لیے، عزیزوں کے لیے--''

''--میں وہی کر رہا ہوں--''

اور فون بند ہو جاتا ہے--''میں مصلے پر بیٹھی ہوں اور دعا کر رہی ہوں، آپ کا خیال آیا تو فون کر لیا--دعا جاری رکھئے--''!!!

☙

باب ۴

صُوفیوں کی سرزمین
سائیں جی کی جُوئیں، میرے سَر میں

ہمارے ملک میں ملتان ایک ایسا شہر ہے کہ جو صدیوں سے صوفی سنتوں کی سرزمین ہے--- صوفی ازم کی جو بہار ملتان کو نصیب ہوئی، وہ یگانہ روزگار ہے--- جس جگہ میں کھڑا ہوں، اصل میں یہ قلعہ ملتان تھا، جب پاکستان بنا تو اس قلعہ ملتان کے آثار بہت واضح تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ سب آثار تباہی سے ہم کنار ہو گئے--- لوگوں اور گھس بیٹھئے جگہ جگہ سے داؤ لگا کر، قلعے کی دیواروں کو گرا گرا کر اپنے گھر بنانے لگے--- اور سب سے اہم اور دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ ایسے بے رحم لوگ تھے کہ جنہوں نے قلعے کی بوسیدہ دیواروں میں ایسے گھاؤ ڈالے کہ پوری پوری دیوار اپنے وزن سے گر گئی--- بے رحموں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس دیوار کے گرنے سے جو مٹی نکلی اسی کو ہموار کر کے عین اسی جگہ پر اپنے مکانوں کی کرسیاں اونچی کر کے بنائیں اور جو اینٹیں، دیوار گرنے سے حاصل ہوئیں، اسی سے اپنے مکان تعمیر کر لیے--- جب حکومت کے محکموں اور کارندوں کی اونگھ سے آنکھ کھلی اور انہوں نے ان نجی تعمیرات پر اعتراضات کیے تو ان کے منہ رشوت کے پیسے کی سُوئی سے ایسے سی دیے کہ سرکاری کاغذوں میں سب درست پایا گیا ہے کہ رپورٹ لکھ کر فائلوں کو داخل دفتر کر دیا گیا--- بس اس عمل نے قلعہ ملتان کے باقی ماندہ آثار کو بھی روپے پیسے

کی مٹی سے دفن کر دیا گیا--ان بزرگوں کے مزار صرف اس لیے بچ گئے کہ وہ قلعے میں اونچے ٹیلوں پر واقع تھے--مگر جن لوگوں کے منہ کو خون لگ جائے، وہ خون پینے سے کبھی باز نہیں آتے--ابھی ۱۹۹۰ء سے ذرا پہلے انہی ہوس پرستوں نے ان مزارات کو بھی نگل جانے کی شاطرانہ سازش کی۔ کیا یہ کہ ان مزارات کے برابر خالی قطعہ زمینوں پر انہوں نے قبروں کے نام ونشان آہستہ آہستہ اپنی چال بازی سے بھولے بن کر مٹانے شروع کر دیے اور پھر ان خالی شدہ جگہوں پر ملنگ کوٹھریاں تعمیر کرلیں، کہیں مسجدوں کی نام نہاد بنیادیں رکھ دیں کہ اگر سرکار نے مسجد کو گرایا تو شہر میں ''اسلام خطرے میں ہے'' کے نام سے ہنگامہ آرائی شروع کر دیں گے--مگر اللہ بھلا کرے ایسے ایسے دبنگ اور حق پرست افسران بھی یہاں آئے، جو ان قبضہ مافیا کی چالوں اور چالاکیوں کو سمجھتے تھے۔انہوں نے ایسے بے مراد اور مکار لوگوں کی چالوں کو سمجھا اور سب کچھ واگذار کرا کے، ان لوگوں کو ان کی اوقات میں دھکیل دیا اور باقی بچا کھچا آثار قدیمہ اور اسلاف کا سرمایہ بچالیا--جس کے طفیل آج ہم ملتان قلعے کے معدوم مگر موجود حصے دیکھ رہے ہیں۔ان بزرگوں اور اولیا کے مزاروں کو حیات نَو دی کہ وہ چمکتے دمکتے ہمارے سامنے ہیں۔اور ان بے ضمیر اور ہوس پرست مافیا کا خاتمہ کیا کہ جنہوں نے ہزاروں سال کے تمدن اور تہذیب کو چند سالوں میں اپنی جہالت اور اخلاقی درندگی سے پامال کر دیا تھا--!

یوں تو ملتان، شہر قدیم میں بے شمار صوفیا کے مزارات ہیں کہ بعض جانے پہچانے اسماء ہیں اور بعض نامعلوم ہیں، مگر ہیں--حضرت بہاؤالدین زکریاؒ، حضرت شاہ رکن عالم ابوالفتحؒ کے علاوہ شاہ شمس تبریزؒ، حضرت شیخ سیف الدین غزرونی اور اُچ شریف ملتان کی بغل میں ہیں کہ سب سے بڑی روحانی اور اولیائی شخصیت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے مزارات ہیں۔

یہ قلعہ اور اس کی سرزمین پاک ہستیوں کی پسندیدہ مٹی ہے۔ حضرت سید یوسف گردیزی علیہ رحمۃ، حضرت عبدل جلیلؒ، حضرت علی اکبر کہ جن کا مزار، حضرت شاہ رکن عالم کے مزار کے بعد سب سے زیادہ خوبصورت اور مرجع الخلائق ہی۔ حضرت علی اکبرؒ کی والدہ گرامی کا مزار، شہر ملتان میں ریلوے اسٹیشن کے قریب حضرت بابا خواجہ اویس خان گاہ کا مزار ہے اور پھر حضرت شاہ رکن عالم کی والدہ ماجدہ کا مزار کہ جس نے ایسے یگانہ اور صاحب ولی کو جنم دیا۔ان کا مزار بی بی پاک دامن کے نام سے مقبول ومشہور ہے اور ملتان ریلوے اسٹیشن کے قریب حضرت بابا خواجہ اویسؒ کے مزار کے بالکل متصل ہے--پھر کبیر والا کے راستے میں حضرت خالد ولیدؒ کا مزار بھی ہے--یہ بھی اپنے زمانے کے بڑے صوفی ولی تھے۔

گویا ملتان صوفیا کی عجیب زرخیز سرزمین ہے کہ جہاں ان صوفیا کی موجودگی کی برکت سے اسلام جیسے پُر امن اور پُر خلوص اخلاقی دین کا فروغ ہوا۔

جیسے ہی میں حضرت بہاؤ الدین ذکریاؒ کے مزار سے متصل بڑے دروازے سے سلام کر کے باہر برآمدے میں آیا تو ایک سبز پوش صوفی منش ملنگ کو عین مرکزی دروازے کے سامنے عالم بے خودی میں دیکھا--فقیر بڑے پُر سکون انداز میں محویت رقص میں تھا--نہ کوئی چمٹا تھا، نہ کوئی پاؤں میں چھن چھن، بجتے گھنگرو تھے--بس سبز چولا تھا، ہاتھوں کی انگلیوں میں فیروزے، عقیق اور نیلم کی انگوٹھیاں تھیں، دونوں پاؤں کے ٹخنوں کے اوپر ایک ایک چاندی کا بڑا کڑا، بیمار کربلا امام زین العابدین علیہ السلام کی یاد میں پہنے تھا--گلے میں مٹی کے بڑے بڑے دانوں سے بنی بڑی مالا پڑی جھولتی تھی--مونچھیں، داڑھی اور سر کے بال ایک جان کھچڑی تھے--اور وہ عالم بے خودی میں اپنے پیروں کے احاطۂ زمین پر کھڑا سلو موشن میں، اپنے بدن کو دائرے کی شکل میں گھما کر، عالم کیف میں تھا، جیسے اندر داخل ہونے سے پہلے حضرت کو سلامی دے رہا ہو--!

میں مرقد کے مرکزی دروازے کی دہلیز میں اُسے دیکھ کر رک گیا کہ کہیں میرے باہر نکلنے سے اس کی وجدانی کیفیت میں فرق نہ آ جائے، کوئی رخنہ نہ پیدا ہو جائے۔ اس نے ایک نظر بھر کے مجھے دیکھا--مجذوبیت اس کی آنکھوں سے شعلوں کی طرح نکلتی تھی اور اس کا بدن عالم وجد میں مسلسل ایک پُر سکون حرکت میں تھا--پھر وہ لمحہ بھر کو رُکا--مجھے غور سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا--وہ آگے بڑھا اور بڑھ کر اس نے میرے سر سے میری پشاوری ٹوپی اتار کر اپنے سر پر رکھ لی اور پھر پورے انہماک سے سلو موشن رقص میں، دنیا سے بے خبر مصروف ہو گیا--!

میں وہیں، بیرونی دروازے کے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گیا--اور اس کو اپنی ٹوپی کے ساتھ حالت رقص میں دیکھنے میں محو ہو گیا--!

اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اگر فقیر میری ٹوپی اوڑھے اوڑھے حضرت بہاؤ الدین ذکریا کے مزار کے احاطے میں داخل ہو گیا تو میں اس سے اپنی ٹوپی نہیں مانگوں گا--پھر سوچا کہ اگر وہ کسی اور سمت چلا گیا تو تب بھی نہیں مانگوں گا--اگر اس نے خود سے واپس کر دی تو تبرک سمجھ کر لے لوں گا--میں یہ سوچتا جاتا تھا اور خاموشی سے اسے عالم کیف و سرور و مستی میں دیکھتا جاتا تھا--برآمدے کے آخری سرے پر بیٹھا پھول فروش میرے پاس سے گذرا اور گذرتے گذرتے بولا--

"--باواجی--ہن ٹوپی نوں بھل جاؤ--سائیں جی مالک ہو گئے نیں--ہن انہاں نے کتھے واپس کرنی اے--"

(باواجی--اب آپ ٹوپی کو بھول جائیں--سائیں جی اب اس کے مالک ہو گئے ہیں، اب انہوں نے کہاں ٹوپی واپس کرنی ہے)

مجھے اپنی ٹوپی سے زیادہ سائیں جی کی درویشانہ محویت سے دلچسپی تھی--وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنی دنیا میں دل و جان سے مگن تھے--!

ابھی پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ انہوں نے اپنا رقص تمام کیا--رُکے--اپنے سر سے ٹوپی اتاری--میرے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے احترام کے ساتھ چھوا--اور ٹوپی میرے سر پر ایسے احتیاط سے رکھ دی، جیسے دستار بندی کر رہے ہوں اور خاموشی کے ساتھ اندر احاطۂ مزار میں دبے قدموں سے چلتے ہوئے داخل ہو گئے--!

برآمدے کے سرے پر جو دالان میں کھلتا تھا، وہی پھول فروش پھر مل گیا--اس نے مجھے روک لیا۔

"--میں یہاں اکیس سال سے اسی جگہ پر پھول بیچ رہا ہوں اور تب ہی سے روزانہ سائیں جی کو دیکھتا ہوں--آپ سے صرف ایک بات پوچھنی ہے--وہ یہ کہ میں نے سوائے گدی نشین مخدوموں کے، کسی کے پیروں کو چھوتے، سائیں جی کو نہیں دیکھا--صرف یہ بتادیں کہ آپ ہیں کون کہ جس کے پیروں کو سائیں جی نے چھوا ہے اور ٹوپی بھی واپس کر دی ہے--؟؟؟"

اس نے حیرت زدہ ہو کر مجھ سے پوچھا--

"--میں--میں کچھ بھی نہیں ہوں--مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں--ہاں بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے اندر بھی ایک فقیر اور بھک منگا جیتا ہے--"

میں نے بے معنی سا جواب دیا--میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا--مجھے پھول فروش کی تجربہ کارانہ بات نے چکرا کر رکھ دیا تھا کہ سائیں جی، کسی کے پیر نہیں چھوتے، سوائے مخدوموں کے--میں ہرگز ہرگز مخدوم نہیں ہوں--میں تو ایک سادہ سا آدمی ہوں--اپنی ذات میں مگن، دنیا کے دکھوں میں تنہا، جلتا اور بے چین--مجھے دُکھ ہے کہ لوگ آپس میں ریا کاری کیوں کرتے ہیں، پیار کیوں نہیں کرتے--سب میں حسد ہے، پر مجھ میں کیوں نہیں ہے--مجھے کوئی ہوس نہیں ہے، جو ملا ہے اور جو ملتا ہے، میں اس پر دل و جان سے قانع ہوں--مجھے دوسرے کے درد

سے خود میں بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے-- میں اللہ سے دل و جان کے ساتھ محبت کرتا ہوں اور جن ہستیوں سے خود اللہ پاک محبت کرتا ہے، ان سے میں محبت کرتا ہوں-- پر مجھے دکھ ہے کہ میں ان ہستیوں سے محبت کا پورا پورا حق ادا نہیں کر پاتا-- جب کہ اُن کی رحمت میرے اور میرے پورے گھرانے کے سر پر ہمہ وقت سایہ فگن ہوتی ہے-- دنیا داری اکثر مجھے اپنے تھپیڑوں میں بہانے کی کوشش کرتی ہے-- کبھی کبھی میں ورغلاوے میں بہک بھی جاتا ہوں مگر جانتا ہوں، کہ پھر واپس اپنی جگہ پر آ جاتا ہوں-- ایسے میں ندامت سے دل خون کے آنسو روتا ہے-- پھر نیند نہیں آتی-- جسم سو رہا ہوتا ہے مگر دماغ جاگتا ہوتا ہے اور شرمندگی سے معافی پر معافی مانگتا ہوں-- کاش کے وہ معاف کر دے-- جب احساس ہوتا ہے کہ اس نے درگذر کر دیا ہے تو گہری نیند آتی ہے اور کچھ ہوش نہیں رہتا-- ایسی کیفیت میں کوئی خواب، کوئی بشارت نہیں ہوتی؛ بس روح اور جسم میں سکون آ جاتا ہے-- بیماریاں دور بھاگ جاتی ہیں، عالم روشن ہو جاتا ہے، زندگی آسان ہو جاتی ہی اور سکون ہی سکون ہر سمت چھا جاتا ہے--!''

دالان سے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے محسوس ہوا کہ میرے گنجے سر پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں-- میں نے ٹوپی اتار کر اپنے سر کے کھلے میدان پر ہاتھ پھیرا، ایک نہیں دو چیونٹیاں ہاتھ آ گئیں-- ان کو پھینکنے سے پہلے ہتھیلی پر رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو موٹی موٹی سیاہ جوئیں تھیں، جو درویش کے سر سے چڑھ کر ٹوپی میں منتقل ہوئیں اور پھر میرے سر پر حیران و پریشان سرگشت میں مصروف پکڑی گئی تھیں-- گھبرا کر ٹوپی کو دیکھا، دو چار اور پکڑی گئیں-- ساری ٹوپی، اوپر نیچے، آگے پیچھے سے، بہ نظر عمیق کھنگالی-- مگر اللہ کے فضل سے اور نہ ملیں اور نہ ہی باقی سفر میں کسی جوں نے ستایا-- بس وہ اسی دربار کی دین تھیں، میں ان کو اسی دربار کے صحن کے ایک کونے میں احتیاط سے چھوڑ آیا، کہ فقیر کا تکیہ ہی ان فقیرنیوں کو بیچ میں راس تھا-- مجھ دنیا دار آدمی کے گنجے سر سے ان کو کیا دلچسپی ہوگی کہ وہ گھنی بالوں کے جنگل میں رہنے کی عادی تھیں اور یہاں میدان بنجر اور بے آب و گیاہ، بے ثمر تھا--!!!

☙

باب ۵

ہم سمجھے کہ وہ بلّیوں کے بلونگڑے ہیں، مگر وہ نکلے چوہے

حرم گیٹ کے ریستوران میں ناشتہ ہوتا ہے

فون کی گھنٹی بج رہی تھی -- کرامت علی لائن پر تھے۔

"-- آغا صاحب کہاں پر ہیں -- میں آپ کو بہت دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں -- وہ خرم شکیب صاحب نے چوک گھنٹہ گھر سے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے صبح صبح ایک ریستوران، برائے ناشتہ مسافران چولستان کے لیے ڈھونڈ لیا ہے -- آپ کہاں ہیں --"

"-- بھائی کرامت -- میں بہاؤ الدین زکریاؒ کے مزار کے برآمدے میں ہوں -- ایک ملنگ نے میری ٹوپی اپنے سر پر پہن لی تھی -- اس وقت میں اس ٹوپی میں سے، اس کے سر سے چڑھی جوئیں جھاڑ رہا ہوں --!"

"-- ہاہاہا -- میں کنوئیں کے پاس کھڑا ہوں، جو ملے، اس کو کہیں نیچے چوک میں آ جائے، ناشتہ تیار ہو رہا ہے -- آپ جوئیں نکال کر جلدی سے آ جائیں -- ہاہاہا --!!!"

خشک کنوئیں کے پہلو میں کرامت علی کھڑا مل گیا -- وہ کنوئیں میں بڑے ذوق وشوق سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا -- میں نے چپکے سے اچانک اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ڈر گیا اور چونک کر اس نے مجھے دیکھا۔

"--آغا صاحب--اندر پانی وانی تو کوئی بھی نہیں ہے، بس گندی میز، استعمال شدہ مشروبات کی بوتلیں، کوڑا کرکٹ اور کچھ دس، بیس، پچاس کے نوٹ پڑے ہیں۔ان پر بھی پانوں کی پیکیں فراخ دلی سے رنگ ریزی کیے ہوئے ہیں--بھلا اب یہ نوٹ کس کام کے رہ گئے--؟"

"--او--جی چھوڑیں--کرامت بھائی--یہ بتائیں کہ چائے پانی کا انتظام کدھر ہے--صبح سے "چیاس" بڑی شدت سے لگ رہی ہے--جوں جوں چیاس یعنی "چائے کی پیاس" بڑھ رہی ہے، توں توں سردی بھی زوروں کی لگتی ہے--"

"--وہ، اُدھر، پیچھے--گول چکر پر--جس کو گھنٹہ گھر چوک کہتے ہیں، وہاں کہیں ناشتے کا بندوبست خرم شکیب نے کیا ہے--آیئے چلتے ہیں--"

یہ وہی راستہ تھا کہ جس سے ہم اوپر ملتان قلعے کے ٹیلوں پر آئے تھے--صبح تو ملگجا اندھیرا تھا، مگر اب روشنی پوری بہار کے ساتھ پھیل چکی تھی--فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے فقیروں، ملنگوں اور سائیوں نے گرم چادروں اور بوسیدہ میلے کمبلوں سے منہ نکال لیئے تھے--اتنے سارے سیاحوں کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں، چمکنے لگی تھیں--جن کے چمکنے سے لگتا تھا کہ وہ مانگنے والے چاہتے ہیں کہ اللہ کے نام پر اگر کوئی کچھ دینا چاہتا ہے، تو سب کچھ اس کو ہی دے جائے--!

سمجھ نہیں آتا تھا کہ کون مستحق ہے اور کون کاروباری بھکاری ہے--بھکاری عورتوں کی بھی کچھ کمی نہ تھی--ہر کوئی جھولی پھیلائے بیٹھا تھا اور ہر کوئی دینے کا خواہش مند، انتخاب کے شش و پنج میں میری طرح مبتلا تھا--حق داروں کا حق، بے حقوں نے قبضا رکھا تھا--ایسا لگتا تھا کہ اس چوڑی سڑک کے دونوں جانب کے فٹ پاتھ بھکاریوں کے قبضے میں صبح صبح سے ہی آ گئے ہیں--وہ فٹ پاتھوں پر بڑے منظم انداز میں بیٹھے تھے، جیسے اسٹیڈیم کے جنرل انکلوژر میں عوام سیڑھیوں پر بیٹھتی ہے--چونکہ فٹ پاتھ سڑک سے اونچا ہوتا ہے، اس لیے فقیروں اور فقیرنیوں کی پہلی قطار سڑک پر پاؤں رکھے فٹ پاتھ پر بڑے قرینے سلیقے سے براجمان تھی، جب کہ ایسی ہی دوسری جم پیک قطار، فٹ پاتھ کا درمیانی رستہ، حکمت کے تحت چھوڑ کر آخری سرے پر تشریف فرما تھی--عورت فقیرنی مرد فقیر کے پہلو میں اور مرد فقیر، جوان فقیرنی کی بغل میں، بسلسلہ کاروبار جلیبہ بلا کسی حجاب اور اعتراض کے ایک خاندان کی طرح صبر اور تحمل سے بھیک کی آس لگائے فروکش تھے--بچوں والی فقیرنیاں بے تکلفی کے عالم میں اپنی بڑی بڑی سیاہ چھاتیاں نکالے، اپنے نوزائدہ بچوں کو ایسی بے باکی اور بے حجابی سے دودھ پلاتی تھیں کہ گھن آتی

تھی--مردیا مردوں کی کوئی ٹولی پاس سے گذرتی تو اکثر درشن، عالم حجاب سے بے حجاب میں کچھ اس طرح آتے کہ جیسے بے خیالی میں اُن کی چادر یا بوسیدہ دوپٹہ یونہی کھسک گیا ہے، مگر یقین مانیے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا--سب معلوم تھا مگر کچھ معلوم نہیں تھا--!!!

حضرت شاہ رکن عالمؒ کی قلعے نما دیوار کے نیچے سڑک کی گرل کے عین پیچھے بیٹھا شخص چھابوں میں باجرہ بیچ رہا تھا اور اس کی پشت پر گھاس میں بیٹھے کبوتر آس اور امید کہ ساتھ اس کے لیے گاہک کی دعا میں مصروف تھے کہ کوئی تخی آئے، باجرہ خریدے اور ہمارے رزق کو کشادہ کردے کہ ہم صبح صبح حضرت شاہ رکن عالم کی دیوار کے عین نیچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں--!

چائے اور ناشتے کی بھوک سے تو ہم بھی بلبلا رہے تھے--ملتان کی خنک سردی گرم لباس کو چیر کر ہڈیوں میں تیز ہوا کے ساتھ بدن میں گھس جاتی تھی، جس کو پکڑ کر باہر نکالنا بھی، جنوں کی طرح ممکن نہیں تھا--!

سڑک کے آخری کونے پر خرم شکیب سے ملاقات ہوئی--بے چارے کچھ پریشان حال سے لگ رہے تھے--پوچھا--کیا ہوا--تو کہنے لگے کہ چوک گھنٹہ گھر کی ہر گلی، ہر کوچہ چھان مارا ہے کہ ناشتے کے لیے کوئی مناسب سا ریسٹوران مل سکے--مگر نہیں ملا--کیا کروں ہر ایک سے شرمندہ ہوں اور ہوں گا--کچھ نہ کچھ تو زہر مار کرنا اور کرانا ہی ہے--بس یہ چوک کے پار، پھولوں والوں کی دکانوں اور تھڑوں کے پس منظر میں ایک ناشائستہ اور ناہنجار قسم کا ریسٹوران مل سکا ہے--مجھے یقین ہے کہ ہر کوئی اس کی حالت اور غلاظت دیکھ کر منہ بنائے گا--وہ سچا ہو گا اور میں شرمندہ ہوں گا--مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے--آج میری اور ہماری کمپنی کی وہ درگت بنی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اپنی عزت بچانی مشکل ہو جائے۔بس آپ درگذر کر دیجئے گا۔آگے چل کر اس شرمندگی کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا--"

خرم شکیب نے ریسٹوران میں داخلے سے قبل ہی اتنی معذرتیں اور اظہار ندامت کر دیا تھا کہ مزید کہانی سنانے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی--اصل میں یہ ملتان کا قدیمی علاقہ اور بازاروں کا سنگم اور ملتان کے بازار حُسن حرم گیٹ کا ماتھا تھا کہ یہاں کسی پُر شکوہ ریسٹورانٹ کی امید کی ہی نہیں جا سکتی تھی اور جس طبقے کے لوگوں کا اس علاقے میں آنا جانا تھا، ان کو دوکان یا ریسٹوران کی صفائی، نفاست اور خوبصورتی سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی--ان کو تو کسی بھی غلیظ میز پر بٹھا کر بس پیٹ پوجا کرا دو تو وہ مطمئن اور خوش ہو جاتے تھے--ہم لوگ ذرا اچھی توقعات کے ساتھ زندگی گذارنے اور کھانے پینے کے عادی تھے، اس لیے ہمیں یہاں ہر قسم کی دقت محسوس ہو رہی تھی--جو لوگ کچی

زمینوں اور صفائی ستھرائی سے مبرا ہو کر، بے ہاتھ دھوئے کھانا کھانے کے عادی ہوں، ان کے لیے اس قسم کے ریسٹوران نعمت غیر مترقبہ کا عظیم درجہ رکھتے تھے اور یہاں اور قرب و جوار میں یہی طبقہ تھا--سو ان کے لیے ہر شے بہترین اور لاجواب تھی--ہم لوگ ذرا نخرے باز اور نفیس طبع تھے اس لیے یہاں کے جراثیموں اور بلی کے بلونگڑوں کے قد کاٹھ کے برابر چوہوں سے بلاوجہ ڈرتے اور گھبراتے تھے--جب کہ وہ لوگ ان صحت مند چوہوں کو بلیوں کے آوارہ بچے سمجھ کر پوچ پوچ کرتے اور چچڑی ہوئی ہڈیاں اتنی عقیدت سے ڈالتے تھے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے تھے--!

اس ریسٹوران کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ باہر سڑک پر بھی ایک فلیکس آویزاں تھا اور اندر بھی ہر دیوار پر اسی عبارت کے فلیکس لگے تھے، جن پر جلی حروف سے فقط اتنا لکھا تھا۔

"--ہم صحت مند بکرے ذبح کرتے ہیں، گوشت کا ذائقہ خود گارنٹی دے گا--"

اب کون اس عقل مند کو بتائے کہ پورے ملک میں صحت مند بکرے ہی پکڑ کر ذبح کرنے کا رجحان ہے--!!!

باب ۶

ملتان سے بہاولپور
بہاولپوری نوابوں کی پاکستان سے محبت کا المیہ

سردیوں میں فروری کے وسط کے دن تھے، مگر تمازتِ آفتاب، فروری کا احترام اور لحاظ کیے بغیر، کوچ کے اندرونی موسم کو تیزی کے ساتھ اپنی بے رحم لپیٹ میں لینے پر تلی ہوئی تھی --- ملتان کہ جس کی گرمی کے بارے میں کسی صاحب ذوق، دل جلے اور ظریف نے کئی صدیوں سے یونہی اڑا رکھا ہے کہ گرمی کی شدتوں کا مزا لینا ہو تو ملتان کی گرمی کا چکھیے ---!

اور اگر اس قدیمی محاورے کا لطف، سر سے پیر تک لینا ہو تو ملتان شریف میں لیجئے۔ محاورہ یوں مشہور، زبان زد عام ہے کہ گرد، گرما، گدا اور گورستان، ایں است ملتان۔ اس کا آسان اور سلیس ترجمہ نئی نسل کو بتانا اس لیے ضروری ہے کہ اگر نہ بتایا تو لوگ کہنے لگیں گے کہ آغا صاحب نے ہمیں دھوکہ دیا ہے کہ انھوں نے تو کہا تھا کہ یہ سفر نامہ تو اردو زبان میں لکھا ہے مگر جب پڑھا تو لگا کہ اردو سے ملتی جلتی کسی دوسری زبان میں لکھا گیا ہے --- سو ترجمہ کچھ یوں ہے کہ بھائی صاحب اگر دھول، مٹی، شدید گرمی اور مانگنے والے فقیروں، بھکاریوں اور عیسائیوں کے قبرستان کی ویرانی کا منظر دیکھو تو فوراً سمجھ جاؤ کہ یہی جگہ ملتان شریف ہے ---!

مگر اس بارے میں میرے خیالات اور تجربہ ذرا مختلف ہے-- میرا سب سے پہلا مطالبہ سرکار سے نہایت ادب کے ساتھ یہی ہے کہ اس محاورے میں گورستان کا لفظ ہٹا کر قبرستان کر دیا جائے کہ جو حالات میں قلعہ ملتان میں دیکھ آیا ہوں، وہ گورستان کی بجائے قبرستان پر زیادہ منطبق نظر آتے ہیں-- باقی دیگر حالات بدستور وہی قدیمی اور جوں کے توں ہیں--!

مزید یہ کہ میں یہ بھی کہنے کی جسارت کروں گا کہ حقیر فقیر کا تجربہ شاہد ہے کہ اگر، گرد، گرما، گدا کا مزا لینا ہو تو رائے کوٹ، شاہراہ ریشم پر لیجئے-- ہاں البتہ گورستان والا تجربہ مجھے ابھی تک وہاں نہیں ہوا ہے--!

دو سال پہلے اگست کا مہینہ تھا۔ میں اور وجدان فیری میڈوز کی طرف بہ راستہ شاہراہ ریشم رواں دواں تھے-- جب چلاس میں صبح کے نو بجے تو بے اختیار ملتان کی گرمی اور اس کا محاورہ یاد آیا-- مگر جب دن کے گیارہ بجے رائے کوٹ میں ہم شنگریلا کے لان میں برسر دھوپ کھڑے تھے تو لگتا تھا کہ دو ملتانوں کی گرمی میں زندہ بھن رہے ہیں--!

ان حالات کو دیکھ کر لگا تھا کہ چولستان میں تو گرمی کے وارے نیارے ہوں گے۔ مگر ابھی صحرائے چولستان کے بارے میں فقط اتنا کہا جا سکتا تھا کہ ہنوز دلی دور است-- ترجمہ اس مشکل ترین عبارت کا آسان لفظوں میں یہ تھا کہ ابھی چولستان بہت دور ہے--!

ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب یہ پوچھ لیں کہ کیا اردو میں دلی کو چولستان کہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ اگر دور ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں-- ہاہاہا--!!!

ابھی تو دن کے ساڑھے بارہ کا وقت تھا-- بہاولپور میں جو سورج کی تپش نے آگ سی لگا رکھی تھی، اس کو کوچ کے اے سی نے کچھ ذرا سا بجھا دیا تھا۔

بہاولپور شہر میں فرید گیٹ کے سامنے سے گذرے تو عورتیں، لڑکیاں تو تڑپ گئیں۔ ان کا دبے لفظوں میں مطالبہ یہ تھا کہ یہاں کچھ دیر کو گاڑی روک کر ہمیں شوپنگ کرنے کی آزادی دی جائے اور اس آزادی کا مطلب بعد میں یہ نکلنا تھا کہ سیر کی بربادی-- چونکہ خرم شکیب بھی جانتے تھے کہ اس دل بستگی کا مطلب پروگرام ''تل پٹ'' تھا۔ سو وہ سوتے اور اونگھتے بن گئے، جیسے سنا ہی نہیں-- میں بھی ہوتا تو یہی کرتا-- وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ یہ بازار بہاولپور میں ایک کشادہ اور طویل ترین بازار ہے اور مشہور ہے کہ یہاں بہاولپوری، ملتانی اور چولستانی کڑھائی کے بہترین لباس مناسب ترین داموں پر ملتے ہیں۔ اس لیے قوی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ جو خاتون، بھاری پرس کے

ساتھ اس بازار میں ایک بار چلی گئی، سوختانتوں سے ہی واپس باہر آئے گی--اگر ایسا نازنخرہ اٹھالیا جاتا تو تاں نور محل کا دیدار ہوتا، نہ دوپہر کا کھانا ملتا اور نہ ہی مقررہ وقت پر ہوٹل میں قیام کے لیے پہنچ سکتے--وہ سب مل کر بہت چلائیں--مگر کوئی جواب، خاطر خواہ نہ پا کر بلک بلک کر روئیں اور پھر چپ ہو گئیں--!

قائد اعظم میڈیکل کالج، بہاولپور کی زیارت بھی چلتے چلتے ہوئی--وجدان اس کالج کو دیکھ کر بہت خوش اور پُر بہار ہوا--اس کو مدت سے بہاولپور میڈیکل کالج کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو تھی--اس کے بہت سے ڈاکٹرز دوست یہاں کے پڑھے ہوئے تھے؛ اس نسبت سے وجدان کی قائد اعظم میڈیکل کالج بہاول پور سے روحانی وابستگی تھی۔

کسی زمانے میں بہاولپور ایک پُر شکوہ اور وسیع ریاست تھی--گویا دوسرے لفظوں میں یہ ایک خود مختار ملک تھا کہ جس پر نوابین حکومت کرتے تھے--قدیم ترین دور میں بہاول پور ریاست و مملکت کا ایک بہت بڑا حصہ جنگلات سے ڈھکا ہوا آراستہ تھا--ان جنگلوں میں بھیڑیے، جنگلی سور، گیدڑ اور تیندوے بھی ہوتے تھے۔ زہریلے اور عام قسم کے سانپوں کی یہ بڑی آماج گاہ تھی۔ علاوہ ازیں، جنگلی بھینسے، ہرن، سیاہ ہرن، تیتر، بٹیر اور سنہری جنگلی مرغ یہاں کثرت سے جنگلوں میں پایا جاتا تھا۔ پرندوں میں طرح طرح کے کبوتر اور طوطے عام ہوتے تھے۔ مُوروں کی عام اور نایاب واعلیٰ اقسام یہاں کے جنگلوں میں دیکھنے کو ملتی تھیں--مشہور بات ہے کہ صرف ایک صدی پہلے تک یہاں کے باشندے نیزوں، تیر کمانوں اور بھالوں سے جانوروں پرندوں کا شکار کیا کرتے تھے۔

ان زمانوں میں بہاول پور شہر میں دستکاری کا کاروبار بہت زیادہ تھا۔ بارود بنانا، نیل سازی کرنا یہاں کے امیرانہ پیشے تھے۔ یہاں پر ریشمی سلک بنانے کے کارخانے گھریلو صنعت کے طور پر تھے--غریب لوگ غریبانہ کاروبار کرتے تھے، جن میں چٹائی بنانا، مختلف طرح کے درختوں کی چھال اور ٹہنیوں سے طرح طرح کی ٹوکریاں اور چھابے بناتے تھے جو پورے ہندوستان میں دُور دُور تک مقبول تھے۔ مٹی کے برتن یہاں کی بعض جگہوں کی مخصوص مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ جن میں کاغذی مٹی کے پیالے، سکورے، گلاس اور رکابیاں قابلِ ذکر ہیں۔ ان رکابیوں اور پیالوں میں غذا رکھ کر کھانے سے حکیم لوگ شفا حاصل کیا کرتے تھے۔ کپڑا بننا، قالین سازی، کپڑے کی رنگائی چھپائی، پیتل اور تانبے پر نقشین کام، لکڑی پر کارونگ یہاں کے مشہور قدیم اور عمومی پیشے تھے۔ بہاولپوری لنگی دھوتی، گھریلو عورتوں کی کڑھائی، بہاول پوری کھسے گھریلو دستکاری شمار ہوتے تھے۔

بدھا کے عروج کے زمانے میں یہاں ریاست بہاول پور میں کشن خاندان کی حکومت تھی۔ اسی زمانے

میں یہاں دریائے ہاکڑہ کے کنارے پر ایک بہت بڑا بدھ مندر ہوا کرتا تھا۔

۱۳۸۰ سال پہلے بہاول پور "بیچ پور" کہلاتا تھا -- یہ علاقہ مدتوں عرب حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔

۱۹۲۰ء میں ایک مشہور سیاح اور مورخ ابن حوقل اس علاقے سے گذرا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ یہ خطہ (ملتان اور بہاولپور) بہت زرخیز ہے، یہاں پر ہر طرح کی اشیائے ضرورت دوسری آبادیوں، شہروں اور ملکوں کی نسبت بہت کم قیمت پر مل جاتی ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ یہاں کے مقامی باشندے، عراق والوں کی طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ اس علاقے میں سندھی اور عربی زبان عام بولی جاتی ہے -- جب کہ آج کل یہاں کی سب سے مقبول زبان سرائیکی ہے مگر اردو اور پنجابی بھی عام بولی جاتی ہے۔ چولستان کے صحرا میں، میں ایک شتربان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ عجیب سی ملغوبہ زبان بولتا تھا -- مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ تم یہ کونسی زبان بولتے ہو تو اس نے ہنس کے بتایا "کھچڑی" -- وہ کون سی زبان ہوتی ہے بھائی -- میں نے یہ طور نام زبان، یہ پہلی بار سنا ہے تو اس نے بتایا کہ اس بولی میں سرائیکی، پنجابی، اردو، سندھی اور عربی کے علاوہ سنسکرت کے لفظ بھی شامل ہیں -- میں حیران رہ گیا -- سنسکرت کی بھاشا کا عقدہ بعد میں کھلا کہ ۹۸۵ء میں فرقہ ملاحدہ کے لوگ عراق، بحرین اور الحسہ سے راہ فرار اختیار کر کے آئے اور یہاں بس گئے۔ ان ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ صوفی سنت انسانوں میں خدا حلول کر جاتا ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر ان لوگوں کو وہاں سے نکالا گیا تھا اور انہی کے آنے سے سنسکرت کے الفاظ یہاں کی مقامی زبان میں شامل ہوئے تھے، جو ابھی تک زبان زدعام ہو کر چلے آتے ہیں اور چولستان میں عام بولے جاتے ہیں۔

بہاولپور کا ذکر ہو اور بہاولپور میں ڈھائی سو سالہ عباسی نوابوں کے آخری اور ہمیشہ یاد رکھے جانے والے نواب سر صادق محمد خان خامس عباسی کا ذکر نہ ہو -- یہ کیسے ممکن ہے -- وہ محسن پاکستان تھے۔ وہ قائداعظم کے دست راست اور پاکستان کی نوزائدہ ریاست کو معاشی اور اخلاقی طور پر مضبوط کرنے والی اہم ترین مخلص شخصیت تھے -- سچ جانیے کہ میرا دل نہیں چاہتا کہ میں بہاولپور کی سرزمین سے گذروں اور ان کی خدمات کا ذکر نہ کروں -- میں بہاول پور کے شہر سے گذروں اور ان کے لیے فاتحہ نہ پڑھوں اور میں ان کے شہر سے گذروں اور ان کی خدمات کا ذکر نہ کروں جو پیارے پاکستان کے لیے ان کی ہیں۔

تاریخ پاکستان اور بہاولپور میں ان کا نام جلی اور سنہرے حروف سے ہز ہائی نس نواب الحاج سر صادق محمد خان خامس عباسی درج ہے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۰۴ء کو بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ جب وہ تین برس کے تھے تو ان کے والد

امیر بہاول خان کا ملک عدن میں اچانک انتقال ہو گیا اور فوراً خبر پہنچتے ہی سر صادق محمد خان کو امیر بہاول پور مقرر کر دیا گیا -- لارڈ کرزن نے خود بہاولپور آ کر ان کے امیر بہاول پور ہونے کا سرکاری طور پر مصدقہ اعلان کیا اور اس کو سرکاری دستاویزات میں درج کیا اور ایک عارضی نظامت ریاست کا نظام چلانے کو قائم کر دی۔

۱۹۱۳ء میں سر صادق ابتدائی تعلیم کے لیے جنوبی انگلستان میں لاک کے مقام پر اسکول میں پڑھنے گئے -- گریجوایشن مکمل کر کے پاکستان آئے اور سنٹرل انڈیا ہاؤس کوئٹہ میں داخل ہوئے اور فوجی تربیت مکمل کی -- ۱۹۲۲ء میں نوجوان امیر صادق محمد خان کو پرنس آف ویلز کا اے، ڈی، سی مقرر کر دیا گیا -- پھر ۱۹۲۴ء میں ہی گورنر جنرل وائسرائے ہندوستان لارڈ ریڈنگ خود بہاول پور آئے اور امیر صادق محمد خان کی بطور نواب بہاول پور تاج پوشی کی سرکاری رسم ادا کی اور ان کو ہز ہائی نس کے خطاب سے نوازا --!

اس زمانے میں (۱۹۳۷ء) برصغیر میں تقریباً چھ سو ریاستی حکمران موجود تھے۔ اسی سال انگلستان کے بادشاہ جارج ششم کی تاج پوشی کی تقریب میں جن چھ ریاستی حکمرانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی، ان میں ہز ہائی نس نواب صادق محمد خان شامل تھے۔ جو صادق نسل میں پانچویں اور آخری صادق محمد خان تھے۔

وہ اپنی رعایا کا بھرپور خیال رکھتے تھے کہ ریاست کے لوگ ان کی صحت و سلامتی کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ وہ لوگوں اور ریاست کی فلاح پر جو پیسہ خرچ کرتے تھے، وہ اپنی ذاتی جیب اور آمدنی سے کرتے تھے، تاکہ دوسرے حکمرانوں کی طرح کہ لوگوں اور رعایا پر پیسہ خزانہ سرکار سے خرچ کریں اور ڈھول اپنے نام کے ریاست میں بجوائیں --!!!

۱۴- اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آیا تو سوال پیدا ہوا کہ ریاست بہاول پور کے عوام اور ایوان مملکت کس کے ساتھ شامل ہوں گے -- انڈیا یا پاکستان --؟ -- اس وقت ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم نواب مشتاق احمد گرمانی تھے -- انہوں نے مشورہ دیا کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے کر دیا جائے -- نواب صادق نے کہا، کسی ایک کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا -- عوام سے فیصلہ لیا جائے۔ کسی نے نواب گرمانی کی طرف سے دو خطوط بطور ثبوت پیش کیے کہ دیکھیں گرمانی صاحب نے ہندوستان میں سردار پٹیل کو اپنی تحریر میں لکھا ہے کہ بہاولپور ریاست کو ہندوستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیے -- پھر پتہ چلا کہ یہ دو خطوط "ٹائمز آف کراچی" میں صحافی زیڈ، اے سلہری نے پرموٹ کیے تھے۔ نواب گرمانی نے اعلیٰ عدالت سے رجوع کیا -- جب یہ خطوط نواب صادق صاحب کو دکھائے گئے تو انہوں نے ان کو اور دستخط کو بغور دیکھا اور تصدیق کی کہ خط اور دستخط جعلی ہیں --!

۱۳- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نواب صادق اور حکومت پاکستان کی طرف سے ایک معاہدہ، بہاول پور کی ریاست کے مستقبل کے لیے طے پایا-- جس پر حکومت پاکستان کی طرف سے دستخط خود قائد اعظم نے کیے۔ اس معاہدے کی اہم ترین شق یہ تھی کہ نواب صادق کے باڈی گارڈ کے علاوہ پورے بہاول پور کی ریاستی فوج، اب پاکستان کی فوج ہو گی۔ اس ذیلی معاہدے پر نواب صادق محمد خان اور گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین نے دستخط کیے۔

نواب صاحب ہز ہائی نس سر صادق محمد خان نے قائد اعظم کو ایک انتہائی اہم خط بھیجا-- نواب صاحب نے یہ خط اس وقت لکھا کہ جب اس بات کا شک پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان نہ بن سکے۔ تب نواب صادق نے قائد اعظم کو لکھا کہ اگر خدانخواستہ پاکستان بننے میں بڑی رکاوٹیں آ جائیں اور پاکستان کا قیام کسی بھی سمت سے نظر نہ آتا ہو تو آپ ریاست بہاول پور پر پاکستان کا جھنڈا لہرا کر قیام پاکستان کا اعلان کر دیں اور پاکستان قائم کر دیں--!

سر صادق محمد خان کے بیٹے پرنس قمر الزماں عباسی نے جون ۲۰۰۹ء میں ایک مضمون ماہنامہ ''عباسی'' میں لکھا-- جس کی چند سطریں میں ضرور نقل کرنا چاہوں گا کہ جس سے اندازہ ہو گا کہ اس محسن پاکستان خاندان کے ساتھ، پاکستانیوں نے پھر کیا سلوک کیا-- اُن ہی کی زبانی سنیے:

''--نواب سر صادق محمد خان عباسی مرحوم کے ملک و قوم پر اتنے احسانات ہوں گے کہ اگر میں اُن کی تفصیل میں جانا چاہوں تو گہرائی اتنی ہو گی کہ میرے اس قلم کے ڈوب جانے کا خطرہ ہے-- لیکن افسوس کہ حکومت میں ان کے سیاسی جانشین ۴۰ برس سے لے کر آج تک، ان کا نام لے کر عوام سے ووٹوں کی بھیک مانگ کر تو اپنی جھولیاں بھر لیتے ہیں-- جب کہ آج صادق پیلس لٹ چکا ہے۔ اس کی عظمت ماند پڑ چکی ہے۔ ایک کمزور، بے جان اور بے سہارا بوسیدہ عمارت اپنی زندگی کے آخری ایام گذار رہی ہے-- آج امیر بہاول پور کی ذاتی ملکیت زمین، بہاول پور کا چپہ چپہ غیر قانونی طور پر فروخت ہو چکا ہے--''

احسان فراموشی اور محسن کشی کی اس سے عمدہ عوامی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ وہی سر صادق محمد ہیں کہ جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم کے ایک پیغام پر اپنا تن، من، دھن، سب کچھ خوش دلی سے خرچ کر دیا کہ اُن کے اس خرچ سے پاکستان کی اقتصادی بنیادوں کو سہارا ملا-- قائد اعظم نے پیغام دیا کہ پاکستان بن گیا ہے مگر پہلے ہی ماہ حکومت کے پاس سرکاری ملازمین کو تنخواہیں دینے کے لیے کوئی رقم نہیں ہے۔ نواب صادق نے اپنی ذاتی جیب اور بہاولپور کے اپنے خزانے سے گیارہ کروڑ روپے کی رقم قائد اعظم کو بھیجی اور ساتھ میں کہلا بھیجا کہ اگر اور

ہوتے تو وہ بھی پیش خدمت کر دیتا--نواب صادق نے (۱۹۰۴ء تا ۱۹۶۶ء) قائداعظم کے کراچی پہنچتے ہی ملیر میں اپنا محل ''الشمس محل'' خالی کر کے جناح کے سپرد کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جب قائد، کراچی پہنچے تو ان کے پاس کوئی کار نہیں تھی--نواب صادق نے اپنے محل الشمس میں کھڑی اپنی ذاتی کار بھی قائداعظم کو سفر کے لیے تحفے میں بھجوا دی--ایسے خاندان کے ساتھ بعد میں قوم نے کیا سلوک کیا، آپ پرنس قمرالزماں عباسی کے مضمون میں ملاحظہ فرما ہی چکے ہیں۔

میری اس بات کے ثبوت میں اگر آپ چاہیں تو معروف ادیب میرے دوست اور موجودہ دور کے ایک بڑے افسانہ نگار ڈاکٹر غافر شہزاد کا مشہور افسانہ ''ستون کے اسیر'' پڑھ سکتے ہیں (بحوالہ۔ حلقہ ارباب ذوق، منتخب تحریریں ۱۵-۲۰۱۳ء--مطبوعہ الفیصل لاہور--صفحہ نمبر ۲۵۵)--انہوں نے اس افسانوی کہانی میں اس المیے کو بطور افسرِ اوقاف خود تحقیق کیا اور اتنے دکھی ہوئے کہ پوری داستان، افسانے کی شکل میں لکھ دی--غافر شہزاد کی یہ کہانی عہد جدید کا دکھی کر دینے والا حقیقی المیہ ہے۔

باب ۷

غلام فریدا، اُوتھے چاہ نہ رکھیں
جتھے ناہیں عشق دا ڈیرا ۔۔!

میڈا عشق وی توں، میڈا یار وی توں
میتوں ہس کے یار مناون دے
عشق تے آتش ذو ویں برابر
آتش پانی نال بجھے دی، تے عشق دا دارو کیڑا

ساتوں تے لگ گئی بے اختیاری
سینے دے وچ نہ سمائی اے
غلام فریدا، اُوتھے چاہ نہ رکھیں
جتھے ناہیں عشق دا ڈیرا

میں چولستان کی سرزمین کے ایک کنارے پر کھڑا ہوں، جہاں محبتوں کے پھول کھلا کرتے تھے--تاریخ کو جہاں سے اٹھا کر دیکھو، کسی کا حق مارنے، ظلم کرنے اور غصب کرنے کی کوئی داستان رقم نہیں ہے--!

ہم نور محل کی طرف جارہے ہیں--سنا ہے کہ بہت حسین عمارت ہے--جب اس کو قریب سے دیکھوں گا تو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی حسین ہے اور کیونکر حسین ہے--!

ابھی تو خواجہ غلام فرید چشتی نظامیؒ کی شاعری اور صوفیت کے سحر میں گرفتار ہوں۔ عشق اور آگ دونوں ہی برابری کا درجہ رکھتے ہیں، ہاں مگر آگ پر پانی ڈالو تو بڑی آسانی سے بجھ جاتی ہے مگر، اگر عشق ہو جائے تو اس مرض کی دوا کیا ہوا کرتی ہے، یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اگر معلوم ہے تو بتادو--بڑی نیکی ہوگی، کئی مریض ٹھیک ہو جائیں گے--اس کے باوجود یہ فقیر غلام فرید بہت ہی عجیب آدمی ہے کہ صرف اسی سے عشق کرتا ہے کہ جہاں چاہ اور محبت ہوتی ہے--گویا اسے عشق سے چاہ ہے اور چاہ سے عشق ہے--!

خواجہ غلام فریدؒ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۰۱ء) کی بڑی دوستی نواب صادق محمد خان کے دادا سے تھی۔ بہاولپوری نوابین کی پوری لڑی، نسل در نسل خداترس، دیانت دار اور تہذیب یافتہ تھی--نواب صادق چہارم خواجہ غلام فریدؒ کے محبوں میں تھے، اور ان سے روحانی پیشوائی لیتے تھے۔

نواب صادق محمد خان چہارم انتہائی مخلص، بے لوث اور سادہ دل انسان تھے--صاف گو تھے، اس لیے وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا مخلص سمجھتے تھے، اس سے اکثر لوگ فائدہ بھی اٹھاتے تھے--!

قصہ یہ ہوا کہ ایک انگریز گوری حسینہ ان پر عاشق ہوگئی--کہتے ہیں کہ وہ نوجوان انگریز لڑکی کوئی ۲۲/۲۳ سال کی تھی۔ نیلی آنکھیں، دودھ جیسی رنگت، گلاب جیسے گال، سرخ انگارہ ہونٹ، لمبے سنہری بال، سرو قد اور سب سے بڑی دولت اس کے پاس یہ تھی کہ اس کی مسکراہٹ لازوال قسم کی تھی--پانی بھی مانگتی تو مسکرا کر مانگتی--شباب اور مستی اس کے بھرپور جسم کے انگ انگ سے خواہ مخواہ پھوٹتی تھی--

وہ نواب صاحب کے والد گرامی پر مرمٹی--اس نے اپنی محبت کا ایسا جال نواب صاحب پر پھینکا کہ جال کا ہر خانہ نواب صاحب کو اپنی گرفت میں لے بیٹھا--اُوپر سے اس کے حسن و جمال نے رہی سہی کسر پوری کر دی--جو نواب صاحب کہتے، وہ تسلیم و رضا کا پیکر بن کر من وعن سر تسلیم خم کرتی تھی--دن ہو رات، وقت ہو یا بے وقت، کبھی ناں، نہ کرتی تھی--اس کی اس تابعداری اور محبت کی بے پایاں لہروں کے بھرپور اچھال میں نواب صادق چہارم خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے--اس نے نواب صاحب کے معصوم اور پاکیزہ دل کو موہ لیا--یہی تو وہ چاہتی

تھی، سو کامیاب ہو گئی--!

نواب صاحب اس گوری کی بظاہر پُر خلوص محبت کے اسیر ہو گئے اور انھوں نے اس سے شادی کر لی--ایک رات جب نواب صاحب گوری حسینہ کے تیرِ حسن کا شکار تھے اور حسینہ کو محسوس ہوا کہ نواب صاحب اس کی محبت میں بے بس ہو چکے ہیں تو اس نے نواب صاحب پر وہ حملہ کیا کہ جس کے لیے اس نے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے--!

کہنے لگی کہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی ہوں کہ میں نے آپ پر اپنا حسن، جوانی اور حسین کنوارہ جسم نچھاور کر دیا ہے--اب کیسے پتہ چلے کہ آپ بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں--نواب صاحب نے پوچھا، تم ہی بتاؤ کہ تمہارا دل راضی ہو جائے اور تم کو میری محبت کا یقین آ جائے--!

تو کہنے لگی کہ آپ اگر مجھ سے، اپنی تمام بیگمات سے زیادہ محبت کرتے ہیں تو سرکاری کاغذ پر لکھ دیجئے کہ میں نے تم کو تمہاری محبت کے بے لوث صلے میں ریاست بہاولپور لکھ دی--پھر جب نواب صاحب کی تیوریاں بدلتے دیکھیں تو فٹ بولی کہ میں اس تحریر کو فقط اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گی--میرا ہرگز مطلب نہیں کہ یہ دستاویز میں کبھی مرتے دم تک منظرِ عام پر لاؤں گی--کسی کو نہیں دکھاؤں گی--یہ بس میری ذات کے لیے آپ کی انمول محبت کا مکمل ثبوت ہوگا۔

پھر اُس نے کچھ اس طرح نواب صاحب کا دل لبھایا کہ حضرت نواب اس کے شیشے میں اتر گئے--کچھ اس انداز سے پیار اجتایا کہ نواب صاحب بے بس ہو گئے--صبح ہی منشی کو بلایا اور سرکاری کاغذ پر حسینہ بیوی کے حسب منشا تمام بہاولپور کی ریاست اُس کے نام لکھ دی--نواب صاحب کی محلاتی کنیزیں بتاتی ہیں کہ تحریر پا کر اس قاتل ادا گوری حسینہ بیوی نے نواب صاحب کو سب کے سامنے انگریزی دستور کے مطابق چوما چاٹا اور جب تحریر پر نواب صاحب کے دستخط ہو گئے تو بڑی ادائے دلبری سے لپیٹ کر اپنی انگیا میں یہ کہہ کر رکھ لیا کہ اس محبت کے نوشتے کو تو میں الماری کی بجائے اپنی سینے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی--!

اس قاتل ادا زوجہ نے تحریر لکھوانے کے بعد بھی نواب صاحب کے لیے اپنی محبت اور اظہار الفت میں کوئی کمی نہ آنے دی--دن رات اس طرح واری نثار رہتی کہ نواب صاحب کے دل و دماغ میں اس بات کا شائبہ بھی نہ آ سکا کہ انھوں نے کیا حماقت کر دی ہے--نواب صاحب یوں بھی مطمئن تھے کہ ریاست کے قانون کے مطابق جو بھی دستاویز، قانون یا تحریری حکم نامہ نواب بہاولپور ریاست کے بارے میں بطور حکم تحریر کرتے تھے، وہ

مصدقہ دستاویز اس وقت قرار پاتی تھی کہ جب اس کو انگلستان میں وائسرائے کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ وائسرائے اس پر مہر تصدیق لگاتے اور اندراج رجسٹرار کرا کے واپس بھیجتے تھے، تب وہ مصدقہ شمار ہوتی تھی -- چونکہ یہ دستاویز، وائسرائے سے مصدقہ نہیں تھی، اس لیے نواب صاحب ہر طرح سے مطمئن تھے۔

مگر ایک روز، نواب صاحب کے خادم خاص نے نواب صادق محمد خان چہارم کو اطلاع دی، جو انتہائی معتبر اور خفیہ تھی کہ بیگم صاحبہ نے وہ تحریر اپنے ذاتی ذرائع سے تصدیق کے لیے انگلستان وائسرائے کو بھجوادی ہے -- اب نواب صاحب کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا اور ریاست بہاولپور، اپنے ہاتھ سے انگریزی حسینہ کے ہاتھ جاتی نظر آئی --

اس خبر نے نواب صاحب کے دل و دماغ میں اس حسینہ، چال باز بیوی کی چالاکی، عیاری اور مکاری کا پول کھول دیا -- اور اس کی ظاہری محبتوں کا مقصد ظاہر کر دیا -- نواب صاحب بہت سٹ پٹائے مگر بے بس تھے، کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے -- دن رات کا چین کھو بیٹھے -- عورت کی مکارانہ محبت اور مسکراہٹ کی عیاری سامنے آ چکی تھی -- نہ کسی کو اپنی حماقت کا قصہ سنا سکتے تھے اور نہ ہی کسی طرح اس کا ازالہ کر سکتے تھے -- سو خاموشی سے اندر ہی اندر سلگتے رہے۔

نواب صاحب اتنے صدمے میں چلے گئے کہ نہ دربار لگاتے، نہ اپنی حرم سرا میں کسی بیوی سے رجوع کرتے، وہ تنہائی کا شکار ہو گئے۔

اچانک ان کو خیال آیا کہ کیوں ناں اپنے روحانی مرشد اور دوست، غم خوار خواجہ غلام فریدؒ سے رجوع کریں -- وہی ایک ایسی ہستی تھے کہ جن کو ساری صورت حال بتائی جا سکتی تھی اور اس کے ازالے کے حل کے لیے درخواست کی جا سکتی تھی -- فوراً اٹھے اور تیز رفتار سواری پر کوٹ مٹھن خواجہ غلام فریدؒ کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ حضور میں اس مکار عورت کے حسن اور چاپلوسی کے دام میں آ کر ریاست اس کو لکھ کر دے چکا ہوں اور اس نے چپکے سے وہ دستاویز وائسرائے کو بھجوادی ہے؛ جوں ہی دستاویز تصدیق ہو کر واپس آئے گی، میرا اور ریاست کا اقتدار بدل جائے گا -- خدا کے لیے کچھ کیجیے --"

خواجہ غلام فریدؒ نے ساری بات غور سے سنی، کچھ دیر عالم استغراق میں غرق رہے اور پھر ایک گہری نظر بھر کر نواب صاحب کے چہرے اور حالت کو دیکھا کہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں -- مسکرائے -- اور فرمایا --

"-- گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے -- کاغذ سفید ہے --"

یہ کہہ کر اٹھے اور خاموشی سے اپنے حجرے میں چلے گئے--!

نواب صاحب نے مرشد خواجہ غلام فریدؒ کے کہے جملے پر غور کیا اور واپس چلے آئے اور انگلستان سے کاغذ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے اور یہ بھی سوچنے لگے کہ جب کاغذ واپس آتا ہے تو مکار حسین بیوی کیا کرتی ہے اور قدرت کیا فیصلہ سناتی ہے--یہ اتنی بڑی حماقت تھی کہ اس کا برملا ذکر کرتے بھی ان کو شرم آتی تھی--سو خاموشی اختیار کی۔

کچھ ہفتوں بعد ان کو اپنے خادم خاص سے اطلاع ملی کہ انگلستان سے وائسرائے کا مہر شدہ لفافہ چہیتی بیگم کو موصول ہو گیا ہے۔

اُدھر بیگم حسینہ بھی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی--صبح ناشتے کے بعد نواب صاحب سے کہنے لگی کہ ایک ضروری خط وائسرائے انگلستان کے سرکاری دفتر سے موصول ہوا ہے، میں اسے آپ کے سامنے کھولنے کی اجازت چاہتی ہوں--نواب صاحب نے کہا ضرور--ضرور--!

اس نے سامنے میز پر بیٹھ کر حسب عادت قاتل مسکراہٹ سے مسکرا کر نواب صاحب کو دیکھا اور سیل بند لفافے کی مہریں توڑ کر جب کاغذ نکالا تو نواب صاحب نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی دائمی مسکراہٹیں، یک دم پھیکی پڑیں، فکر کے آثار ظاہر ہوئے، نیلی آنکھیں بے نوری ہوئیں، گلابی رنگت زرد پڑی، ہاتھ کانپے اور وہ کاغذ اس کے نازک مگر مضبوط ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گرے اور وہ خود غش کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

نواب صاحب نے اٹھ کر وہ کاغذ اٹھائے--کیا دیکھتے ہیں کہ سوائے مہر اطلام کے، باقی تمام کاغذ سفید اور کورا تھا--!

نواب صاحب کو اپنے مرشد پاک حضرت غلام فریدؒ کے لفظ یاد آ گئے--!

"--کاغذ سفید ہے--"

کاغذ یقیناً سفید ہی تھا--کامل مرشد نے ریاست بہاول پور کو بچا لیا تھا اور دوسری طرف نواب صاحب کی عزت اللہ پاک نے رکھ لی تھی۔

اس کے بعد کی داستان بس اتنی مختصر ہے کہ جب انگریزی بیگم کو ہوش آیا تو ایک لفظ نہ بولی؛ اپنے کمرے میں گئی۔تمام گہنے، زیور اتار کر بستر کے سرہانے رکھے، جن کپڑوں میں محل آئی تھی، وہی پہنے اور خادمہ سے کہلا بھیجا کہ نواب صاحب سے کہیں کہ بس، مجھے عزت سے طلاق دے دیں، میں واپس جانا چاہتی ہوں--!

نواب صاحب نے کہلوایا کہ میں نے تمہارے قصور معاف کیے، میں تو تم سے سچی محبت کرتا ہوں اور سارے قصے کو درگذر کرتا ہوں، ہم خوشی خوشی رہیں گے، تم جانے کا ارادہ ترک کردو-- جواب آیا کہ اتنی رُوسیاہی کے بعد یا تو مجھے جانا ہے یا پھر زہر پھانک کر دنیا چھوڑ جانا ہے-- آپ خود فیصلہ کریں کہ مجھے کیا کرنا ہے--!

نواب صاحب نے پیغام دیا کہ جیسے تمہاری مرضی، مگر میں تم کو حالت کفن میں نہیں دیکھنا چاہتا-- تم جا سکتی ہو-- طلاق دے دی اور تمام زیور گہنا، جو اس نے اتار کر بستر پر رکھا تھا، حق محبت میں بخش دیا اور بہت کچھ دے کر عزت سے رخصت کر دیا--

کسی کو پتہ نہ چلا کہ یکایک کیسے کایا پلٹ ہوگئی-- سب حیران رہ گئے-- بہت مدت بعد یہ عقدہ کھلا تو بیگمات اور اہل محل ششدر رہ گئے-- پھر سمجھ میں آیا کہ بابا غلام فریدؒ نے سچ ہی کہا تھا--!

غلام فریدا، اوتھے چاہ نہ رکھیں

جتھے ناہیں عشق دا ڈیرا

باب ۸

محلات کی سرزمین بہاولپور
نور محل، جس کے انگ انگ سے نور جھلکتا ہے

بہاولپور، خاندانِ عباسی کے محلات کی سرزمین ہے۔

کوئی بہاول پور آئے، ٹھہرے یا گذر جائے، وہ کس طرح عباسی، بہاول اور صادق نوابین کے تعمیر کردہ محلات کو در گذر کر سکتا ہے اور جو ایسا کرے تو سمجھو کہ اس میں نہ ہی حسِ لطیف ہے اور نہ ہی ذوقِ سلیم ہے۔

دربار محل، صادق محل، گلزار محل اور نور محل تو انتہائی قابلِ ذکر ہیں۔ گویا روئے زمین پر تعمیر کے نایاب اور حسین و جمیل نگینے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور زبان سے بے اختیار عش عش نکلتا ہے۔

ان چار بڑے، وسیع اور بے مثال محلوں کے علاوہ بھی ان رئیس خانوادوں کے مزید آٹھ محل، نہ صرف تعمیر میں لاجواب ہیں بلکہ کسی نہ کسی تعمیری نسبت سے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں--قدیم محل، مبارک منزل، راحت منزل، حرم سرا، شملہ کوٹھی، عباس منزل، الامان محل اور صادق منزل ان کے ذیلی محلات کے نام ہیں--ان میں سے اکثر آج کے دور میں کسمپرسی کے عالم میں ہیں--کسی ظالم نے کسی حصے پر قبضہ کر کے صورت بدل دی ہے اور بالکل ایسی بدہیئت بدلی ہے کہ جیسی قابض کی اپنی صورت مکروہ اور بدکرداری کا آئینہ ہوتی ہے--بہت سے نایاب تعمیری حصے

بوسیدہ قرار دے کر گرا دیے اور وہاں بھونڈی سی تعمیر کر کے اپنا قبضہ جما لیا-- جھوٹی رجسٹری ملکیتیں گھڑ کے اسلاف کے نام ونشان کو ایسے مجروح اور برباد کیا ہے کہ کسی مجھ جیسے کو بتاؤ کہ یہ محل ہوا کرتا تھا تو وہ یقین نہ کرے-- محلات کے بازار کی سمتوں کے رُخوں کو دکانوں میں تبدیل کر کے محلوں کو روڑی خانے بنا دیا ہے-- بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ تم لوگ ایسی نایاب تعمیر کرنے کے قابل نہیں ہو تو ان حسین نشانیوں کو اس بے دردی سے مٹاتے کیوں ہو-- تو جواب جاہلاں دیتے ہیں کہ گر رہا تھا، ہم نے تو لینٹر ڈال دیا ہے-- کہا، ایسا بدوضع لینٹر کیوں ڈالا، ذرا ڈھنگ سے ڈال لیتے-- تو جواباً ڈھیٹ بن کر کہتے ہیں کہ اور کیا کرتے، بازار میں جو آ گیا ہے، دکان تو بنانی تھی-- پوچھا کہ کیا یہ تمہاری ذاتی جائیداد ہے-- بولے، ہاں نوابوں سے خریدی ہے-- کسی مجھ جیسے نے کہا کہ کیا نواب خدانخواستہ بھکاری ہو گئے تھے کہ انہوں نے یوں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے محلات کو تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا-- بولے، فروخت کیا تو ہم نے خریدا-- کسی باضمیر نے سوال کر دیا کہ نواب صاحب تو فرماتے ہیں کہ انھوں نے تو کبھی اپنی اس منزل کا کوئی حصہ فروخت ہی نہیں کیا-- تو بولے ان کو کیا پتہ، وہ نواب ہیں، ان کے منشی نے بیچا اور ہم نے دام چکا کر خرید لیا-- گویا یہ کہتے ہو کہ خاندانی اور نسلی منشی بے ایمان ہو گئے-- جواب آیا، ہمیں کیا پتہ-- بھائی جھوٹ نہ بولو-- یہ تو اوقاف کی جگہ ہے، بھلا تم کیسے مالک بن بیٹھے-- کہنے لگے، ہمارے پاس پکے کاغذ ہیں، تم کون ہوتے ہو یوں پوچھنے والے-- میں نے کہا کہ میں ایک وطن پرست-- بولے تو پھر جا کر اپنے وطن میں رہو اور اپنے کام سے کام رکھو-- شکل سے بھلے آدمی لگتے ہو، ورنہ ایسا حلیہ بگاڑ کر بھیجتے کہ کبھی ان بازاروں اور مکانوں کے پاس نظر نہ آتے--!!!

--نئی نسل کی آنکھوں کا پانی مر گیا-- ہوس نے احسانات کو بھلا دیا-- تب یہ تو ہونا ہی تھا--!

ہم نور محل کے مرکزی داخلے کے دروازے پر کھڑے ہیں-- چاروں طرف سرسبز و شاداب گھاس، پھولوں اور قطار اندر قطار لگے خوشنما درختوں سے بہار کا سماں ہے-- دُور، بہت دُور-- گلزار درختوں کی زمردیں اُوٹ سے نور محل جھلکیں مار رہا ہے-- جیسے نایاب سفید موتی اور سرخ انگارہ یاقوت کسی جڑاؤ نیکلس میں جڑے ہوں اور اس نیکلس پر جارجٹ کا سبز زمردیں دوپٹہ لہریں مارتا ہو--!

سفیدے کے بلند و بالا، دو رویہ درختوں کی ہریالی چھاؤں میں سڑک مڑی اور ایک وسیع و عریض لوہے کے جالی دار شاہانہ دروازے کے سامنے آ گئی--!

اس شاہانہ دروازے پر فوجی پہرہ تھا۔ جب انچارج صاحب جوان کو بھرپور یقین آ گیا کہ ہم نور محل کے

عشق میں دیوانے سیاح قسم کے معصوم لوگ ہیں اور فقط نور محل کی محبت میں یہاں آئے ہیں تو دروازہ کھول دیا گیا--!

سرمئی سڑک سفیدے کے درختوں کی چھاؤں میں نور محل کی طرف چلی-- دونوں طرف گلاب، موتیے اور رات کی رانی اور دن کے راجہ کے پودے سلیقے قرینے سے لگے نہیں، بلکہ سجے ہوئے تھے۔ جو میدان ان کے پیچھے نظر آتے تھے، عمدہ قسم کی گھاس سے آراستہ حد نگاہ تھے-- گرمی اچھی خاصی تھی، قطعی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ فروری کا وسط ہے بلکہ حلق کی خشکی اور ہوا کی حدت مئی کے مہینے کا سماں باندھے تھی--!

کوچ سے باہر نکلتے ہی گرم کپڑے جو پہنے تھے، جسم کو بے اختیار کاٹنے سے لگے-- مفلر، ٹوپی سویٹر سب نے اتار اتار کر اپنی اپنی سیٹوں پر ڈال دیئے تو چہروں پر سکھ کا احساس نمایاں ہوا--!

کوچ ایک جانب کو مقررہ پارکنگ ایریا کے درختوں کی چھاؤں میں کھڑی کر دی گئی--!

سفیدے کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں ایک بڑی سی میز لگائے، دو تین فوجی جوان اندر جانے کے داخلہ ٹکٹ مبلغ تیس روپے فی سیاح فروخت کر رہے تھے-- یہ ٹکٹ ملکی سیاحوں کے لیے لازمی تھا اور کسی کے لیے معافی نہ تھی-- ہاں فقط اپنی برادری اس ٹکٹ سے مستثنیٰ تھی--!

جس میز پر سے داخلے کے ٹکٹ فروخت کیے جا رہے تھے، اس پر نور محل کے دو طرح کے یادگاری سوینیر بھی اعلیٰ اور عمدہ داموں پر برائے فروخت قرینے سے دائیں بائیں سجے تھے-- ایک چائے یا کافی کا مگ جس پر نور محل کی رات کے وقت بنائی گئی تصویر چھپی ہوئی تھی-- مجھے اور وجدان کو یہ مگ فقط اس لیے پسند آیا کہ یہ نور محل کی نشانی ہے اور نور محل کے سبزہ زار کے کنارے سے خریدی گئی ہے۔ جب کہ تصویر جو اس پر چھپی تھی اتنی حسین نہیں تھی کہ فقط اس کی وجہ سے یہ مگ خریدا جا سکے-- دوسری چیز ایک چابیوں کا کی چین تھا کہ جس کی لکڑی پر نور محل کے سامنے کا خاکہ، خاکے کی شکل میں نقش تھا-- ہم نے فیصلہ کیا کہ ضرور خریدیں گے مگر انشاء اللہ واپسی پر--!

خرم شکیب نے تو ڈرا ہی دیا-- کہنے لگے کہ میرا خیال ہے کہ احاطۂ محل اور اس کے اندر کیمرہ لے جانے کی اجازت نہ ہو-- وجدان نے گھبرا کر ایک فوجی جوان سے پوچھا کہ ہم کیمرہ اندر لے جا سکتے ہیں تو یہ خبر پا کر دل کو ڈھارس پہنچی کہ کیمرہ احاطہ نور محل تک لے جانے اور تصویریں بنانے کی اجازت ہے، مگر کیمرہ اندر لیجانے کا پتہ نہیں ہے، اس کی اجازت محل والے نگران ہی کے اختیار میں ہے--!

نور محل اس داخلے کے مقام سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر تھا--!

جونہی درختوں کا جھرمٹ، نور محل کے چہرے سے ہٹا-- قدم بے اختیار رک گئے--!

وہ واقعی بہت خوبصورت اور لاجواب تھا --!

نور محل کی دائیں بغل اور سامنے کا ماتھا میرے سامنے تھا -- لگتا تھا کہ ایک انمول تعمیراتی نگینہ ہے، جو گھاس کے وسیع و عریض میدان نما قطعات میں کسی موتی اور گہنے کی طرح جڑا ہوا ہے --!

ایک پراسرار طلسماتی اور حسین و جمیل محل، نور محل --!

اس کی ہر سمت اور ہر انگ سے نور جھلکتا تھا --!

خوبصورتی، توازن اور سروقد اونچائی نے محل کے ہر ذرے، محراب، برآمدے اور عالی شان ستونوں میں بانکپن کا حسن و جمال بھر رکھا تھا --!

دن کی روشنی نے اس کے در و دیوار کے انگ انگ میں شباب اور خوبصورتی کو نکھار کر سمو رکھا تھا -- دھوپ میں سردیوں کی نرمی نے روشنی کے انعکاس اور پھیلاؤ میں جو گلابی سردی کا بانکپن بھرا تھا، اس سے نور محل کے شباب اور نزاکتوں کے احساس کا رنگ روپ اپنی بھرپور نزاکت بھری خوبصورتی کے ساتھ نظر آ رہا تھا --!

نور محل کا بیرونی تعمیراتی لباس، سرخ میں سفید اور سفید میں سرخ تھا --!

اس سفیدی اور سرخی کے گرد و نواح میں پھیلا ہوا سبزے کا زمردیں پیش منظر اور پس منظر اس کے طلسم بھرے جمال میں لاجواب تھا --!

میرے دائیں جانب کے گھاس بھرے قطعے میں عجیب چاند ماری کا میدان سجا تھا -- تیر کمانوں کے کشکول بڑے سلیقے سے قطار میں تیروں سے بھرے رکھے تھے اور ان کے ساتھ ہی خوبصورت کمانیں بھی ہینگروں میں ٹنگی تھیں -- ایک بڑے میز پر چادر بچھی تھی، جس پر نشانہ بازی کے لیے اعلیٰ قسم کی ایئر گنز ترتیب سے رکھی تھیں -- سامنے نشانہ بازی کے لیے طرح طرح کے رنگین گول قطعے آویزاں تھے -- بیٹھنے کے لیے عمدہ نواڑی رنگین کرسیاں سلیقے سے بچھی تھیں -- لگتا تھا کہ فوجی افسران کی نشانہ بازی کو جلا بخشنے کے لیے یہ ہمہ وقت اہتمام تھا کہ سلیقہ مندی دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا --!

انتہائی بائیں طرف خوب صورت مارکیز بچی تھیں کہ جیسے شادیوں میں لگائی جاتی ہیں۔

سامنے نور محل کے ایلی ویشن کا میدان خوبصورت گھاس سے آراستہ تھا، جس کے تین جانب اونچے، گھنے، سرسبز اور قدیمی درختوں کی قطاریں اس محل کے لان کی احاطہ بندی کیے ہوئے تھیں -- محل کے پورٹیکو کے بعد ایک کشادہ سڑک تھی اور سڑک سے آگے گراسی لان کا احاطہ شروع ہوتا تھا -- لان میں داخلے کے لیے دو راستے بطور

خوبصورتی اور رکھ رکھاؤ کے بنائے گئے تھے--ورنہ اگر آپ میں اہتمامِ زینت اور رکھ رکھاؤ کا فقدان ہو تو آپ کہیں سے بھی اس لان میں داخل ہو سکتے تھے--اس دوسرے والے طریقے سے فقط وہی لوگ دندناتے ہوئے داخل ہو رہے تھے کہ جنھوں نے کبھی اپنی نسلوں میں محل کا تصور بھی نہیں کیا تھا--یہ وہی لوگ ہیں جو قطار توڑ کر بجلی کے بل جمع کراتے ہیں اور دیواریں پھاند کر باغوں میں داخل ہونے کے پیدائشی طور پر عادی ہیں--ان کو عرفِ عام میں عوام الناس کہتے ہیں، اور تہذیبی اقدار سے نسباً عاری ہیں--!--ان کے نزدیک قانون توڑنا اور نہ توڑنا برابر ہے، جو کسی اخلاقی جرم کے زمرے میں نہیں آتا۔

بیرونی بناوٹ کی اہم ترین اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ تمام عمارت سرخ اینٹوں سے بنائی گئی ہے، جس میں دیواریں اور ان کی اُٹھان شامل ہے، جب کہ تمام تھم اور ہر طرح کے ستون اور گنبد سفید ہیں اور یہ جس قدر بھی سفید حصہ ہے وہ اوپر کی جناب اٹھتا ہوا ہے۔حتیٰ کہ اوپر کے صحن اور چھت کی منڈیریں ان کی جالیوں میں جو آٹھ آٹھ چھوٹے آرائشی ستون جن کو سہارا دینے کے لیے کھڑے کیے گئے ہیں، ان کی شکل شطرنج کے مہرے بادشاہ جیسی ہے، جس کی موجودگی کی وجہ سے عمارت کے تعمیراتی حسن میں بے اختیار ایک پراسرار سی سمٹری نے جنم لیا ہے۔

نور محل کی عمارت بنیادی طور پر مستطیل ہے، جس کی وجہ سے اگر ذرا دور کھڑے ہو کر دیکھیں تو چھت کی خوبصورتی، نیچے زمین سے بھی اپنے حُسن و جمال کے ساتھ محسوس ہوتی ہے--!

پورٹیکو میں تین اونچے درّے ہیں، جب کہ دائیں اور بائیں اونچے برآمدوں میں چار چار درّے ہیں۔ دونوں سامنے کے برآمدوں کے دونوں کناروں پر وسیع و عریض کمرے ہیں کہ جن کے اوپر کی منزل پر بھی ویسے ہی عالی شان کمرے اور ان کی چھتوں پر خاص طرز کے گنبد ہیں--اس طرزِ تعمیر سے عمارت کے حسن میں بے مثال اضافہ ہوا ہے--!

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون کافر ادا ہوگا جو اس عالی شان اور شاہانہ عمارت کو بطور گھر استعمال کرنے سے انکار کر سکتا ہے--شاید کوئی بھی نہیں ہوگا--مگر نہیں--کیا ایسے نخرے والے بھی ہوا کرتے ہیں--میں سوچ بھی نہیں سکتا--!!!

مجھے نور محل کی عمارت کو یوں باہر سے دیکھ کر لگا کہ نور محل بہاولپور کی ایک حسین طلسماتی عمارت ہے--اس کی خوبصورتی، رکھ رکھاؤ اور بناؤ سنگھار نایاب ہے--ایک سو اکتیس سال میں بھی اس کے حسن و جمال میں بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔نور محل شاید اتنی محبت اور نیک نیتی سے بنایا گیا کہ اس کی جوانی ابھی بھی اسی آب و تاب سے برقرار ہے--مگر میں سوچتا ہوں کہ کسی کی جوانی اس وقت تا دیر برقرار رہ سکتی ہے کہ جب اس کی قدر دل و جان سے کی

جائے -- بہت سی چیزیں اپنی جوانی میں بھی بوڑھی ہو جاتی ہیں، فقط اس لیے کہ وہ بے درد لوگوں کے زیر سایہ آ جاتی ہیں -- میں نے سوات میں جوان عورتوں لڑکیوں کو عین عالم شباب میں بڑھاپے کی حالت زار میں عام دیکھا ہے -- پچیس سال کی عورت اتنی بے دردی کا شکار کر دی جاتی ہے کہ پچپن کی نظر آتی ہے -- سمجھو کہ نور محل ایک ایسی خوش نصیب حسینہ ہے کہ جو ناقدروں کے ہاتھ نہ پڑی کہ اپنی آب و تاب کھو بیٹھتی --!

ختم

باب ۹

لچھی جمعدارنی کی نُور محل
مہترانی کیسے اپنی نسل بدلتی ہے--!!!

بہت سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے گھر ایک مہترانی کام کیا کرتی تھی--نام تھا اس کا--"بھگتی"--اس وقت ہم جعفریہ کالونی والی، اپنے ابا جان کی بنائی ہوئی کوٹھی میں رہتے تھے۔اس زمانے میں وہاں ابھی فلش سسٹم نہیں آیا تھا--سو پوری کالونی پر بلا شرکت غیرے بھگتی کا قبضہ تھا--!

آپ سوچتے ہوں گے کہ ابھی پچھلے باب میں نور محل کی بات ہو رہی تھی--کمال ہے کہ آغا صاحب نے اتنے خوبصورت محل کے قصے کو ادھورا چھوڑ کر مہترانی بھگتی کی کہانی شروع کر دی--آپ درست فرماتے ہیں--مگر مجھے نور محل سے ہی بھگتی یاد آئی ہے--اب بھگتی سے اور کیا فلیش بیک آتا ہے--غور سے سنیئے--ہاں، یقین مانیئے کہ مجھے احساس ہے اور یاد رہے کہ میں نے واپس نور محل پر ہی آنا ہے--!!!

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھگتی بیمار پڑ گئی اور اس نے اپنی جگہ خالی نہ چھوڑی کہ کوئی دوسری جمعدارنی قبضہ نہ کر لے اور فوراً اپنا علاقہ، اپنی خوب رُو بھانجی لچھی کے سپرد کر دیا--اور بھگتی ہو کر بیماری کی "بیک لیو" پر چلی گئی۔

لچھی، ایک ایسی طرح دار اور چھیل چھبیلی مہترانی تھی کہ جب وہ سر پر ٹوکرا نہ اٹھائے ہوتی اور آپ اس کو

ذرا دور ہٹ کر دیکھ لیتے تو کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ وہی پھجی مہترانی ہے، جو دن بھر اہل جعفریہ کالونی کے کینوں کا فضلہ سر پر اٹھائے پھرتی ہے--!

پھجی کی پہلی جھلک بکرا عید والے دن نظر آئی -- اس دن ہمارے گھر گائے ذبح ہو رہی تھی۔ اس گائے میں ہمارے سمیت مزید چھ حصے دار تھے، جو جعفریہ کالونی کے معززین تھے -- پھجی ٹوکرا اٹھائے، اٹھلاتی اور لہراتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو سب چلا پڑے -- ارے، غلاظت کا سایہ کیوں ڈالتی ہے، پاک قربانی پر -- مگر جونہی ان کی نظر پھجی کے چہرے اور سراپے پر پڑی تو ان میں سے اکثر ہکلانے سے لگے اور ان کے غصے کے تھرما میٹروں کا پارہ قارورے کی جھاگ کی طرح یک دم بیٹھتا چلا گیا--!

"--چل، کم بخت، پرے ہٹ، اُدھر دیوار کے ساتھ ساتھ ہو کر اندر چلی جا--"

یہ پھجی کے حُسن کا پہلا کرشمہ تھا۔

پہلی جھلک نے بڑے بڑوں کی بولتی بند کر دی اور پھجی مسکراتے ہوئے، دیوار سے لگی لگی، پچھلے زنانہ صحن میں چلی گئی۔

اس کے حسن کا سکتہ ختم ہونے میں چند لمحے لگے اور مولانا زوار حسین میرٹھی حجۃ الاسلام مرحوم نے ایسا زور کا درود پڑھا کہ وہ لوگ جو ابھی تک سکتے کے عالم میں تھے، ہوش میں آ گئے--!

"--چلو بھئی چلو-- سلمان میاں، زنان خانے سے پراتیں لے آؤ-- کلیجی کٹ گئی ہے؛ بھابی کے حوالے کرو تاکہ وہ جلدی سے بھون کر دیں-- قربانی کے جانور کی بُھنی ہوئی کلیجی کھانا سنت ہے--" چاچا نور حسین شاہ نے بڑی محبت سے حکم صادر فرمایا۔

میں جو اندر آیا تو اماں پھجی کا انٹرویو لینے میں مصروف تھیں -- وہ اماں کے ساتھ ایسے ناز و ادا کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ جیسے وہ کوئی فلمی اداکارہ ہو اور اماں آڈیشن لینے والی سخت گیر قسم کی پروڈیوسر ہوں۔

اگلے دن پھر بھنگی چمارن نہ آئی، پھجی آ گئی--!

اماں نے آتے ہی، اس سے بلا تمہید کہہ دیا کہ تُو تو کسی طرف سے چوڑی نہیں لگتی -- سچ سچ بتا راز کیا ہے--؟

میں ساتھ کے کمرے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا، مگر کان اُن کی باتوں کی طرف لگ گئے۔ میں نے ان کی پوری گفتگو انہماک سے سنی۔

پھمی بھی کمال کی دلیر عورت تھی-- اماں کے ہر سوال کا کھرا اور دوٹوک جواب بے جھجک دیتی تھی۔

اماں نے پوچھا--"سچ بتا، یہ جمنی تیری سگی خالہ ہے--؟؟"

کہنے لگی--"ہاں، سگی خالہ ہے جی میں-- پر میری ماں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کھڑے کھڑے نسل بدلے گی--اس نے میرے باپ سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں یہ کالے پیلے، جو تجھ سے ہوں گے، نہ پیدا کروں گی اور نہ ہی جنوں گی--میں تو بس اپنی پسند کے آدمی سے اپنی نسل بدلوں گی--" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"--اری، اے کم بخت، پھر تیرے باپ نے یہ سب مان لیا--؟؟؟"

"--ہاں، مانتا کیوں نہیں--مان گیا-- کیوں کہ میری ماں نے اس بھولے کو بڑے پیار پریم سے یہ سمجھایا کہ باہر والا تو صرف ایک ٹوبا لگائے گا اور تو روز ٹوبا لگاتا ہے-- یہ بتا کہ ایک ٹوبے سے فرق پڑتا ہے یا سو ٹوبوں سے--؟--احمق آدمی تھا-- کہنے لگا کہ سو ٹوبوں سے فرق پڑتا ہے--میری ماں کہنے لگی کہ پھر تجھے کوئی اعتراض ہے؟--اس نے سوچا اور بہت سوچا اور پھر سر کھجاتے ہوئے بولا--ہاں، اگر اس شرط پر تُو پکی ہے تو بھلا مجھے کیا اعتراض--بس باجی، میری ماں کے پھر پانچ بچے ہوئے--ایک سے ایک اعلیٰ--میں ان میں سے ایک ہوں--میں ہوں ناں، رنگ روپ میں خوبصورت--؟؟؟"

اماں آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"--ہاں--تیری خالہ جمنی تو تیرے پاؤں کی جوتی کے تلوے میں لگی مٹی اور گُو سے بھی گئی گذری ہے--یہ بتا--تیرے کیا ارادے ہیں--؟"

بڑے دھڑلے سے بولی--"میں بھی نسل بدل رہی ہوں--"!

"--تُو بھی--" اماں حیران ہو کر بولیں۔

"--ہاں، میں بھی--" اس نے ادا سے مسکرا کر کہا۔

"--تیرا میاں راضی ہے کیا--؟" اماں نے حیرت سے منہ کھول کر پوچھا۔

"--باجی، میاں کا راضی ہونا ضروری نہیں، بس میرا راضی ہونا ضروری ہے--" پھمی نے منہ پھاڑ کر کہا--پھر بڑی رازداری سے آنکھ دبا کے بولی۔

"--ہر بات میاں کو بتانا ضروری نہیں ہوتا جی--اس کو اپنے کام سے مطلب ہے اور مجھے اپنے کام سے--" پھر بولی۔

"--باجی، میں نے سنا ہے کہ نسل بدلے تو چھوٹے دماغ بدل کر او نچے ہو جاتے ہیں، عقل بڑی ہو جاتی ہے۔ حُسن اور رُوپ جوانی چڑھ کے آتی ہے، آنکھوں کے رنگ تک بدل جاتے ہیں--خوبصورتیاں بہار بن کے بچوں میں اترتی ہیں--لڑکی پیدا ہو تو مستانی ہوتی ہے اور لڑکا ہو جائے تو بڑا ہو کر "باؤ" بنتا ہے--یہ بات سچ ہے کیا باجی--؟؟؟"

میری اماں نے جواباً کہا--"چل ہٹ، دفع ہو جا--" اور وہ چلی گئی۔

اس زمانے میں جمعہ کو آدھی چھٹی ساری ہوا کرتی تھی اور میں چوبرجی گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا--میں گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پھمی مہترانی روٹی پر اچار رکھے کھا رہی ہے اور اماں سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ "باتیں مشورہ" رہی ہے۔

"--باجی، پتہ ہے، میں پانچ ماہ کے حمل سے ہوں--میرا پیٹ اور کمر دیکھ کر کسی کو پتہ چلتا ہے کہ میں پانچ مہینے کے پیٹ سے ہوں--؟"

"--چل، بکواس نہ کر--روٹی کھا اور اپنے کام پر نکل جا--کم بخت روز آ کر بیٹھ جاتی ہے اور نئی سے نئی کہانی سناتی ہے--"!

پھمی نے اماں کی پھٹکار کو مسکرا کر نظر انداز کر دیا۔

"--بڑا سوچ کے بیج ڈلوایا ہے--اللہ خیر کرے، بُوٹا بڑا سوہنا آئے گا--"!

"--کون بُوٹا--؟--" اماں نے پوچھا۔

"--پودا جی پودا--بڑی اعلیٰ نسل کی قلم اور بیج ہے--پورا ایک مہینہ میں نے جیدے چوہڑے کو پاس نہیں لگنے دیا--دو جگہ سے بیج لیا ہے--ایک کی آنکھیں نیلی تھیں؛ وہ گلگت کا پٹھان تھا--دوسرا اونچا، لمبا، گورا چٹا، پڑھا لکھا جوان تھا--"

پھر بڑی حسرت سے بولی۔

"--کاش آنکھیں پٹھان کی ہو جائیں اور رنگ روپ ملک صاحب کا مل جائے--"

اماں کو تاؤ آ گیا۔

"--بڑی بے غیرت ہے تُو--لعنت کی مار ہو تیری شکل پے--"

پھمی نے اماں کی بات کا بالکل برا نہیں منایا--وہ نسل بدلنے کے نشے میں بدمست تھی--بولی۔

"--سوچتی ہوں کہ اگر لڑکا ہوا تو گلفام خان نام رکھوں گی--" وہ بولتے بولتے رک سی گئی۔

"--اور اگر لڑکی ہوئی تو کیا نام رکھے گی تُو--؟" اماں نے پوچھا۔

"--نورمحل--نورمحل نام رکھوں گا گوری کا--"

اس نے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔

"--لعنت کی مار ہو تجھ پے--تُو اپنی اوقات بھول گئی ہے--تو مہترانی ہے، مہارانی نہیں ہے--" اماں نے تپ اور جل بُھن کر کہا۔

"--اے، تُو نے یہ شاہانہ نام کہاں سے سن لیے اللہ ماری کم بخت--"

بولی--"گلفام، پٹھان کے لڑکے کا نام ہے، میرا تو دل آ گیا اس نام پر--اور نورمحل ملک صاحب جی کی بہن کا نام ہے--کیسے ٹھاٹھ کا نام ہے یہ--"!

پھر بولی۔

"--چلو--میں تو مانتی ہوں کہ میں چوہڑی ہوں، گُو کا ٹوکرا اٹھانے والی--مگر اگلے تو نصیبوں والے ہوں--پھجی نام ہے میرا--جیسا گندہ نام ہے، ویسے گندے کام ہیں میرے--جب بچے کا نام اچھا ہوگا، تو کام بھی اچھے ہی ہوں گے--پھر ان کو اپنی نسل بدلنے کی، میری طرح تو ضرورت نہیں ہوگی ناں--"

"--تیری کیا خواہش ہے کہ کیا ہو تیرے ہاں--" اماں نے پوچھا۔

"--نورمحل--مجھے نورمحل چاہیے--!!!"

پھر پھجی شفا پا گئی اور پھجی پردۂ سکرین سے غائب ہو گئی۔

کئی مہینوں بعد پھجی ہمارے گھر آئی۔

اس کی گود میں سچ مچ کی "نورمحل" تھی--!

حسین و جمیل، گوری ابرق، یہ بڑی بڑی نیلی آنکھیں، سیاہ لمبے لچھے دار بال--نازک اور گورے ہاتھ پیر مخمل جیسی جلد--وہ واقعی نام کی بھی اور شکل و صورت کی بھی نورمحل تھی--!!!

میں نورمحل کے عالی شان برآمدے میں کھڑا نورمحل کے بارے میں سوچ رہا تھا--کبھی فلیش بیک میں نورمحل نظر آتی اور کبھی آنکھوں کے سامنے نورمحل نظر آتا--!

میں سوچ رہا تھا--

نورگل کا کون سا والا روپ لاجواب ہے--؟

مجھے لگا--واقعی، نورگل جس بھی روپ میں ہو، بہت ہی خوب صورت اور بے مثال ہے--!

باب ۱۰

نورمحل ایک جیتا جاگتا طلسم خانہ ہے
ملکہ نور فاطمہ کو نورمحل سے نفرت ہو جاتی ہے۔۔!

میں نورمحل کے پُرشکوہ برآمدے میں، اس کی خوبصورتی اور نایاب جمال کے نامعلوم سحر میں جکڑا ہوا، حیرت زدہ کھڑا تھا۔

میرے سامنے ایک وسیع و عریض دروازہ کھلا تھا اور دروازے کی محراب چوکھٹ سے آگے نورمحل کا حسین و جمیل دربار ہال اپنی جھلک، مثلِ عروسہ دکھاتا تھا۔۔!

بعض دفعہ زندگی میں ایسی حسین چیزیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں کہ بندے کو یقین نہیں آتا۔ انھیں اور ان کے جمال کو دیکھ کر نظریں منجمد ہو جاتی ہیں، ہوش کچھ دیر کے لیے معطل ہو جاتے ہیں، قدم جہاں ہوتے ہیں، وہیں جمے رہ جاتے ہیں، لفظ تحسین دینے کی بجائے جامد اور بے معنی ہو جاتے ہیں، خیال اپنا مرکز کھو بیٹھتے ہیں اور بس، ذرا دیر کو کائنات رک سی جاتی ہے۔۔عموماً یہ کرشمے کسی بھی طرح کے حسن کے ردِ عمل کی فطری تباہ کاری ہوتے ہیں۔۔!

میں نورمحل کے دربار ہال کی جھلک دیکھ کر اسی نامعلوم تباہ کاری کا بے ساختہ شکار ہوا تھا۔۔!

عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی حسن پرست مرد، کسی حسینہ کے جمال کی ایسی زیارت کرتا ہے تو

بہک جاتا ہے -- اور بہک جانے کے لیے بہت کچھ کی ضرورت نہیں ہوا کرتی -- ایک لٹ، جو گالوں پر لہرا رہی ہو، دو اُوپر نیچے کے تنے ہوئے ہونٹ، جن میں مستی شراب کی سی ہو، گالوں میں پڑنے والا ایک ہلکا سا گڑھا، چہرے پر مناسب سا سیاہ تل، گردن کی مخروطی بناوٹ، ہاتھوں کی انگلیوں کا بھرا بھرا پن، بادامی ناخن، بالوں کی چمکدار رنگت، دھوپ کے لشکارے سے چمکنے والا بازو کا سنہرا رواں، ناک میں پہنی چھوٹی سی نتھنی، کندھوں اور پشتِ گردن کا ہلکا سا گولائی دار ابھار، کمر کی لچک، غرض کچھ بھی، خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، اگر دیکھنے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کر لے، تو سب کچھ بہالے جاتا ہے اور جب وہ اپنے آپ میں بہا کر لے جانے پر قادر ہو اور بہنے والا بہہ جانے کو تیار ہو، تب بہت سی چیزوں کی ہرگز ضرور نہیں ہوتی -- بس ایک ادا یا ایک بہا جانے والی جنبش ہی کافی ہوا کرتی ہے -- سب کچھ اکٹھا ہونا ضروری نہیں ہوتا -- ہاں جب بہاؤ کا بے اختیار عمل شروع ہو جاتا ہے تو اس بہاؤ میں یکے بعد دیگرے وہ سب کچھ خود بخود آتا چلا جاتا ہے کہ جس نے اپنے جمال کا زور نہیں بھی دکھایا تھا -- پھر وہ سب کچھ آہستہ آہستہ اکٹھا ہونے لگتا ہے اور اکائی سے جنم لینے والا بے اختیار بہاؤ کل میں تبدیل ہو کر سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے --- پھر جب بہاؤ کا عمل تکمیل کو پہنچتا ہے تو ہر شے واپس الگ الگ ہو جاتی ہے --!

نور محل کی پراسرار جمالیاتی اکائی، مجھے اپنے آپ میں بہائے لیے جا رہی تھی اور میں اس کے دَر و دیوار اور فرشوں کی خوبصورتی میں گرفتار ہو کر پوری صداقت سے تحلیل ہو جانا چاہتا تھا --!

''-- آپ ٹھہر کیوں گئے ہیں --؟'' کسی نے مجھ سے ہی کہا۔

''-- کیا میں اس محل کے نایاب فرش پر قدم رکھ سکتا ہوں --؟''

''-- جی ہاں، کیوں نہیں -- آپ کے پاس ٹکٹ داخلہ ہے ناں --؟''

''-- جی، بالکل، وہ یہ رہا --''

میں نے بے ساختہ نور محل میں داخلے کا باہر میز سے خریدا ٹکٹ اس اونچے لمبے، شلوار قمیض واسکٹ میں ملبوس مونچھوں والے خوش شکل نوجوان کو تھما دیا۔

''-- سر، آپ اندر جا سکتے ہیں اور اپنا یہ کیمرہ بھی لے جا سکتے ہیں --'' اس نے معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''-- تصویریں بھی بنا سکتا ہوں کیا --؟''

''-- جی، ضرور بنائیں -- آپ خوش قسمت ہیں، کل سے نور محل پندرہ دن کے لئے عوام کے لیے بند ہو

جائے گا، مین ٹی نینس ہوتی ہے نا محل کی-- مجھے امجد کہتے ہیں، میں پاک فوج سے ہوں، استقبالیہ آفیسر--"

"--بہت شکریہ-- مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے اور نور محل کی خوبصورتی دیکھ کر دل عاشقی میں مبتلا سا ہو گیا ہے میرا--" میں نے ہنس کر کہا۔

"--سر، کیسا لگا آپ کو نور محل--" اس نے پوچھا۔

"--ابھی پورا تو نہیں، ایک جھلک ہی دیکھی ہے تو دل عاشق ہو گیا ہے--" میں نے کہا۔

"--سچ کہتے ہیں آپ، مگر اس محل پر مردوں سے زیادہ خواتین عاشق ہوتی ہیں--"

"--وہ کیوں بھئی--اس میں کیا رمز پوشیدہ ہے--؟"

"--وہ ساری عمر تو یہاں رہ نہیں سکتیں، پر ایک رات رہنے کی خواہش کا اظہار ضرور کر دیتی ہیں-- پر سر، عجیب بات ہے، جس عورت کے لیے اس کو بنایا گیا، وہ یہاں فقط ایک رات رہی اور پھر اس نے اس حسین محل میں مزید شب و روز گزارنے سے انکار کر دیا--"

"--وہ کون--" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"--سر، وہ تھیں، ہر ہائینس نور بیگم--!!!"

"--نور بیگم نے نور محل کو رجکٹ کر دیا--اُف کیا نازک مزاجی ہے، کیا حُسن ادا ہے اور کیا نخرہ ہے--" میں دنگ کا دنگ رہ گیا۔

میں حیرت زدہ تھا--کوئی اس محل کے طلسم خانے میں ایک رات کی شب باشی کو دیوانہ ہے اور کوئی ایک شب گزار کر اس طلسماتی حسین محل کی صورت بھی دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے--میں واقعی حیرت زدہ ہوں--ایسی ایسی حسینائیں بھی یہاں آ چکی ہیں کہ ایک شب کے لیے وہ ہر قیمت دربان کو ادا کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں اور ایک ایسی بھی تھی کہ ایک شب بسری کے بعد نور محل کو دل سے اتار پھینکا--!

میں واقعی اس محل کے طلسم خانے میں حیرت زدہ ہوں--!

کیا یہاں آسیب ہیں، بدروحیں ہیں--میں نے اس کی آب و تاب دیکھ کر فیصلہ کر لیا--نہیں یہاں ایسا کچھ نظر نہیں آتا، ایسے کوئی آثار نہیں ہیں--یقیناً یہ انسان کے اپنے اندر کے آسیب کی کہانی ہوگی--اندر کا آسیب اور اندر کی بدروح جب زور پکڑ لے تو جینے نہیں دیتی--!

جو بھی لوگ اس وقت یہاں ہیں، سب کا حال اس کی رنگینیاں اور سجاوٹیں دیکھ کر کم و بیش مجھ جیسا ہی ہے۔

بے حس سے بے حس میں بھی تعریف کا فانوس نہ سہی، چراغ تو روشن کر ہی دیتا ہے-- درودیوار، چھت وفرش کی نقاشیاں دل موہ رہی ہیں-- نظر کسی ایک کونے، کسی محراب، کسی بام اور کسی ستون پر ذرا ٹھہرتی ہے تو پھسل کر کسی دوسرے زاویے، کسی نئی مخروط، کسی گولائی، کسی بانکی پر لپک کر لپٹ جاتی ہے-- پردے، محرابیں، پینٹنگز، فانوس، منقش اور نایاب گل دانوں اور ایسی ایسی دل کش پاٹری پر رک کر طواف کرنے لگتی ہے کہ دنیا کی چیزوں کا حسن مجمد سا ہونے لگتا ہے-- دل چاہتا ہے کہ اس کو بے پناہ داد دی جائے کہ جس نے اپنے حسین انتخاب سے ان آرائشی اشیاء کو یہاں کے لیے منتخب کیا اور ہر خوبصورتی کو اس کے خوبصورت اور پُرکشش مقام پر نفاست سے رکھا اور سجا دیا--

ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں نور محل سے بھی زیادہ قدیمی مگر اس محل کی طرح سجے دھجے محل ہوں مگر بہاول پور کے محلات میں نور محل کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنی تعمیر کے ۱۳۸ سال، انقلابات زمانہ، موسموں کے مدوجزر گذارنے اور سہہ جانے کے باوجود بھی آج اسی شان وشوکت کا مظہر ہے کہ جیسے ابھی کچھ سال پہلے تکمیل کو پہنچا ہو-- میں اس کو نور محل کی خوش نصیبی قرار دیتا ہوں کہ نظر بد سے محفوظ رہا ہے-- مگر اس دائمی شان وشوکت کو قائم رکھنے میں اس خوش اسلوب ادارے کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے کہ اس نے نور محل کو اجڑنے، برباد ہونے اور تباہی کا شکار ہونے سے بچائے رکھا-- آپ اور میں سوچتے ہیں کہ ایسا قدردان پاکستان کا کون سا ادارہ ہے کہ جو رکھ رکھاؤ میں صاحب وقار ہے تو جناب وہ ہے، لے دے کے فوج، پاکستان آرمی-- پاکستان آرمی نے نور محل کے درودیوار سے لے کر فرش اور چھتوں تک کی حفاظت کی ہے-- ورنہ تو اس محل کا بھی وہی حال ہونا تھا جو باقی محلات اور آثار قدیمہ کا اب تک ہو چکا ہے--!

نور محل بہ طور ورثہ اور آثار قدیمہ پاکستان کا خوب صورت ترین اثاثہ ہے-- اور بھی بہت سے قدیم و جدید اثاثے، آثار قدیمہ کی صورت میں ہمارے پاس ہیں مگر جب ان کی حالت کو دیکھا جاتا ہے تو اکثر کف افسوس ملنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا--!

ہر بندے کی اپنی اپنی عادتیں اور فطری خصائل ہوتے ہیں-- میری ہمیشہ سے عادت ثانیہ ہے بلکہ یوں کہو کہ اب تو فطرت ہے کہ میں جب بھی کسی شے یا فرد کو دیکھتا ہوں تو پہلے چہرہ ماتھا دیکھتا ہوں اور پھر نظر خود بخود اس کے پاؤں یا فرش پر جا کر ٹھہر جاتی ہے-- جیسے میں نے بارہا دیکھا، چھت سے جالے لٹکتے ہیں اور فرش تا کی پوچے سے شیشے کی طرح چمکتے ہیں، بازاروں میں دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ چہرے چاند سے چمکتے ہیں اور پاؤں پر پھٹکار

برتی ہوتی ہے--

مگر نور محل کے مرکزی ہال کی چھت لمبائی کے رُخ تھی اور محرابی تھی۔ چھت کی محراب کیا تھی، بس رنگین چوکور خانوں کا ایک حسین جال تھا۔ ہر خانے میں پھول اور پتیوں کا متوازن نقش تھا۔ خانوں میں آٹھ بنیادی پس منظر کے رنگ تھے۔ گل بوٹے سب میں طرح طرح کے اور مختلف تھے۔ ایک آرچ میں کل آٹھ خانے تھے۔ لمبائی کے رخ کتنے تھے، گنے نہیں جا سکے--ایسا لگتا تھا کہ اس مرکزی ہال کے فرش کے موزیک اٹالین ٹائلز کا ایک غیر مرئی عکس کا اچھوتا منظر چھت کی چھوٹی چھوٹی محرابوں میں جھلک مارتا ہے۔

مرکزی ہال کے فرش پر چار مختلف اٹالینز ٹائلز سے فرش کو مزین کیا گیا تھا۔ چاروں طرح کے ٹائلز کے ڈیزائن یقیناً ایک دوسرے سے مختلف تھے، مگر ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے اور میل کھاتے تھے کہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ سب کا نقشہ اور رنگ روپ الگ الگ ہے--میں سوچنے لگا کہ اٹلی والے اور وہاں کے آرٹ ڈیزائنر اس زمانے میں اگر ایسے کاریگر، ماہر اور آرٹ اَستھکس رکھتے تھے تو آج اُن کا معیار تعمیر اور سوچ وفکر کا کیا مقام ہوگا--اٹلی اور روم کے فن تعمیر میں مضبوطی اور خوبصورتی ایک ساتھ تب بھی تھی اور آج بھی ہے۔

مرکزی ہال کے فرش کی چمک دمک اور مضبوطی آج بھی پہلے دن کی طرح ہی دکھائی دیتی تھی--اس فرش کو بنوانے والے، بنانے والے اور انتخاب کرنے والے کے حسن نظر کی داد بے اختیار منہ سے نکلتی تھی۔

مرکزی ہال لمبائی کے رُخ تھا اور اٹالین طرز کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ چھت، فرش سے خدا جھوٹ نہ بلوائے، کوئی پچاس فٹ کے لگ بھگ اونچی تھی--ہال کے دونوں طرف لمبائی میں گیلریاں تھیں، جن کی دیواروں پر صادق خاندان اور بہاول عباسی خاندان کے حکمران نوابوں کی خوبصورت پینٹنگ پورٹریٹ، نہایت خوب صورت اٹالین فریموں میں آویزاں تھے۔ گیلری کی محرابوں پر عالی شان سرخ اور نارنجی شنیل کے پردے لگے تھے--ان کے پس پردہ جو کمرے تھے، ان کی بناوٹ اپنی مثال آپ تھی۔ جن کی نفیس خوبصورتی کو بیان کرنا ذرا مشکل ہے مگر دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے یہی حق کا تقاضہ ہے۔ دونوں اطراف کی گیلریوں کے اوپر پہلی منزل میں بھی اسی نوعیت کی بالکنی گیلریاں تھیں، جن کے پیچھے رہائش محل کے ایسے حسین، سجے سجائے اور مثل عروس کمرے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ آج ہی کسی دلھن نے بیاہ کر ان میں قدم رنجہ فرماتا ہے--!

اوپر کے کمروں کی کھڑکیوں اور باہر صحن میں کھلنے والے دروازوں کے آگے محرابی دالان اور کشادہ برآمدے تھے کہ جن میں بیٹھ کر روح کو سکون ملتا تھا۔ نگاہ دور تک جاتی تھی اور تازگی کا احساس خوش گوار ہوا سے ہوتا

تھا جو اپنے رخ کے باعث ہمہ وقت ان برآمدوں میں مستانی پھرتی تھی--!

مرکزی دربار ہال کا فرش اس قدر دل کش، چمک دار اور نرالے پُرکشش رنگوں کے امتزاج کا مرقع تھا کہ میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں آلتی پالتی مار کر اس فرش پر بے تکلفی سے نہ بیٹھا تو اس اطالین فرش کی نہ صرف توہین ہو جائے گی بلکہ جن لوگوں نے اس کو بنوایا، بنایا اور ڈیزائن کیا، میرے اس عمل سے ان کی روح خوش ہو جائے گی-- میں تصویر بنانے کے بہانے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور میں نے جب اس زاویے سے فرش کے موزیک بھاؤ کے لشکارا حسن کو اس قدر قریب اور آنکھ کے ترچھے زاویے سے دیکھا تو میں مبہوت رہ گیا-- وہ فرش یقیناً آرٹ کا شاہکار اور نفاست اور نازک مزاجی کا نایاب نمونہ تھا-- مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے فرش کی خوب صورتی کو ایک یادگار تخلیق کے طور پر اپنے کیمرے میں اس انداز سے محفوظ کیا کہ جو اس کے حسن و جمال کا حق تھا--!

میں نور محل کے در و دیوار کی خوب صورتی اور کاری گری کو دیکھتا اور اس کے بنانے والی ٹیم اور اس کا نظریہ پیش کرنے والوں کے ذوق اور شوق کی داد دیتا جاتا تھا-- تب کسی نے بتایا کہ جناب کبھی رات کو تشریف لائیں اور پھر نور محل کے جگمگاتے حُسن کو دیکھیں--- آپ یقیناً دنگ رہ جائیں گے-- میں نے کہا، انشاءاللہ--! اس نے یہ بھی کہا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ رات کو جب روشنیاں، نور رنگ بن کر نور محل پر اپنے لشکارے ڈالتی ہیں تو نور محل سچ میں نور محل بن جاتا ہے--!

مگر نور محل تو اس وقت بھی نور محل ہی نظر آ رہا تھا-- دربار ہال میں روشن تین کرسٹل کے نازک فانوس روشن تھے۔ درمیان والا فانوس بڑا اور دائیں بائیں کے فانوس ذرا چھوٹے، مگر شان و شوکت میں کسی حسینہ کے گلے اور کانوں میں پڑے پکھراجوں کی طرح تھے-- زردی مائل اور روشن، چمک دار اور پُرکشش، نازک اور حسین گوشوارں کی طرح لاجواب--- ناقابلِ بیان--!

جو فرنیچر یہاں سلیقے سے سجا رکھا تھا، وہ بھی اپنی نوعیت کا منفرد اور لاجواب تھا-- سنگھار میزیں شاہانہ تھیں، ان کے آئینے بے مثل شفاف اور نازک تھے کہ عکسِ انسان، مثلِ اصل دکھائی دیتا تھا-- کرسیاں یوں تو قدیم وضع کی تھیں مگر کسی سمت سے قدامت کی آئینہ دار نہیں تھیں؛ صوفے میزیں اور تپائیاں دیکھنے میں جدید ترین نظر آتی تھیں-- ایسے ڈیزائن میں تھیں کہ سوا صدی کے بعد بھی آج کی کاری گری دکھائی دیتی تھی-- سب کچھ وہی ۱۳۸ سال پرانا تھا مگر ایسے تھا کہ جیسے آج کے مطابق تیار کیا گیا ہو--!

نور محل کو بہاول پور ریاست کے نواب امیر سر جنرل صادق محمد خان المعروف نواب صبح صادق (۱۸۶۶ء تا

۱۸۹۹ء) چہارم نے اپنی محبوبہ بیوی کو تحفے میں دینے کے لیے بنوایا -- ان کی بیگم نے اس تحفے کی کیا قدر کی، یہ ایک الگ داستان ہے۔

نواب صبح صادق چہارم کو بہاول پور کا شاہ جہاں کہا جاتا تھا۔ اس لیے کہ انھیں خوبصورت اور منفرد طرز کی عمارات بنوانے کا بے پناہ شوق تھا۔

نواب صبح صادق نے اپنے انگلستان کے قیام کے دوران ایک انگریز ماہر تعمیرات (آرکیٹیکٹ انجینئر) مسٹر ہن نن Mr. Hennan سے فقط اس لیے دوستی بنائی اور بڑھائی کہ اس ماہر تعمیرات میں ان کو وہ خوبیاں نظر آئیں کہ جن کے وہ قدر دان تھے -- مسٹر ہن نن کو بہاول پور ریاست میں ایک محل ڈیزائن کرنے کو کہا گیا کہ جس کا نام "نور محل" رکھا گیا تھا۔

مسٹر ہن نن نے اس محل کو نواب صبح صادق چہارم کی عین دلی خواہشات اور خوابوں کے مطابق تعمیر کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مسٹر ہن نن، نواب صاحب کے ذوق سلیم کو بخوبی سمجھتے تھے -- نواب صاحب اور مسٹر ہن نن کی کیمسٹری اس معاملے میں زبردست ثابت ہوئی --!

نور محل کی بنیاد ۱۸۷۲ء میں بستی ملوک کے موضع میں رکھی گئی -- جب اس کی بنیادیں کھودی گئیں تو اچھے شگون کے لیے ان میں ریاست کے سرکاری سونے چاندی کے سکے، جواہرات، سونا چاندی دفن کر کے اوپر محل کی بنیادیں رکھی گئیں -- علاوہ ازیں بنیادوں میں، ہر کونے پر، ہر محراب کے نچلے مقام پر، ہر طرح کے جانوروں کو ذبح کر کے قربانی بھی دی گئی -- جن کو قربانی دے کر وہیں گوشت پوست سمیت دفن کر دیا گیا۔ غریب غربا کے لیے محل کے کمروں، والانوں میں الگ سے قربانی دی گئی اور پورے پورے جانور مستحقین کو صدقہ میں دے دیے گئے۔

نور محل کی بنیاد ۱۸۷۲ء میں بڑی اہتمام سے رکھی گئی۔ اس محل کی تعمیر میں استعمال ہونے والا سامان، فرش کی ٹائلیں، دیواروں میں نصب کی گئی الماریاں اور لکڑی کا دیگر سامان، مثلاً دروازے، سنگھار میز، بہت سا فرنیچر خاص طور پر انگلستان اور اٹلی سے اپنی پسند کا بنوا کر بحری جہازوں میں رکھ کر منگوایا گیا -- اس محل کی اینٹیں اور دیگر معمولی تعمیراتی سامان ہی مقامی تھا، باقی سب باہر سے آیا تھا -- حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ محل، جس کی تعمیر بظاہر سالوں میں ممکن نظر نہیں آتی، فقط تین سالوں میں (۱۸۷۵ء) تکمیل کو پہنچ گیا۔ کہتے ہیں کہ اس محل کی تعمیراتی نگرانی خود نواب صاحب نے دن رات کی -- وہ کسی بھی وقت، خواہ دن ہوتا یا رات، کام کا جائزہ لینے اچانک پہنچ جاتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ نور محل تین سال کے قلیل عرصے میں مبلغ بارہ لاکھ روپے صرف میں تیار ہو گیا تھا۔

مگر اس موقع پر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۵ء میں بارہ لاکھ کی رقم، آج کے تقریباً بارہ ارب کے برابر بنتی ہے--!

میں ایک لمحے کو سوچ رہا تھا کہ بے شک یہ محل آج کے زمانے میں تقریباً بارہ ارب میں ہی بنے، مگر کیا اتنا مضبوط، پائیدار بن سکے گا کہ اگلے ۱۳۸ سال تک پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم رہ سکے کہ جیسا کہ نور محل اس وقت ہے--اس سوال کا جواب اگر کسی کے پاس ہے تو مجھے ضرور بتائے--!

نور محل کا تعمیراتی رقبہ جس کو آج کل کورڈ ایریا کہتے ہیں، چوالیس ہزار چھ سو (۴۴۶۰۰) مربع فٹ ہے۔ اس میں ۳۲ خوبصورت اور کشادہ ہوادار کمرے بنائے گئے ہیں، جن میں ۱۴ تہہ خانے کے کمرے بھی شامل ہیں۔ گویا نور محل کی تین منزلیں ہیں، ایک زیر زمین، دوسری گراؤنڈ فلور اور تیسرا فسٹ فلور۔ گویا ظاہری محل کے نیچے بھی پورا ایک محل تعمیر کیا گیا، جس کے کچھ حصے آج کل بند ہیں اور کچھ کھلے ہیں۔

محل میں مختلف سمتوں میں رہائشی کمروں کے سامنے چھ بڑے برآمدے ہیں۔ پورے محل کی چھتوں میں کل پانچ گنبد بھی ہیں، جو بعض خوبصورت کمروں اور مرکزی ہال پر تعمیر کیے گئے ہیں--جن کے ہونے سے عمارت کی شان و شوکت میں پُر شکوہ اضافہ ہوا ہے۔

نور محل کا بنیادی تعمیراتی ڈیزائن اور نقشہ Corinthian اور اسلامی طرز تعمیر کے عجیب و غریب ملاپ سے ملا کر بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں برصغیر کی روایتی قدیم شاہانہ طرز تعمیر کو بھی تعمیراتی حسن نکھارنے کے لیے اس میں بڑی نفاست سے شامل کیا گیا ہے کہ کہیں بھی بے جوڑ پن کا احساس قطعی نہیں ملتا۔ اس اعتبار سے یہ متحدہ ہندوستان کی ایک منفرد عمارت بن کر سامنے آیا--اس محل کی خوبصورتی کے چرچے پورے ہندوستان میں ہوئے اور بڑے بڑے رؤسا اور نواب اس کو دیکھنے کے لیے خصوصاً نور محل آئے مگر کوئی بھی نور محل کی نقل یا ریپلیکا نہیں بنا سکا-- میں سمجھتا ہوں کہ نقل نہ بنا سکنا، کسی عمارت کی یکتائی اور انفرادیت کی سب سے بڑی دلیل ہوا کرتی ہے۔ نور محل اس انفرادیت میں یقیناً یکتا اور منفرد ہے--!

نور محل کا Corinthian Design ہمیں اس نور محل کے بڑے بڑے کشادہ ستونوں، محرابوں، محل کے برآمدوں، صحنوں اور سیڑھیوں میں جو ریلنگ لگائی گئی ہے، اس میں واضح طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

Pediments کا دل کش تعمیراتی نظارہ غالباً انگلستان اور اٹلی کے روم سے مستعار لیا گیا ہے، جس کی مقامی تعمیر میں ایسی غیر محسوس تبدیلیاں کی گئیں کہ اس میں اپنا پن نمایاں ہو گیا۔ اس منفرد انداز تعمیر کو آپ محرابوں سے

بنی ہوئی دربار ہال کی چھت میں اندر کی جانب سے بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں۔

نور محل کی تعمیر میں ہمیں اس کی چھت پر پانچ گنبد نمایاں نظر آتے ہیں، جن کا منظر نامہ اسلامی طرز تعمیر میں باہمی قدیم وجدید امتزاج کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ Angular Shape واضح طور پر برصغیر کے قدیم، روایتی اور مغلیہ طرز تعمیر کو پیش کرتی ہے۔

نواب محمد بہاول خان پنجم نے نور محل میں ایک خوبصورت مسجد ۱۹۰۶ء میں اضافی تعمیر کی شکل میں بنوائی، جس کی لاگت بیس ہزار روپے تھے۔ اس مسجد کا نقشہ اور انداز اور طرز تعمیر ہو بہو ایچیسن کالج لاہور کی مسجد جیسا تھا اور ہے۔۔۔نواب محمد بہاول خان چونکہ خود ایچیسن کالج میں پڑھا کرتے تھے اور اس مسجد میں نماز کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان کو یہ مسجد دل وجان سے پسند تھی۔ انھوں نے اسی کو نور محل میں محبت سے بنوایا۔

نور محل ذاتی رہائش کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کو ریاستی سرکاری مہمان خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی میں ریاست بہاول پور کا دربار لگایا جاتا تھا اور ساتھ میں جتنے بھی غیر ملکی و دیگر ہندوستانی ریاستوں کے سرکاری وفود آتے، وہ حکومت بہاول پور کی جانب سے یہیں ٹھہرائے جاتے، یہیں ان سے سرکاری سطح کی ملاقاتیں ہوتیں۔ گویا نور محل کو ریاست بہاول پور کی طرف سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس قرار دے دیا گیا۔

اسی عمارت میں وائسرائے ہندوستان بھی آ کر ٹھہرے۔۔۔انگلستان سے آنے والے شاہی مہمان بھی یہیں ٹھہرائے جاتے تھے۔ دوسرے ممالک کے سربراہ بھی اسی نور محل میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ اگر کوئی ہندوستانی ریاستوں کا سربراہ بہاول پور آتا تو وہ بھی اپنے سرکاری وفد کے ساتھ نور محل اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں قیام کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا تھا۔۔۔!

۱۹۵۶ء میں جب بہاول پور کی ریاست، پاکستان کا مستقل حصہ بن گئی تو نور محل کی عمارت کو محکمہ اوقاف کے حوالے کر دیا گیا، جس سے اس کا حال بگڑنے لگا اور وہ اپنی شان وشوکت تیزی سے کھونے لگی۔

۱۹۷۱ء میں نور محل کو پاک فوج کو لیز پر دے دیا گیا۔ پاکستان آرمی نے نور محل کی دل وجان کے ساتھ قدر کی اور نور محل کے شان شایان اس کی زیبائش کو بحال کر دیا۔۔۔۱۹۹۷ء میں پاکستان آرمی نے یہ محل ایک ارب انیس کروڑ میں مستقل طور پر خرید لیا۔۔۔۱۹۷۱ء کے بعد سے نور محل فوج کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال میں رہا۔۔۔۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک نور محل، پاک آرمی ۳۵ ڈویژن کے تصرف میں بطور ہیڈ کوارٹر رہا۔۔۔۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک نور محل آرمی اسٹیشن لائبریری کے طور پر استعمال کیا گیا۔۔۔۱۹۹۲ء میں نور محل 31-Cops Reserve کے پاس آ

گیا -- آخرکار یہ طے پایا کہ نور محل کی یہ عمارت اور اس سے ملحقہ باغات کو پاک آرمی کا آفیسرز کلب اور بہاول پور گیریژن میس بنادیا جائے۔ یہ فیصلہ اگست ۲۰۰۱ء میں کیا گیا --!

ستمبر ۲۰۰۱ء میں پاکستان گورنمنٹ اور وزارت محکمہ آثار قدیمہ نے باہمی رضامندی سے نور محل کی عمارت کو "قومی اثاثہ اور قومی ورثہ" قرار دے دیا۔ مگر موجودہ عہد میں اسے عوام کے لیے کھولنے پر اتفاق ہو گیا اور اس کے دروازے عوام پر کھول دیئے گئے مگر نور محل کا انتظام وانصرام اب بھی پاک آرمی کے پاس ہی ہے --!

مگر یہاں پر سوال یہ ہے کہ نور محل کو نواب امیر سر صادق محمد خان نے اپنی ذاتی رہائش کے لیے ذاتی دلچسپی لے کر بنوایا تھا -- مگر کیوں کر اس خوبصورت اور دیدہ زیب اور نایاب محل کو جو خون جگر اور مال کثیر سے بنا تھا سرکاری مہمان خانے میں تبدیل کر دیا گیا --!

ایک یہ انوکھی اور حیرت زدہ کر دینے والی حقیقی داستان ہے --!

نور محل کی یہ داستان انگلستان سے شروع ہوتی ہے اور نور محل میں آ کر اپنے انجام کو پہنچتی ہے --!

مجھے جو قدیم دستاویزی اور زبانی شواہد ملے، ان کی روشنی میں اس کہانی کو بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جو ایک دلچسپ تاریخی حقیقت بھی ہے --!

ریاست بہاول پور کی خصوصی سرکاری درخواست اس وقت کی ملکہ برطانیہ کوئین وکٹوریا الگزینڈرا (۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۱ء) جو ایمپریس آف انڈیا بھی تھیں کو دی گئی کہ نواب آف بہاول پور امیر صادق محمد خان، صبح صادق اعلیٰ روایتی اور فوجی تعلیم کی غرض سے انگلستان آنے کے خواہش مند ہیں اور ملکہ برطانیہ و ہند کے زیر سایہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں -- درخواست منظور ہو گئی --

دوران تعلیم و تربیت ان کا آنا جانا ملکہ وکٹوریہ کے محل اور سرکاری و نجی تقریبات میں معمول کی بات تھی -- کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ملکہ وکٹوریہ کی ایک حسین اور طرح دار کزن نواب صاحب پر دل ہار بیٹھیں اور نواب صبح صادق بھی جواباً ان کی محبت کے اسیر ہو گئے۔ بات شادی تک پہنچی اور پکی ہو گئی۔

نواب صبح صادق جب تعلیم اور فوجی تربیت مکمل کر چکے تو اپنے دیس بہاول پور کو اپنی نئی نویلی انگریز دلہن کے ساتھ سدھارے اور سیدھے اپنے شاہی گھر قلعہ دراوڑ پہنچے -- یاد رہے کہ نواب صاحب قلعہ دراوڑ میں ہی پیدا ہوئے تھے۔

وہ اپنی انگریز محبوبہ بیگم کی محبت کے انگلستان میں ہی والا و شیدا ہو چکے تھے۔ وہاں انگلستان میں ہی ان کو

خیال آیا کہ آخر وطن واپس جا کر بیگم صاحبہ کو کیا تحفہ پیش کروں کہ ان کا دل ایسا خوش ہو کہ وہ اس خوشی کو زندگی بھر بھلا نہ سکیں--!

کہتے ہیں کہ اُن صاحبہ سے شادی کے وقت جو سب سے اہم وعدہ ہوا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ یہاں انگلستان میں خاموشی کے ساتھ اسلام قبول کریں گی، جس کو انگلستان میں خفیہ رکھا جائے گا مگر ریاست میں جا کر اعلانیہ کر دیا جائے گا--خاتونِ معظم نے دل و جان سے سب تسلیم کیا جو ثابت کرتا تھا کہ وہ نواب صاحب سے قلبی محبت کرتی ہیں--انگلستان میں ان کو خود نواب صاحب نے کلمہ پڑھا اور اس کے بعد ان کا پیار کا نام "نور فاطمہ" رکھا--!

ہم نے تاریخ کو بہت کھنگالا کہ کہیں ان کا نام جو اصل تھا مل جائے مگر افسوس کہیں نہ مل سکا اور یہ بھی کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کی کس نسبت سے بہن تھیں، وہ بھی نہ مل سکا مگر ان کی تصاویر ضرور مل گئیں، وہ بھی ملکہ نور کے نام سے--غالباً اس زمانے میں نوابین کی بیگمات کے نام نہ تو تاریخ میں لکھے جاتے تھے اور نہ ہی زبان زدِ عام ہوتے تھے--یہی پردہ داری تھی کہ بہاول پور کے نوابوں کی ماؤں کے نام تاریخ میں کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ جو اس زمانے کے تاریخ نویس تھے، ان میں بھی اتنی جرات نہیں تھی کہ محل اور قلعہ دراوڑ کے زنان خانوں اور مہارانیوں کا نام بہ نام ذکر کر سکیں--مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نور فاطمہ اپنی انگلستانی شہریت اور انفرادیت کے سبب نور بیگم کے نام سے تاریخ میں اپنا نام رقم کر گئیں۔

چونکہ نواب صبح صادق، انگلستان میں ہی ان کے نام سے ایک محل ان کو ہبہ (تحفہ) کرنے کا ارادہ کر چکے تھے تو انھوں نے اس محل کی تعمیر کے لیے آرکیٹکٹ انجینئر ہن تن صاحب سے دوستی گانٹھی اور ان کو بھی انگلستان سے ساتھ لے کر آئے--ان کو زمین دکھائی، اپنا مدعا سمجھایا اور نور محل تعمیر کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔ مسٹر ہن تن نے نواب صاحب کی عین خواہش کے مطابق نور محل تین سال کی قلیل مدت میں تعمیر کر کے اُن کے حوالے کر دیا۔

نور محل کی تعمیر کے دوران نور بیگم، قلعہ دراوڑ میں ہی قیام پذیر رہیں--!

آخر وہ دن خدا خدا کر کے آیا کہ جس دن نور بیگم صاحبہ نے قلعہ دراوڑ سے اپنے ذاتی محل میں منتقل ہونا تھا--اس روز قلعہ دراوڑ سے نور محل تک پورے راستے کو دلھن کی طرح سجایا گیا۔ راستے کے دیہاتوں کے لوگ جگہ جگہ پھولوں کی پتیاں لے کر استقبال کو کھڑے ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے نواب صاحب کی انگریز زوجہ صاحبہ ملکہ برطانیہ و ہند کوئین وکٹوریہ کی بہن ہیں، جو اَب ان کی ریاست کی مہارانی ہیں۔

سینہ گزٹ خبر یہ ہے کہ نور محل کی اندر اور باہر سے اتنی سجاوٹ اور زیبائش کی گئی تھی کہ رہے نام اللہ کا--!

قلعہ دراوڑ کے اردگرد قدیمی مکین، اپنے دادا پڑدادا کی بیان کی گئی آنکھوں دیکھی کہانی بس اتنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ ایک تو نواب صاحب کی دلھن گوری اور انگریز، اوپر سے سونے پر سہاگہ یہ کہ اپنے ذاتی گھر یعنی نورمحل منتقل ہو رہی تھیں۔ یہ نوابوں کے خاندان میں پہلی بار ہو رہا تھا-- دوسرے جتنی خوبصورت نواب صاحب کی دلھن ہیں، اتنا ہی خوبصورت نورمحل ہے۔ سب کہتے تھے اور زبان زدعام تھا کہ ایسے حسین محل میں ایسی ہی حسین عورت کا راج ہونا چاہیے، پھر یہ کہ وہ ملکہ برطانیہ کی رشتے میں بہن ہوتی ہیں-- بس تعارف کو اتنا ہی کافی تھا--!

کہا جاتا ہے کہ اس روز قلعہ دراوڑ سے نورمحل تک عید سے زیادہ بڑے جشن کا سماں تھا--!

نوربیگم، نورمحل پہنچیں تو وہ بھی محل کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ نواب صاحب نے نشانی اور علامت کے طور پر بڑے اہتمام سے نورمحل کی چابیوں کا گچھا انہیں مالکن کے طور پر سونے کے طشت میں رکھ کر پیش کیا-- انھوں نے محل کی تمام کنجیاں بھی سونے کی بنوا کر پیش کی تھیں، جن کے پکڑنے والے سروں پر ہیرے جواہرات جڑاؤ تھے--!

نورمحل میں نوربیگم کی پہلی شام بہت خوبصورت گذری: ایک ایک در و بام نواب صاحب نے خود ساتھ چل کر دکھایا۔ نورمحل، نوربیگم کو واقعی بہت پسند آیا-- انھوں نے کہا کہ ایسا حسین اور لاجواب محل تو ڈیوک آف انگلینڈ کا بھی نہیں ہے-- نواب صاحب نے جواباً کہا، مائی ڈیئر لوونگ نور، یہ محل آج سے تمہاری ملکیت ہے، میں تمہیں اس محل کو تمہاری محبت کے لیے ادنیٰ سے تحفے کے طور پر پیش کرتا ہوں--!

رات کو پھر نواب صاحب نے باہر لان میں کھڑے ہو کر نورمحل دوبارہ نوربیگم کو دکھایا۔ وہ روشنیوں میں بقعہ نور بنا ہوا تھا-- نوربیگم نے اپنے طریقے سے نواب صاحب کو اس عنایت کا خراج تحسین پیش کیا۔

وہ رات انھوں نے محل میں ایک نئی نویلی دلھن کی طرح گذاری-- کہ جو ناز اور نخرے سے آراستہ پیراستہ تھی--!

نوربیگم نے نورمحل کے اوپر والے کمرے میں اس رات کو شب زفاف کی طرح بسر کیا--!

صبح نہا دھو، سج بن کر جب اپنے بالائی کمرے کے برآمدے میں آئیں تو بے اختیار کنیزوں، باندیوں سے محل اور محل میں گذری رات کی تعریف کرتے کرتے ان کی نظر دور بہت دور، سرسبز درختوں کی اُوٹ میں پوشیدہ کسی جگہ پر پڑی۔

پوچھا-- "یہ درختوں کی چھدری اُوٹ میں کیا جگہ ہے جو اُجڑی سی نظر آتی ہے--"

باندی نے ہاتھ باندھ کر ادب سے عرض کیا-- "مہارانی صاحبہ، یہ قبرستان ہے--"

یہ سننا تھا کہ مہارانی نور بیگم کے ناگواری سے تیور بدلے۔ بڑے سخت لہجے میں حکم دیا کہ فوراً نواب صاحب کو یہاں بلایا جائے۔ اُن سے آتے ہی تیوری چڑھا کر سوال کیا۔

"--کیا یہ سچ ہے کہ ہماری خواب گاہ کے عین سامنے قبرستان ہے--؟"

نواب صاحب بھی نور بیگم کے نخرے اور چڑھی تیوری کے ناگوار بل سے آشنا تھے۔ اپنے نرم گفتار لب و لہجے سے بات کو درگذر کرنے لگے۔

"--نور بیگم--وہ تو بہت دور، درختوں کی اوٹ میں ہے، اس سے آپ کا کیا سروکار--جانے دیجیے، درگذر کیجیے--" یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ آپ کی خواہش پر قبرستان اکھڑوا دیتا ہوں!

بس، اتنی سی بات پر بگڑ گئیں--نازک مزاجی کا ٹھونگا، ناک کے آگے سے گذرا کیوں--سب بگڑ گیا اور نور محل کی مالکہ کہ جن کے لیے یہ محل بنایا گیا تھا، سنوارا گیا تھا اور سجایا گیا تھا، خاک میں مل گیا۔

"--ہم اس محل میں اب ایک پل نہیں رہ سکتے، قبرستان کے ویرانے کے سامنے ہمیں لا کر ڈال دیا گیا ہے--ہم ابھی، اسی وقت اس محل سے جانا چاہتے ہیں--آپ اپنا تحفہ اپنے پاس رکھیے--سواری کا بندوبست کیا جائے--ہم قلعہ دراوڑ واپس جائیں گے--"

نور بیگم نے نور محل سے اظہار نفرت کر دیا تھا--!

نواب صبح صادق کو یہ سن کر سکتا سا ہو گیا--وہ نور بیگم کے آگے بے بس ہو گئے۔ آخر وہ ملکہ برطانیہ ہر ہائنس وکٹوریہ کی بہن تھیں--!

وہ کس طرح ملکہ ہندوستان اور ان کی ہمشیرہ کو ناراض کر سکتے تھے۔ سو یقیناً خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے ہوں گے۔

بس، اسی دن سے نور محل، ریاست بہاولپور کے سرکاری مہمان خانے میں تبدیل کر دیا گیا--!

کہتے ہیں کہ نور محل سے نور بیگم کو اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ پھر اُن کے جیتے جی قلعہ دراوڑ میں کسی نے ان کے سامنے کبھی دوبارہ نور محل کا نام تک نہ لیا--!

باب ۱۱

عجیب ڈھنگ ہیں، فطرت کے
اعلیٰ لباس خُون کی غلاظت نہیں بدل سکتا۔۔!

ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔

"۔۔خواتین و حضرات، نور محل کے آفیسرز کنوپی میس میں لنچ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔۔باقی نور محل کا دیدار کھانے کے بعد فرما لیجئے گا۔۔"

مگر میں ابھی تک اس محبت اور نفرت کے ادھیڑبُن میں الجھا ہوا تھا۔۔کبھی نور محل پیدا کرنے کے لیے گناہ اور ثواب کے حساب کتاب سے نسل بدلنے میں الجھی ہوتی تھی۔نور بیگم، نور محل کی محبت کو نفرت میں بدلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔جب کہ میں نور محل کے در و دیوار سے آنے والی الفت اور پیار کی خوشبوؤں کو بہت آسانی سے محسوس کر رہا تھا۔۔!

سوچ رہا تھا، عجیب گورکھ دھندا ہوتا ہے محبتوں کے کھیل میں۔۔ایک سمجھتا ہے کہ لو جی بازی جیت لی، دوسرا مسکراتا ہے کہ اس نے اس کو محبت کی بازی جتوا کر ہمیشہ کے لیے ہرا دیا۔۔ہارنے والا خوش ہے کہ میں ہار تو گیا ہوں مگر جیتنے والا کبھی خوش نہ رہ سکے گا۔اُدھر جیتنے والا سمجھتا ہے کہ میری جیت سے سامنے والا صدمے کی تاب نہ لا کر مر

ہی جائے گا-- تیسرا اس محبت کی ہار جیت کے کھیل کو دور سے دیکھ کر اندازہ قائم کرتا ہے کہ ہارنے والا جیت گیا ہے اور جیتنے والا ہمیشہ کے لیے ہار گیا ہے-- مگر میں کہتا ہوں کہ نہ کوئی جیتا ہے اور نہ کوئی ہارا ہے، بس جو خوش ہے، وہ جی گیا ہے اور جو اس کھیل میں دکھی ہوا ہے، اصل میں مر گیا ہے-- مگر میں بھی غلط ہوں، اصل میں قدرت دونوں کا اپنی اپنی جگہ کڑا امتحان لے رہی ہے۔ جو اس وقت قدرت کی محبت کے دائرے میں جیتے گا، وہی دائم ہوگا اور جو ہار جائے گا، فنا ہو جائے گا-- جو محبت میں فنا ہوگا، وہ امر ہو سکتا ہے اور جو بظاہر فنا نہیں ہوگا وہ موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے--!!!

اصل میں کون جیت گیا اور کون ہار گیا، کسی کو معلوم نہیں ہے--!

نور بیگم جیتیں یا پھی، کچھ معلوم نہیں، نواب صاحب ہارے یا جیت گئے، کچھ معلوم نہیں--!

نور محل آج تک سلامت ہے اور نور بیگم بھی کی خاک کا پیوند ہو چکیں، مگر بات رہ گئی، وہ نہ مری-- نواب صبح صادق بھی دراوڑ کے شاہی قبرستان میں جا کر اپنے وقت پر سو گئے، مگر تاریخ میں لکھ گئے کہ محبت انمول، بے لوث، دائمی ہوتی ہے--!

اب آپ ہی بتایئے کون جیتا اور کون ہار گیا--؟

نور محل کی آفیسرز کنو پی میس میں داخل ہوتے ہی احساس ہوا کہ ہم لوگ کسی شادی کے شاہی مہمان ہیں، جو بارات آنے سے پہلے ہی شادی ہال میں آ کر پسر گئے ہیں-- یا پھر صبح کے ناشتے کا بہترین ازالہ ہے جو ہم نے صحت مند اور بلی کے برابر چوہوں کے ساتھ کیا تھا-- خرم شکیب صبح کے ناشتے کی خفت میں ابھی تک جلاتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا، جو کہ بالکل درست تھا کہ جیسا علاقہ ہوتا ہے، جیسے لوگ ہوتے ہیں اور جو ان کا معیار زندگی ہوتا ہے، وہی وہاں کے بازاروں، دکانوں گھروں میں ملتا ہے اور نظر آتا ہے۔ تہذیب، شائستگی اور پاکیزگی کا تعلق مقامی لوگوں کے رہن سہن اور بود و باش اور طرز حیات کا آئینہ دار ہوتا ہے-- سو میں صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ اس میں کمپنی اور خرم شکیب کا ہرگز کوئی قصور نہیں تھا-- وہ سب تو اس تہذیب کا عکس تھا کہ جس میں وہ لوگ مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہے تھے، جو ہمارے نزدیک تہذیب یافتہ معاشرے کی روز مرہ زندگی ہرگز نہیں تھی-- حقیقتاً ان کو احساس ہی نہیں تھا کہ بہ طور انسان اس طرح کا طرز حیات ان ہوٹلوں اور دکانوں میں آنے والوں کا اپنا رویہ تھا؛ جب کہ ہم لوگ اس کے عادی نہیں تھے-- جیسے لوگ ہوتے ہیں، وہی اُن کا رہن سہن ہوتا ہے، جس علاقے کے جیسے لوگوں میں

جو تہذیب اور معاشرت کی سطح ہوتی ہے، وہی ان کے اردگرد میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کردار کے خود آئینہ دار ہوتے ہیں اور اسی بے حسی پر مبنی سماجی رویوں سے ان کے عمومی ذاتی کردار تشکیل پاتے ہیں۔ جس سے قوموں کی ترقی اور تنزلی کے مقام کا تعین ہوتا ہے--دنیا میں وہی قومیں، عالمی حکمرانی کرتی ہیں کہ جن کے معاشروں میں تہذیب، ترتیب اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے اور جن قوموں میں یہ عناصر نہیں ہوتے، ان پر اُن کی حکمرانی ہوتی ہے--جانوروں کا گلہ چرواہے کے زیرِ تسلیں ہوتا ہے، جو جانور گلے کا قانون توڑتا ہے اس کو بید سے مارا جاتا ہے--!

ہم ایسے ہی معاشرے کو دیکھ کر آئے تھے--موجودہ دور میں ان اقدار کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ معلوم ہو سکے کہ موجودہ پاکستانی معاشرے میں بے حسی اور غلاظت اپنا کردار کیسے اور کس طرح ادا کر رہی ہے--یہی وہ اسی فیصد لوگ ہیں کہ جو پاکستان کو گندہ کرتے ہیں اور ان کو کوئی شرمندگی اور احساس جرم نہیں ہے--یہی وہ لوگ ہیں جو پاکیزہ پانی کے چشموں میں بچوں کو پیشاب کراتے ہیں--یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے پاکیزہ پانیوں کی جھیلوں میں غلاظت اور کچرا بھر دیا ہے--میں صاف کہوں گا کہ پاکستان گندہ نہیں ہے بلکہ یہ اسی فیصد لوگ بیمار ذہنیت کے مریض ہیں--جو اپنے جیسے بیمار ذہن سیاست دان منتخب کرتے ہیں تاکہ ذہنی بیماریوں کا تسلسل آسانی سے جاری رہ سکے۔ کیونکہ وہ ذہنی بیمار، ذہنی صحت مند لوگوں میں زندہ نہیں رہ سکتے--سوچیے کہ گندگی کے کیڑے، صاف ستھرے ماحول میں کیوں کر زندہ رہ سکتے ہیں--!!!

خوبصورتی، صفائی، رکھ رکھاؤ، نفاست، تہذیب اور پاکیزگی کے نازک احساسات کو آفیسرز میس میں سکون میسر آیا۔

صوفوں پر بیٹھتے ہی ایک باوردی بیرے نے آ کر لونڈر کے ایئر فریشنر کا سپرے کیا، جس سے ماحول میں تازگی کا احساس جاگا--!

لگتا تھا کہ دوپہر کا کھانا، ہم تھکے ماندے سیاحوں کو صوفوں کے سامنے رکھی، کشادہ اور نفیس میزوں پر ہی سرو کیا جائے گا اور ہوا بھی ایسے ہی--!

سب سے پہلے وافر مقدار میں کراکری کی آمد باوردی ویٹرز کے ساتھ شروع ہوئی--یہی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور تقاضا تھا--

ایک ویسا ہی بیمار ذہن کردار اپنے ہم مزاج ساتھیوں کے ساتھ ہمارے سیاحتی گروپ میں بھی موجود تھا--بولا--"بھانڈے ٹینڈے لائے جاندے او--کج منہ وچ پان لئی وی لیاؤ--"

بڑے اہتمام سے سب سے پہلے اعلیٰ قسم کے خوشبودار ٹشو پیپرز کے پیکس لاکر میزوں پر رکھے گئے بلکہ سجائے گئے--پھر کھانے کے لیے شاندار اور خشک کراکری لاکر ہر مہمان کے سامنے رکھی گئی--برتن رکھنے والے ویٹرز نے ہاتھوں پر سفید اور بے داغ دستانے پہن رکھے تھے--آخر میں ایک اور ویٹر نے ہر فرد کے سامنے چمچے، چھریاں کانٹے بڑی ترتیب سے سجا کر رکھے--

اب کھانا سرو ہونے کی باری تھی--دیکھنا یہ تھا کہ کیا کھانا لگایا جاتا ہے اور اس کا ذائقہ اور خوشبو کیسی ہوتی ہے-

ایک بڑے سے خوان سینی میں ایک ویٹر چکن بریانی کی ڈشز لایا اور لاکر میزوں کے عین درمیان میں خالی جگہوں پر رکھیں--بریانی کی شکل بھی اچھی تھی اور خوشبو بھی لاجواب تھی--دوسرے ویٹروں کی جوڑی نے رائتے کے ڈونگے لاکر رکھے اور اسی طرح تیسرے ویٹرز کی جوڑی نے سلاد لا کر دیا--اور آخر میں حسب انفرادی خواہش کولڈ ڈرنک دیئے گئے۔اس اہتمام نے بھوک کو بھڑکا دیا اور کام و دہن نے پورا پورا انصاف کرنے کا موقع فراہم کیا--بریانی خوش ذائقہ تھی--دل خوش ہو گیا--!

کھانا اپنے اختتام کو پہنچا تو کسی نے ان ہی پیار زادوں سے پوچھا--

''--کھانا کیسا تھا--؟''

تو انھوں نے ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے دیکھا، بھونڈا سا قہقہہ لگایا اور ایک صاحب بولے۔

''--خاک مزا آیا--مکھیاں تو ہیں ہی نہیں یہاں--مکھیاں ہوتیں تو کھانے کا مزا آ جاتا--''

مشہور ہے کہ سفر وسیلہ ظفر ہوا کرتا ہے--اس سفر میں بھی ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا تھا اور ابھی تو سفر کا ''پیک ٹائم'' شروع ہونا تھا جو چولستان کے صحراؤں، چولستان کی مشہور زمانہ کار ریلی اور سب سے اہم قلعہ دراوڑ اور اس کے گردونواح کی سیاحت پر مبنی تھا--!

مگر میرا شعور ان لوگوں کی سوچ کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ جو صرف اس لیے کھانے کا مزا نہ لے سکے کہ ان کے گرد مکھیاں نہیں بھنبھنا رہی تھیں--!

مجھے اس موقع پر ایک بہت تاریخی واقعہ یاد آیا--میں نے لاکھ سوچا کہ اس واقعے کو اس سفرنامے میں لکھوں یا نہ لکھوں--مگر دل و دماغ نے کہا--سلمان باقر، لکھ دے کہ عین حالات اور لوگوں کی سوچ کے مطابق ہے،

پھر موقع ملے یا نہ ملے--!

اردو ادب کے ایک صاحب طرز ہوا کرتے تھے، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد؛ ان کی ایک کتاب "دربار اکبری" ہے کہ جو میرے نزدیک تاریخ سے زیادہ تاریخی ناول ہے۔ اس میں ہمارے ان خطوں کے لوگوں کے حالات اور رویئے بڑے خوب صورت انداز میں لکھے اور بیان کئے گئے ہیں-- ان ہی میں سے ایک سچا واقعہ جو اس وقت عین حسب حال ہے، بیان کرتا ہوں۔

بادشاہ ہندوستان جلال الدین محمد اکبر اپنے مصاحبوں اور نورتنوں کے ساتھ کسی بازار سے شاہی ہاتھیوں پر بیٹھے گذرتے تھے-- بادشاہ اکبر کے ساتھ اس کے نورتنوں میں سے ایک مظہر خان خاناں بھی شاہی ہاتھی کی ہودی میں اکبر شہنشاہ کے ہمراہ تھے کہ بازار سے گذرتے، شہر کے لوگ، دستور زمانہ کے مطابق سڑک کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ بادشاہ ہندوستان "فل پروٹوکول" کے ساتھ گذر رہے تھے کہ جیسا کہ آج کے بادشاہ سڑک پر چلتے ہیں۔

اسی دوران شہنشاہ ہندوستان کی نگاہ ایک ایسی حسین لڑکی پر جا کر ٹھہری کہ بادشاہ اکبر اس کے حسن و جمال سے بے اختیار گھائل ہو گیا-- اس نے اپنے افسر کار خاص بہ کار سرکار کو نگہ بھر کر دیکھا اور ساتھ ہی آنکھیں چار ہوتے ہی دوسری نگاہ حسینہ مہ جبیناں پر کی-- افسر کار خاص بہ کار سرکار فوراً مطلب سمجھ گیا کہ جیسا کہ اس عہدے کے افسر آنکھ کا اشارہ سمجھ جایا کرتے ہیں۔

شام کو بادشاہ اکبر نے اپنے افسر کار خاص کو طلب کیا اور پوچھا کیا بنا--؟

افسر نے بتایا کہ حضور کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ لڑکی کے گھر کائیاں مشاطائیں لے کر پہنچا-- لڑکی غریب گھرانے کی تھی مگر گدڑی میں یقیناً لعل تھی-- اس کے باپ، ماں اور ماموں چاچوں کو سمجھایا کہ حضور والا نے اس کو اعلیٰ مقام دہلی کے محل خاص کے حرم سرا میں دینے کا ارادہ فرمایا ہے-- یہ رہا انعام و اکرام، مال و زر، اشرفیوں کے توڑے، زمین اور مکان جو تم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے اور صدیوں محنت مزدوری کر و تو پا نہیں سکتے۔ شہنشاہ حضور کی نگاہ کرم کے صدقے تم مالا مال ہو گئے ہو اور لڑکی جو گودڑ میں لپٹی ہوئی ہے، مہارانی بن کر راج کرے گی۔ یہ بات اور مال لڑکی کے گھر والوں کو پسند آ گیا اور حضور والا، اس وقت وہ لڑکی حرم سرا میں مشاطاؤں کے پاس ہے، وہ اسے نہلا دھلا کر، عود و عنبر کی دھونی میں بسا کر، عرق گلاب میں تر بہ تر کر کے پوشاک شاہی پہنا رہی ہیں-- مولوی صاحب کو بھی پیغام بھیج دیا ہے کہ رات کو بعد از عشاء نکاح مسنونہ کا انعقاد شاہی ہے، بر وقت تشریف لے

آئیں ۔۔۔ یہ موجودہ صورت حال ہے، کوئی اور حکم ہے تو بجا لانے کو بندہ غلام حاضر خدمت ہے ۔۔۔!

نگینہ گوہر آب دار اور اچھوتا تھا ۔۔۔ طرح داری میں اس شب اول میں اس نایاب حسینہ نے اکبر بادشاہ کا دل جیت لیا۔ بادشاہ نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس حسین کنول کو حرم سرا میں اونچے مقام پر رکھوں گا کہ عورت کے اعلیٰ ہم بستری کے اوصاف حمیدہ سے لڑکی مالا مال ہے ۔۔۔!

اگلی شام مشاطۂ حرم نے شہنشاہ اکبر سے ملنے کی درخواست کی اور بتایا کہ عجیب لڑکی ہے، کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں ہے ۔۔۔ نہ صبح کا ناشتہ کیا، نہ دوپہر کا ماحضر تناول کیا اور نہ ہی شب کا کھانا کھایا ہے۔ لاکھ کہو، سمجھاؤ بجھاؤ، مجال ہے کہ ایک نوالہ بھی توڑ کر منہ میں ڈالا ہو ۔۔۔ میں بہت پریشان ہوں، اس لیے حضور کو خود خبر دی ہے۔

بادشاہ نے کہا، اچھا، ہم رات کو خود خواب گاہ میں دیکھتے ہیں سارا معاملہ ۔۔۔ تم وہاں کھانے پینے کی اشیاء رکھو دینا ۔۔۔!

شہنشاہ نے رات کو بہت حیلے بہانے سے کوشش کی کہ کچھ کھا پی لے، مگر دودھ اور پانی کے سوا اس نے کچھ بھی حلق سے نہ اتارا ۔۔۔ مگر جب جوشِ شب میں آئی تو ایسی اداؤں سے آئی کہ بادشاہ کا دل موہ لیا مگر بے ہوش ہو گئی ۔۔۔ جس کی وجہ شاہی حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر نقاہت اور کمزوریٔ بدن بتائی۔

یوں تیسرا دن آ گیا ۔۔۔ لڑکی نے کچھ نہ کھایا اور بھوک سے غش پہ غش کھاتی تھی ۔۔۔ اکبر بادشاہ نے اپنے عالی دماغ نو رتنوں کو طلب کیا اور میٹنگ میں یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا کہ لڑکی بھوک سے مر جائے گی، لاکھ جتن اور کوششیں کر لی ہیں مگر مجال ہے کہ ایک نوالہ بھی حلق سے اتارا ہو ۔۔۔!

میرزا مظہر خان خاناں بے اختیار مسکرائے۔

اکبر نے خان خاناں کو دیکھا اور پوچھا ۔۔۔ جناب کیوں مسکراتے ہیں ۔۔۔ کیا مسئلے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں ۔۔۔؟

مظہر خان خاناں پھر مسکرائے اور کہا یقین تو یہی ہے، مگر ذرا تخلیے میں حضور سے بات کرنے کا خواہش مند ہوں۔

تخلیہ یعنی "پرائی ویسی" کا نقارہ بجا دیا گیا۔ جیسا کہ آج کل پرائی ویسی کی بات ہو تو دبئی یا لندن جا کر کی جاتی ہے ۔۔۔!

مگر بادشاہ اکبر نہ دبئی گیا نہ لندن، بس کمرہ خالی کرا لیا ۔۔۔!

غالباً بادشاہ اکبر کو لندن دہی کا پتہ ہی نہیں تھا-- بے چارہ--!!!

پوچھا-- ہاں، اب بتاؤ-- کیا ماجرا لگتا ہے--؟

خانِ خاناں نے کہا-- حضور کو اگر ناگوار خاطر نہ گذرے تو ایسا کریں کہ اس لڑکی کو ایک ایسے کمرے میں بند کر دیں کہ جس میں ایک روشن دان ہو اور کمرہ دیگر لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ ہو کہ لڑکی یہ محسوس کرے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا اور نہ ہی دیکھ سکتا ہے-- پھر اس کو کمرے میں بند کرنے سے پہلے کمرے میں چراغ روشن کر دیں۔اور اس کے وہ کپڑے اور لباس جو وہ پہن کر اپنے گھر سے آئی تھی، اس لباس کو ایک کونے میں زمین پر ڈال دیں--

اکبر بولے لباس بوسیدہ کو زمین پر کیوں ڈالیں، اگنی پر نہ لٹکا دیں--؟

خانِ خاناں نے مسکرا کر عرض کیا-- نہیں-- جو میں نے تجویز دی ہے، اس پر عمل کیا جائے تو خاطر خواہ نتیجہ آنے کی امید ہے۔

پھر ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھ کر اس پر پیالہ یا سکورا رکھ دیں-- لڑکی کو اندر داخل کر دیں-- اور ہم دونوں باقی منظر روشن دان میں بیٹھ کر دیکھیں گے--!

شہنشاہ اکبر تجویز سن کر بہت ہنسے-- پھر فرمانے لگے-- عمل درآمد کر دیا جائے--

وہ جا کر روشن دان میں بیٹھ گئے-- لڑکی سہمی ہوئی اندر آئی-- دروازہ بند کر دیا گیا-- وہ سہم کر ایک کونے میں دبک گئی-- پھر یکا یک اس کی نگاہ اپنے پرانے اور اصل کپڑوں پر پڑی-- اس نے اپنے کپڑے اٹھا کر غور سے دیکھے-- سینے سے چمٹا لئے-- اپنی شاہی پوشاک اتار کر اسی کونے میں بے دردی سے پھینکی کہ بادشاہ کو سخت ناگوار خاطر گذرا-- خانِ خاناں فقط مسکرائے اور بادشاہ چپ رہے--!

جب اس اُوڈنی، نیچ ذات کو پورا یقین ہو گیا کہ وہاں اس کے سوا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس نے شاہی لباس اُتار کر پرے پھینکا اور ننگے بدن دو چار انگڑائیاں حشل کتیا کے لیں-- پھر بڑی چاہ سے اپنے گوڈڑ کپڑے پہن لیے اور زمین پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ کر سکون سے مسکرانے لگی-- پھر یکا یک اس کی نظر پانی کے مٹکے پر پڑی۔ لپک کر گئی اور وہیں زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی اور سیر ہو کر پانی پیا-- پھر بلاوجہ سر کھجانے لگی اور سر میں سے جھوٹ موٹ کی جوئیں نکال کر بے دردی سے مارنے لگی-- اسی دوران کبھی اپنا گھاگرا اٹھا کر اپنی پنڈلی ننگی کر کے کھجاتی اور کبھی بغلوں اور نازک جگہوں کو سہلاتی-- اور کچھ بے چین سی نظروں سے کمرے میں بے قراری سے دیکھتی--!

اُوڈنی کی یہ حالت دیکھ کر خانِ خاناں نے بادشاہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"--حضور، چوب دار سے کہیں کہ چند روٹیاں، اچار اور ثابت پیاز دروازے کے برابر سوراخ سے یونہی بلا کسی برتن میں رکھے، چپکے سے اندر کھسکا دے--" حکم کی تعمیل کر دی گئی۔

کیا دیکھتے ہیں کہ اوڈنی حسینہ روٹیاں، اچار، پیاز فرشِ زمین پر مٹی میں لتھڑا پا کر بُری طرح چونکی--کان کھڑے ہوئے، اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی آس پاس دیکھنے والا تو نہیں۔ سکوت اور تنہائی پا کر ہرنی کی سی بجلی کے ساتھ اٹھی--یہ کھانا دیکھ کر بے اختیار مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی کہ جو بادشاہ تین راتوں میں نہ دیکھ سکا تھا۔

وہیں گھاگرا رانوں تک کھسکایا اور چوکڑی مار کر بیٹھ گئی--ایک ہتھیلی پر روٹی اچار رکھا، ثابت پیاز کو زمین پر رکھ کر اپنی ایڑی مار کر پھوڑا--پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھا پی کر دو چار ڈکار بآوازِ بلند خارج کیے--اٹھ کر میلے گھڑے سے خوب پانی پیا--پھر جا کر ایک دیوار کے ساتھ ٹانگیں کھول، ہاتھ چوپٹ گہری نیند سو گئی--مگر سونے سے پہلے دو چار دھماکے دار گوز خارج کیے--!

بادشاہ اکبر کی برداشت اس کریہہ منظر کو دیکھ کر متلانے لگی--مظہر خانِ خاناں نے اشارہ دیا کہ آیئے چلتے ہیں۔

اکبر بادشاہ گم سم آئے اور آتے ہی سوال کیا--"یہ کیا تھا صاحب--ہم نے تو اس کم بخت کو عزت بخشی تھی--مگر لگتا ہے، وہ راس نہیں آئی--"

"--حضور والا، وہ کم نسل اور کم ذات ہے، اندر کی غلاظت بھلا کیسے چھپاتی--آپ نے اس کو مکھیوں والی روڑی سے اٹھا کر محل میں ڈال دیا--وہاں اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کو اسی غلاظت کی طلب تھی کہ جو اس کی سرشت میں تھی--بھلا اسے کس طرح بھوک لگتی اور کھانا ہضم ہوتا--صاحب ذات کا نیچ، نیچ ہی رہتا ہے، اعلیٰ کپڑے پہننے اور دولت آنے سے اس کی فطرت نہیں بدلتی--!

میں سوچ رہا تھا--!

وہی ایک جملہ کہ جس پر وہ قہقہے لگا رہے تھے۔

"--کھانے کا خاک مزا آتا--مکھیاں تو کھانے پر بھنبھنا ہی نہیں رہی تھیں--مکھیاں ہوتیں تو کھانے کا مزا آ جاتا--"!!!

باب ۱۲

کالے ہرن، سنہری ہرنیاں، لال سُوہانڑا غزال آنکھیں، سی مرغ اور گُربہ ہائے دشتی

استقبالیہ کی اسی میز سے سوغات اور نور محل کی نشانی کے طور پر، بہ طور امداد برائے نور محل دو عدد کی چمچ فی عدد بحساب سو روپے مبلغ اور ایک مگ جس پر نور محل کی رات کے چراغاں کی تصویر چھپی ہوئی تھی، دو سو روپے میں لیا! تا کہ عزیزوں دوستوں کو اس میں پانی یا چائے پی کر یہ جتایا جا سکے کہ ہم نے نور محل دیکھا ہوا ہے--- ایک جوان سے پوچھا کہ کیا نور محل کی طرح صادق محل کی زیارت ہو سکتی ہے--- بڑی سختی سے جواب ملا، وہ عوام یعنی ہم جیسے معمولی لوگوں کے دیدار کو بند ہے---!

اب خبر یہ گرم تھی کہ آپ لوگوں کو ہوٹل میں برائے استراحت و آرام منتقل کیا جاتا ہے--- بہاولپور میں ایک بڑا مشہور چوک "ویلکم چوک" کے نام سے ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے دائیں بائیں سے جو ذیلی سڑکیں نکلتی ہیں، وہ بھی ویلکم اسٹریٹ نمبر فلاں فلاں کہلاتی ہیں۔

ہم ایک "خوش آمدید" سڑک پر آئے--- "ڈائمنڈ ہوٹل" والے استقبال کو موجود تھے--- اللہ بھلا کرے خرم شکیب کا، اس نے پہلی منزل کی سیڑھیوں کے سامنے والے کشادہ کمرے کا دروازہ کھولا اور اس کمرے کو ہم

چاروں کے حوالے کر دیا۔

ہمارے ایک ہم سفر بڑی پریشانی اور فکرمندی کے عالم میں بولے۔

"--جہاں تک میں نے سن رکھا ہے، یہ ڈائمنڈ مارکیٹ اور ڈائمنڈ ہوٹل کچھ ٹھیک قسم کے نہیں ہوتے، پر یہ کچھ ٹھیک ہی نظر آتا ہے، پھر بھی اللہ خیر کرے--"

وجدان نے بھی یہ زیرلب جملہ سن لیا تھا--پلٹ کر بولا۔

"--مجھے تو یہ ہوٹل کسی طرف سے بھی ڈائمنڈ یا ڈائمنڈ ٹائپ کا نظر نہیں آتا--"

حیدر نے چمک کر کہا۔

"--بھائی صاحب، پھر آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ڈائمنڈ ہوتا کیا ہے--" سب نے گھور کر حیدر کو دیکھا۔

عمر فرحان بھی کسی سے کم نہیں تھا، بولا--"مجھے سب پتہ ہے پر میں بتاؤں گا نہیں--"!!!

"--اور مجھے تو فوراً چائے پینی ہے--" میں بولا۔

"--اور ہم سب نے ٹھنڈے پانی سے نہانا ہے، بہت شدید گرمی ہے یہاں پر--" وجدان بولا۔

"--میرے پیارے پیارے بچو، یہ تو کچھ بھی نہیں، جو گرمی تمہیں چولستان کے صحرا میں ملے گی، وہ ماہ فروری میں لاہور کے مئی جون کی یاد دلا دے گی--"

"--اب کیا پروگرام ہے، ان لوگوں کا، ساڑھے تین بج رہے ہیں، دوپہر کے--" وجدان بولا۔

"--ہم تو نہاتے ہیں، جو ہوگا پروگرام خود آ کر بتا دیں گے--" حیدر نے کہا اور تولیہ کندھے پر ڈال، غسل خانے کو پیارا ہو گیا۔

ابھی بچوں نے نہا دھو کر کنگھی پٹی بھی نہ کی تھی کہ کرامت علی صاحب آ گئے۔

"--آغا صاحب--بس پندرہ منٹ میں تیار ہو کر نیچے کوچ میں آ جائیں--ہم لال سوہانرا دن دن میں پہنچنا چاہتے ہیں--چولستان کے نایاب کالے ہرن آپ لوگوں سے ملنے اور معانقہ کرنے کے منتظر ہیں--شام ہو گئی اور اندھیرا ہونے لگا تو وہ اپنی اپنی سنہری ہرنیوں کے ساتھ سونے چلے جائیں گے--بس جلدی سے آ جائیں، وقت نہیں ہے--" یہ کہہ کر کرامت علی اگلے کمروں کے دروازے کھٹکھٹانے میں مصروف ہو گیا--!

کوچ سیاحوں کو لے کر تیر کی طرح ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے نکلی--

ہر کوئی لال سوہانرا کو پارک کہہ رہا تھا، سب کا خیال تھا کہ یہ بالکل ویسا ہی پارک ہوگا کہ جیسے گلشن اقبال

پارک، کراچی کا الہ دین پارک یا اپنے لاہور کا منٹو پارک-- ہم نے اسی میں بہتری دیکھی کہ کوئی تفصیل بیان نہ کی جائے، اسی میں بھلائی ہے۔ ایک نوجوان سے نہ رہا گیا-- بولے۔

"--کمال ہے، شہر سے دس کلومیٹر باہر نکل آئے ہیں، آپ کا پارک ہی نہیں آ رہا--"

ایک اور صاحب نے جل کر لقمہ دیا۔

"--اگر پارکوں میں ہی ہرن دکھانے تھے تو اپنے لاہور کے چڑیا گھر میں بھی اچھے بھلے ہرن لوگ تھے، وہیں دکھا دیتے! اتنا خوار کیوں کرایا ہے--"

"--چلو یار-- پارک میں چل کر چائے پانی پئیں گے، جو لوگ اپنے آپ کو بچوں میں شمار کرتے ہیں، وہ جا کر ہرنوں کو کالے چنے، اپنی ہتھیلیوں میں کھلا کر خوش ہو لیں گے-- ہم تو ٹانگیں لمبی کر کے ٹھنڈی ٹھنڈی پیپسیاں پئیں گے-- یہاں اتنی گرمی ہے تو پتہ نہیں چولستان صحرا میں کیسی آگ ہوگی--"

"--او بھائی خرم شہزادے، پارک کب پہنچو گے-- ذرا اے سی تو تیز کر دینا--"

کسی منچلے نے ڈرائیور کو آواز لگائی-- چلیئے اس بہانے ہمیں ڈرائیور صاحب کا نام معلوم ہو گیا-- ڈرائیور نے گھور کر بیک مرر سے پیچھے نگاہ ڈالی اور اے سی آف کر دیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ بولا-- بس، اتنی سی بات کو منچلے سمجھ گئے اور معافیوں پر آ گئے، تب اے سی چلا، مگر اتنی دیر میں سب کا حشر ہو گیا-- خرم شکیب نے خشمگیں نظروں سے پلٹ کر دیکھا تو منچلوں نے نظریں چرالیں--!

استاد خرم پورے جوش اور جذبے کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا-- کوئی زیر لب آہستہ سے بولا۔

"--لگتا ہے یہ ڈرائیور چنگ چی، چاند گاڑی چلاتے چلاتے کوچ چلانے لگ گیا ہے--"

شکر ہے کہ یہ فقرہ خرم استاد نے نہیں سنا-- ورنہ فساد ضرور ہو جاتا--!

اللہ جانے یہ استاد خرم سے چہلیں تھیں یا کوئی پُرخاش-- یا پھر اُن دنوں فطرت بول رہی تھی-- مگر کچھ تھا کہ جس کی پردہ داری تھی۔ حالانکہ استاد خرم ایک کم گو اور بااخلاق انسان تھا۔ مجھ سے جو اس سفر میں اس نے اب تک بات کی تھی وہ انتہائی سلجھے ہوئے لب و لہجے میں تھی-- ان کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا-- اعتراض اور ناگوار خاطر یہ تھا-- کہ وہ گاڑی کے ڈیک پر ایسی منقبتیں اور قوالیاں کیوں لگاتا ہے کہ جن میں تواتر کے ساتھ ملنگوں کی فطری پسند پائی جاتی ہے-- انڈین راک اور چنچل گانے کیوں نہیں لگاتا کہ جن میں جنسی برانگیختگی کے استعارے موجود ہوتے ہیں--!!!

جب بھی جملوں اور فقروں کی یکا یک تیز ہوا چلتی تو بلا مبالغہ ایسا لگتا کہ اکیلی رضیہ یا معصوم سی صفیہ، غنڈوں میں پھنس گئی ہے---!

لال سوہانرا ایک علاقائی قدیم گاؤں کا نام ہے، جو چولستان صحرا کے بالکل کنارے اور صحرا کے آغاز میں ایک قدرتی جنگل اور نہر کے ساتھ ہے--- جو سڑک بہاول پور سے بہاول نگر جاتی ہے، یہ اسی پر واقع ہے۔ لال سُوہانرا کا دیہات، صحرا اور جنگل بہاول پور سے تقریباً ۳۸ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔

جب حکومت کے محکمہ تحفظ جنگلی حیات کو معلوم ہوا کہ اس جنگل اور اس کے آس پاس نایاب جنگلی پرندے اور حیوانات بڑی تعداد میں آج بھی اپنی قدیمی انداز کی زندگی گذار رہے ہیں تو اس علاقے کو "لال سوہانرا نیشنل گیم پارک" کے نام سے محفوظ کر دیا گیا--- تا کہ نایاب جنگلی حیات پھلے پھولے---!

یہ نیشنل گیم پارک چونکہ اس علاقے میں صحرا کے بالکل کنارے پر واقع ہے، اس لیے حکومت نے یہاں آنے کے خواہش مند لوگوں کو بھی اچھی سہولتیں مہیا کی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ بہاول پور اور گرد و نواح کے لوگوں کو قدرتی جنگلی حیات کو دیکھنے اور مطالعے کے لیے اس کو جنگل سے پارک کا درجہ دیا گیا۔ کیونکہ اس جگہ کی بہت سی قابل توجہ خوبیاں ہیں۔ خشک صحرا، صحرا کے کنارے پر ہرا بھرا جنگل، ایک جانب بڑی قدرتی جھیل، اور بے شمار نسلوں کے پرندے، چرندے اور درندے یہاں آج بھی من کی موج کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔

چونکہ پکی سڑک سے اترنے کے بعد جو پگڈنڈی نما سڑک تھی، وہ کہیں پر خالصتاً کچی یا اس قدر ٹوٹی ہوئی تھی کہ رفتار کے ساتھ سفر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی ذیلی سڑک کے کنارے تیز رفتار نہر بھی بہتی تھی۔ جس سے ارد گرد کے مناظر میں زندگی کی حیات بخش لہر کا منظر خوش گوار ہو جاتا تھا۔ اس لیے یہاں تک پہنچنے میں اوسط سے زیادہ وقت صرف ہوا--- شام تیزی سے اترتی آ رہی تھی اور ہمیں شام ہونے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ ہم سے پھر غلطی ہوئی--- سائفن پل سے نہر پار کرنے کی بجائے نہر کی ادھر والی کچی سڑک پر میلوں چلتے چلے گئے--- خرم شکیب کو جب راستے کی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے کسی کو فون کر کے پوچھا اور کوچ موڑنے کا کہا--- رستہ اتنا تنگ تھا کہ عین اسی جگہ سے کوچ کو موڑنا آسان نہیں تھا۔ تقریباً ایک کلو میٹر آگے جا کر ذرا کشادہ سی جگہ ملی تو کوچ کو واپس موڑا گیا مگر پھر بھی خوف آتا تھا کہ ریورس کرتے ہوئے کوچ نہر میں نہ جا گرے---!

اب ہمارے دائیں طرف نہر تھی اور بائیں طرف گھنا اور قدیم جنگل تھا۔ نہر کے کنارے بھی تن آور اور قدیم درخت تھے، جن کی اٹھان اور گھنے پن کی وجہ سے اندھیرے کا احساس کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا--- مجھے تو

لگتا تھا کہ جب ہم کالے ہرنوں کے علاقے میں پہنچیں گے تو اندھیرا پھیل چکا ہوگا--!

کہتے ہیں کہ کالے ہرنوں اور جنگل کی قدرتی حیات کو یہاں دیکھنے کا بہترین وقت اکتوبر سے مارچ تک کا ہوتا ہے اور ہم لوگ فروری کے وسط میں یہ سفر کر رہے تھے اور نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اس جنگل میں سرکار نے چار ریسٹ ہاؤسز بھی تعمیر کر رکھے ہیں اور یہ بھی کہ یہاں کی رہائش مہنگی نہیں ہے۔ آج کل ان ریسٹ ہاؤسز کی رہائشی حالت کیسی ہے، معلوم نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عمدہ ہے اور کوئی کہتا ہے کہ لاپرواہی اور عدم توجہ سے خراب ہے-- اللہ ہی جانے--!

پارک کا یہ حصہ بیس ہیکٹر رقبے پر مشتمل ہے، جس میں کشتی رانی کے لیے جھیل، پانچ کمروں کا موٹل اور سنیک بار بھی ہے۔ گویا یہ حصہ چھوٹا سا چڑیا گھر ہے۔ مگر ہم لوگوں کی منزل پارک نہیں تھا بلکہ جنگل اور صحرا کا وہ حصہ تھا، جہاں کالے ہرنوں اور سنہری ہرنیوں کا بسیرا تھا۔ سو ہم نہر کے ساتھ ساتھ کئی کلومیٹر تک چلتے چلے گئے۔

اس نہر کو صحرائی نہر بھی کہا جاتا ہے۔ جو جنگلی حیات اور جنگل کو سیراب کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ پارک کی انتظامیہ "چولستان ڈیزرٹ سفاری" کا بھی اہتمام کر کے دیتی ہے۔ جس میں کھانا پینا اور صحرائے چولستان میں کیمپنگ بھی شامل ہوتی ہے۔ اس سفاری میں وہ روزانہ پندرہ سے بیس کلومیٹر صحرا کا اونٹوں پر نظارہ کرواتے ہیں۔ آپ اگر اونٹوں پر صحرائی سفر نہ کرنا چاہیں تو جیپ کا بندوبست بھی کر دیتے ہیں۔ یہ ٹور تقریباً پانچ روز پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں چولستانی صحرا میں موجود چار قلعے اور دن رات میں صحرا کے طلسماتی نظارے ایسے دکھائے جاتے ہیں کہ سفر ناقابل فراموش بن کر آپ کی زندگی میں ٹھہر جاتا ہے-- میں سوچ رہا تھا کہ زندگی اور صحت نے موقع دیا تو یہ ایڈونچر ضرور کروں گا-- اس لیے کہ زندگی، قدرت کو دیکھنے کا ایک حسین منظر نامہ ہوتی ہے--!

پھر وہ موڑ آ گیا کہ جہاں سے جنگل میں داخل ہونا تھا۔

نشانی کے طور پر ایک بورڈ بھی ملا جو ایک تنگ کچی پگ ڈنڈی کے کنارے لگا تھا۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ رستہ کالے ہرنوں کے استھان کو جاتا ہے۔

Black Bucks کے نشان سے ہم جنگل میں اتر گئے-- کچی پگڈنڈی بس اتنی ہی چوڑی تھی کہ بہ مشکل کوچ کے پہیے اس پر چل رہے تھے-- دونوں جانب سیاہ اندھیرا جنگل تھا، حالاں کہ ابھی روشنی کافی تھی مگر ایک

دوسرے میں اُلجھے ہوئے، بلند و بالا درختوں نے روشنی کو زمین تک پہنچنے سے روکا ہوا تھا--- جنگل کا ماحول خالصتاً قدرتی اور خوف پیدا کرنے والا تھا---!

ایک پانی کے کھالے کا پل کراس کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بہت سے سی مرغ، پانی کے کھالے سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ میں نے اتنی بڑی تعداد میں اتنے سی مرغ پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے کوچ کے انجن کی آواز سنی اور کوچ کو یکا یک اپنے سر پر پایا، وہ پانی چھوڑ کر جنگل میں اڑان بھر گئے۔ یہ نظارہ اتنا مختصر تھا کہ تصویر بنانے کا موقع ہی نہیں مل سکا--- مگر جب اڑان بھرنے کے لیے سنہری مرغوں نے اپنے پر کھولے تو ان کے رنگین پروں کی خوبصورتی اور لمبی لمبی ست رنگی دُموں کے پرَوں کے جھالر نما پھیلاؤ نے دم بخود کر دیا--- یہ نظارہ فقط چند ثانیے پر مشتمل تھا مگر میری آنکھوں میں آج تک صدیوں کا پھیلاؤ بن کر منجمد ہے اور رہے گا--- میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر اس جنگل میں جاؤں اور کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بُت بن کر بیٹھ جاؤں اور جب سی مرغ پانی پینے آئیں تو میں ان کو جی بھر کے دیکھوں---!

میں نے اپنی زندگی میں ایک بار پہلے بھی سی مرغ تہران کے شمالی جنگل کے کنارے کرج میں دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اتنے خوب صورت نہیں تھے کہ جتنے یہاں پر لال سوہانرا کے جنگل میں تھے---!

جنگل کی اس پگڈنڈی پر کوچ آہستہ آہستہ، دھیمی رفتار سے متواتر چلی جا رہی تھی۔ اندر بھی خاموشی تھی اور باہر بھی سناٹا تھا۔ میں جنگل میں بے چینی سے جھانکتا جا رہا تھا۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا--- اچانک نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک "گربہ دشتی" کسی پرندے کو پھاڑ کر کھا رہی تھی مگر کوچ کی آواز سنتے ہی بجلی کی سی پھرتی سے، جس درخت کے نیچے بیٹھی "ڈنر" کر رہی تھی، اسی پر چڑھ گئی--- اس ایک لمحے میں، بس اتنا نظر آیا کہ سیاہ رنگت کی تھی اور گز بھر لمبی جنگلی بلی یا بلا تھا---!

لیجئے صاحب، ایک کھلی جگہ پر آ کر رک گئے--- سامنے جالی کا دروازہ تھا۔ یہی کالے ہرنوں اور سنہری ہرنیوں کا مسکن تھا۔ ان جالیوں کے پار صحرا، چھدرے درخت اور ہرن قلانچیں بھرتے یہاں سے بھی نظر آ رہے تھے۔ دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ہرنوں کے محفوظ صحرا کا دروازہ فقط ہمارے لیے کھولا گیا تھا۔ خرم شکیب نے رکھوالے کو پہلے سے فون کر کے اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ ورنہ پارک میں اس وقت بند کر دیا جاتا ہے کہ جب ہم وہاں پہنچے تھے--- ابھی اندھیرا چھانے میں کوئی پینتالیس منٹ باقی تھے۔ اس نے ہمیں جالی کے دروازے پر ہی مطلع کر دیا کہ

آپ کے پاس فقط چالیس منٹ ہیں مگر نظارہ ہو جائے گا--!

چولستان کے حسین و جمیل سیاہ ہرن اور سنہری ہرنیاں آنکھوں کے سامنے تھیں--!

بالکل اتفاق تھا کہ وہ عین اسی حصے میں مستیاں بلکہ خرمستیاں کر رہے تھے کہ جہاں ہم موجود تھے، وجہ اس کی یہ تھی کہ ان کا دانہ پانی اسی حصے میں وافر مقدار میں تھا۔ سو وہ رات کے کھانے کے لیے یہاں موجود تھے۔

باقی دور دور تک صحرا ہی صحرا تھا-- اونچا نیچا، ریت کے قدرتی ٹیلوں سے سجا سنورا قدرتی صحرا--!

جو دور دور درخت لگے تھے، ان کی قدامت اور طلسماتی الجھی ہوئی شاخوں اور تنوں کا پھیلاؤ بہت پراسرار اور ہیبت ناک شکل میں تھا-- ایسا لگتا تھا کہ یہ ایسے بوسیدہ اور قدیم درخت ہیں کہ ہر ہر درخت پر ہزاروں چڑیلوں کے آشیانے ہیں۔ عجیب ٹیڑھی ترچھی موٹی سوکھی شاخیں، عجیب انداز میں مختلف سمتوں میں بل کھاتے ہوئے بیل دار تنے، کیکر اور زیتون کے درخت تھے کہ جن سے ہیبت اور درندگی کا احساس جھلکتا تھا-- پتے بہت کم تھے مگر جو پتہ زمین پر گرتا، قریبی ہرن کلانچیں بھرتا ہوا آتا اور پتے پر من وسلویٰ کی طرح جھپٹ پڑتا-- ہرنیوں میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ گرے ہوئے پتے پر اتنے طاقت ور اور متائے ہوئے ہرنوں کی موجودگی میں لقمہ بنانے کی کوشش کریں-- اگر دو ہرن ایک گرتے پتے پر حملہ آور ہوتے تو جو بڑا، لمبے سینگوں والا اور طاقت ور مشٹنڈا ہوتا، وہی پتے پر آسانی سے ہاتھ صاف کر جاتا تھا، پھر دوسرا محروم ہرن شرافت سے چپ کر کے اپنی راہ لیتا تھا-- یہ منظر تواتر کے ساتھ چل رہا تھا، کیوں کہ کسی نہ کسی درخت سے کوئی نہ کوئی پتہ یکے بعد دیگرے گرتا ہی جاتا تھا--!

ہرنوں کا یہ باڑہ تقریباً دو مربع اراضی پر صحرا میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف چھدری موٹی جالی کی باڑ صحرا میں میلوں تک لگائی گئی تھی۔ تاکہ ہرن ایک محفوظ اور قدرتی مقام پر نظر میں رہیں۔ حالانکہ ہرنوں کے علاقے کی مشرقی سمت میں چولستان کا وسیع وعریض صحرا سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا تھا۔

اس باڑ کے بارے میں اہم بات یہ کہ اس باڑ کو ہم پاکستانیوں نے تعمیر نہیں کیا تھا، بلکہ امریکہ اور نیدرلینڈ کے اسکولوں کے بچوں نے اپنے جیب خرچ "پاکٹ منی" کا عطیہ دے کر ان نایاب ہرنوں کی افزائش اور حفاظت کے لیے تعمیر کرایا تھا--!!!

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے سارے کام امریکہ اور یورپین ملک ہی کیوں کرتے ہیں--؟

کیا پاکستان کے اسکولوں کے بچے اپنا جیب خرچ ایسے مقاصد کے لیے عطیہ نہیں کر سکتے--؟

میرا خیال ہے کہ بالکل کر سکتے ہیں، دل کھول کر کر سکتے ہیں مگر ان کو کون یقین دلائے گا کہ یہ ننھے فرشتے

جب اپنی معصوم خواہشات کو پس پشت ڈال کر اپنا جیب خرچ ایسے مقصد کے لیے عطیہ کریں گے تو کیا گارنٹی ہے کہ ماسٹر صاحب، ہیڈ ماسٹر صاحب، ایجوکیشن آفیسر، سیکرٹری ایجوکیشن اور وزیر تعلیم صاحب اصل اور کل رقم ایمانداری کے ساتھ ایسے پراجیکٹس پر ہی، ایک دھیلہ آگے پیچھے کیے بغیر حصول مقصد پر ہی لگائیں گے؟ یہی وہ خوف ہے کہ جس کی وجہ سے یہ کام ہمارے ملک میں نہیں ہو پاتے--ہو سکتا ہے کہ بچوں کی عطیہ کی گئی رقم سے سرکار اپنے ذاتی استعمال کی بلٹ پروف کار ہی خرید لے--!!!

کالے ہرنوں کے علاقے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف صحرا میں ایک پکی اینٹوں کی روش جاتی ہے جو ایک اونچے اور مستطیل پلیٹ فارم پر آ جاتی ہے۔ جو لوگ لال سوہانرا میں ہرنوں کا دیدار کرنے آتے ہیں، ان کو اسی پلیٹ فارم پر محدود کر دیا جاتا ہے تا کہ ہرن خوف زدہ یا بدحواس نہ ہو جائیں--ہم بھی اسی پلیٹ فارم پر آ گئے۔ یہ پلیٹ فارم صحرائی زمین سے کوئی آٹھ دس فٹ اونچا تھا۔ نیچے چاروں طرف کا نظارہ بہت دلکش تھا--ہرن ٹولیوں کی شکل میں بڑے اطمینان سے سرگشت کر رہے تھے--جگہ جگہ، فاصلے فاصلے پر خاص طرح سے بنی، مٹی کی بڑی بڑی کنالیاں رکھی تھیں، جن میں ان کی پسند کا دانا، چنے کی دال اور اجناس تھے۔ پانی کے پکے کھالے، اور نالیاں جو کشادہ تھیں وہ بھی رواں دواں تھیں کہ جہاں پیاس لگے ہرن لوگ آسانی سے پانی نوش جان کر سکیں--دور دور بڑے بڑے تالاب قدرتی انداز میں برائے غوطہ خوری واشنان صاف ستھرے بنے تھے--قدیم درختوں کی جگہ جگہ چھاؤں تھی کہ بارش اور دھوپ سے پناہ لے سکیں--غرض ہرنوں کا پورا پورا خیال رکھنے کی کوشش کی گئی تھی--صحرائی ماحول قدرت نے فراہم کر دیا تھا اور باقی لوازمات کا دھیان غیر ممالک کے تعاون اور ہماری کوششوں سے عمدہ نظر آتا تھا--!

پلیٹ فارم سے ہرنوں کی نقل و حرکت اور تمام خوبیاں اور بدمعاشیاں بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھیں--!

ریوڑ کے ریوڑ چل رہے تھے--ہر ریوڑ کے آگے ایک بڑے جثے کا لمبے خم دار سیاہ سینگوں والا سردار تھا--سردار ہرن کے پیچھے کافی تعداد میں سنہری ہرنیاں چلتی تھیں۔ ہرنیوں کے دائیں بائیں بھی سیاہ سینگوں والے کالے ہرن، اپنی اپنی ہرنیوں کی حفاظت کی خاطر چلتے تھے اور ریوڑ کے آخر میں بھی ایک دو سیاہ ہرن پیچھے سے حفاظت کرنے کو موجود ہوتے تھے۔ مجال ہے کہ کوئی اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور ادھر کوئی سنہری ہرنی اپنے قبیلے سے نکل کر دوسرے قبیلے کے ہرنوں سے عشق معشوقی لگانے لگے--سب آزاد تھے مگر اپنے ذاتی قاعدے قانون اور اخلاقیات کے پابند نظر آتے تھے--!

لوگ کہتے ہیں کہ جنگل میں کوئی قانون نہیں ہوتا -- میں کہتا ہوں جنگل میں بھی قانون ہوتا ہے اور سب جانور، چرندے پرندے اس قانون کی پاسداری کرتے ہیں۔ اگر جنگل میں قانون نہ ہو تو شیر ایک دن میں ہی پورا پورا ریوڑ شکار کر کے پھینک دے۔ مگر نہیں -- ایسا نہیں ہوتا -- وہ صرف اپنی بھوک مٹانے کے لیے فقط ایک جانور کا شکار کرتا ہے اور جب تک دو تین دن میں اُسے ختم نہ کر لے، اگلا جانور شکار نہیں کرتا -- مگر انسان کی فطرت اس کے برعکس ہے اور بڑی وحشی ہے، وہ کسی ایک انسان کو مار لے تو اگلے کو مارنے اسی وقت نکل کھڑا ہوتا ہے -- میرا ناقص خیال ہے کہ انسان قانون کی زیادہ خلاف ورزی کرتا ہے، جب کہ جانور قانون کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ انسان ہی ہے کہ جو ایک وقت میں موقع ملنے پر کئی کئی ہرن، چنکارے، نیل گائیں مار دیتا ہے مگر پھر بھی اس کا دل نہیں بھرتا -- حالانکہ اس نے صرف اتنے بڑے جانور کے جسم کی صرف چند بوٹیاں ہی کھانا ہوتی ہیں --!

کالے ہرن واقعی خوب صورت، وجیہہ اور دیکھنے میں بے مثال خوبصورت تھے۔ ان کے سینگ سیدھے، بل دار اور سیاہ تھے۔ بعض سردار ہرنوں کے سینگوں پر حیرت انگیز قسم کی سفید بل کھاتی لہردار لکیریں تھیں۔ سیاہ ہرنوں کی چال میں بڑا وحشیانہ وقار اور قدم رکھنے کا پُر وقار انداز تھا۔ جب سردار ہرن اپنے ریوڑ کے آگے چل رہا ہوتا تو کوئی دوسرا ہرن یا ہرنی اس سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کرتی تھی؛ وہ رک جاتا تو سب رک جاتے تھے، وہ چلتا تو اسی سمت چلتے کہ جس سمت وہ چلتا -- وہ جس ہرنی کو لفٹ دیتا، صرف وہی ہرنی پاس آتی، باقی ہرنیاں صبر سے نظارۂ حسن و عشق دیکھ کر صبر یا اللہ جانے جبر کرتی تھیں۔ میں نے ایسے کئی نظارے اس تھوڑی سے وقت میں بار ہا دیکھے --!

ہرنیوں کا حال یہ تھا کہ سنہری اور سفید رنگت رکھتی تھیں۔ پیٹ اور پشت اُن کی ابرق سفید تھی -- جو حاملہ ہرنیاں تھیں، وہ ریوڑ کے آخری حصے میں دھیرے دھیرے اور دھیمے دھیمے سنبھل سنبھل کر چلتی تھیں اور جو جوان اور الہڑ ہرنیاں تھیں، بڑی مستانی چال میں چلتی تھیں۔ ساتھ اور آگے پیچھے چلنے والے سیاہ مشٹنڈے ہرنوں کو اچھل اچھل کر بڑی اداؤں سے چھیڑتی تھیں -- ہرن اس چھیڑ خانی کا بالکل برا نہیں مناتے تھے۔ بلکہ یہ بھی دیکھا کہ اپنی تھوتھنی سے ان کی گردنوں کو دھیرے سے سہلا دیتے یا پھر منہ سے منہ ملا کر بوسہ بھی دے دیتے -- مجھے لگا کہ بوسہ دینے کا عمل ہرن کرتا تھا، جب کہ ہرنی صاحبہ بوسہ لینے کا ہرن کو موقع فراہم کرتی نظر آتی تھیں --!

ہرنیاں نازک اندام تھیں۔ ان کی ٹانگیں اور پچھلی رانیں سبک اور چمکدار تھیں، جبکہ ہرنوں کے چاروں ہاتھ پیر مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ ہرنوں کے پیٹ بھی ہرنیوں کی طرح سفید تھے -- یوں کہہ لیجیے کہ ہرن سیاہ مشکی اور ہرنیاں سنہری بھوری مستانی تھیں --!

کہتے ہیں کہ ایک کالے ہرن پر ستر سنہری ہرنیاں عاشق ہوتی ہیں--ایک کالا ہرن مر جائے تو ستر ہرنیاں بیوہ ہو جاتی ہیں--مگر میں نے جو دیکھا اس کے مطابق یہ مبالغہ نظر آیا--پورے ریوڑ پر سردار کالے ہرن کا راج ہوتا ہے مگر سات ہرنیوں سے زیادہ ہرن کسی دوسری ہرنی یا کسی دوسرے ریوڑ کی ہرنی پر نظر نہیں رکھتا--مگر ایسا لگتا ہے کہ ریوڑ کے تمام ہرن، ریوڑ کی تمام ہرنیوں پر عاشق ہوتے ہیں--بس، جس کا، جس پر، جب دل آ جائے--!!!

مجھے لگا کہ لال سوہانرا کے ہرن بہت شرارتی اور ہرنیاں بہت شریف النفس قسم کی ہیں--لگتا تھا کہ انھوں نے اپنے ہرنوں کو "ناں" کرنا سیکھا ہی نہیں تھا--!

میں دیکھ رہا تھا کہ ایک ہرنی نے ایک دیو قسم کے کالے ہرن کو فیض یابی سے ہم کنار کیا--یہ دیکھ کر دوسرے ہرن کے جذبات بھی بہک گئے--وہ ہرنی جب اپنے ریوڑ کے پہلے دیو ہرن سے فارغ ہوئی تو جذباتی ہرن نے بھی اس کا "بلتکار" کر دیا--بے چاری نے چوں تک نہ کی؛ سب کچھ شرافت اور صبر سے سہہ کر جگالی کرنے لگی--!

لال سوہانرا کے اس مخصوص صحرائی خطے میں کل ۳۳۰ ہرن اور ہرنیاں ہیں۔ دونوں کی تعداد برابر برابر بتائی جا رہی تھی--مگر دیکھنے میں ہرنیاں زیادہ نظر آتی تھیں اور ہرن کم--پارک کے گائیڈ نے اس سوال پر مسکرا کر جو جواب دیا وہ لفظ بہ لفظ کچھ یوں تھا کہ اکثر کالے ہرن اپنی پسندیدہ ہرنی کو لے کر دور صحراؤں میں آؤٹنگ کو نکل جاتے ہیں، پھر دو دو تین تین دن بعد مرکزی حصے میں آتے ہیں--میں نے پوچھا، کیسی آؤٹنگ--مسکرا کر کہنے لگا--سر جی، کبھی نہ ہرنی سے پوچھا ہے اور نہ ہی ہرن صاحب سے معلوم کیا ہے؛ بس پھر پھرا کر آ ہی جاتے ہیں--!

میں نے رکھوالے سے ان کی فطرت پوچھی تو ایک طرف لے جا کر رازداری سے کہنے لگا--یہ کالے ہرن بڑے بدمعاش اور جنسی مریض ہوتے ہیں، جب کہ ہرنیاں صابر اور سب کو خوش کرنے کے لیے تن من سے ہمہ وقت تیار ہوتی ہیں، بہ شرطیکہ پیٹ سے نہ ہوں--!

اس نے یہ بھی بتایا کہ بارش کے بعد، خواہ بارش جب بھی ہو، خصوصاً برساتوں میں، ہرن "ہاٹ" اور ہرنیاں "ٹوہاٹ" ہو جاتی ہیں--پھر تو جناب یہاں جشن دیکھنے والے ہوتے ہیں--!

یہ عموماً جولائی، اگست میں بچے دیتی ہیں--!

مزید یہ خبر سب کو بڑی بھلی لگی کہ یہاں سے ہرن اور ہرنیاں درخواست دینے پر فروخت بھی کی جاتی

ہیں--ایک جوڑی ایک لاکھ میں ملتی ہے۔یعنی ساٹھ ہزار روپے کا ہرن اور چالیس ہزار روپے کی ہرنی ملتی ہے--!

یہ ہرن اور ہرنیاں اجنبی لوگوں سے بالکل خوف نہیں کھاتے تھے--ان کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بنوانے پر ہرنوں کو بالکل اعتراض نہیں تھا--سو موقع کا فائدہ سب نے ہی اٹھایا--!ہاں البتہ ہرن لوگ ہماری ساتھی خواتین کے ساتھ تصویر بنوانے پر مشتعل ہو جاتے تھے--!!!

باب ۱۳

حکایتیں، شکایتیں

کل صبح سے چولستان ایڈونچر شروع ہوگا

خرم شکیب نے خبر دی

شہزادے اپنے ملکوں کے تو سارے ہرن اور چنکارے شکار کے نام پر مار کر تناول فرما چکے ہیں۔ انھوں نے کچھ سالوں پہلے اردگرد کے ملکوں میں اپنے قاصد اور ہرکارے دوڑائے کہ فوراً پتہ کرو کہ اب کس ملک کے صحراؤں اور نخلستانوں میں کیا کیا بچا ہے۔ معتبر ہرکاروں نے اطلاع دی کہ جناب پاکستان میں ایک جگہ ہے۔ صحرائے چولستان---وہ شکار کے لیے بہت زرخیز ہے، وہاں کے لوگ۔ گیم وارڈنوں سے بہت ڈرتے ہیں، اس لیے ہرنوں چنکاروں اور گوروں کا شکار کرنے سے کانوں کو ہاتھ لگا کر تائب ہو چکے ہیں۔ تو وہاں یہ سب شاہی گوشت، زندہ اور صحت مند حالت میں عام بلکہ سرِ عام صحراؤں میں چرتا پھرتا ملتا ہے---کہا، بس پھر تو ٹھیک ہو گیا ہے---ہم وہاں اپنے محل بھی بنائیں گے، زمینیں بھی خریدیں گے اور شکار بھی کریں گے---اُدھر والوں کی اِدھر والے حکمرانوں سے گاڑھی دوستی تھی کہ اِدھر والے اُدھر اپنی پسند کے شکار کو جاتے تھے مگر اُن کے شکار اور طرح کے ہوتے ہیں---کہا

کہ اپنے لوگوں پر قانون کو اور سخت کر دو تا کہ جو یہ جرأت کرتا بھی ہے تو کان پکڑ کر تائب ہو جائے -- ہم نے کہا، جو جناب کا حکم -- بس پھر کیا تھا، یہاں صفایا شروع ہو گیا -- کہتے ہیں کہ صحرائے چولستان میں سینکڑوں میل تک کوئی ہرن ہرنی نہ بچی -- یہ لوگ خوش نودی کے لیے اور کیا کرتے -- بہت سوچا -- پھر یہ حل نکالا کہ جب امارات کے عربی صاحب لوگ آتے تو رات کے اندھیرے میں چپکے سے لال سوہانرا شکار گاہ یعنی ممنوعہ گیم پارک سے چار چھ کالے ہرنوں کے جوڑے نکالے اور چپکے چپکے دُور دراز کے صحرا میں جا کر چھوڑ دیے جاتے -- صبح صبح حضرات کو بتایا جاتا کہ جناب ہمارے گیم وارڈن نے اطلاع دی ہے کہ ایک علاقے میں چار چھ جانوروں کی ٹولی مٹر گشت کرتے دیکھی گئی ہے -- اس خوش کن خبر اور اطلاع پر "حقیر قسم کے" انعام واکرام سے نوازے جاتے اور حضرات عالی مقام، فٹافٹ تیز رفتار جیپوں پر سوار ہو کر صحرا کی طرف دوڑنے لگتے ہیں -- مخبر جو ہمراہ ہوتا ہے، اس سے بے چین ہو کر بار بار پوچھتے ہیں -- وہ یہاں سے اور کتنی دور ہے؟ -- تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ناں؟ -- اگر یہ خبر جھوٹ نکلی تو تمہارا زن بچہ کولہو ہو جائے گا --!

وہ گھبرا کر کہتا ہے -- حضور اپنی اِن گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے --

اچھا -- گناہ گار آنکھوں سے -- ???

اور اگر تمہاری گناہ گار آنکھیں جھوٹی نکلیں تو ایسی بے کار شے کو رکھ کر کرنا کیا ہے پھر --!

جی -- جی حضور -- !!!

وہ دل ہی دل میں دعائیں اور منتیں مان رہا ہوتا ہے کہ اللہ کرے کم بخت وہیں، آس پاس ہی ہوں -- سالے نا سمجھ جانور ہیں، کہیں اِدھر اُدھر نکل گئے تو میں برباد اور میرا زن بچہ کولہو ہونے میں دیر نہیں لگے گی -- جانور نہ ملنے کی خوشی میں وہی گولی میرے آر پار بھی ہو سکتی ہے --

جانور، جانور ہی ہوتے ہیں، جہاں چھوڑا تھا، وہاں سے دس پندرہ میل دور نکل جاتے ہیں، انھیں دیکھ کر مخبروں کی جان میں جان آتی ہے -- شکاری جیپیں دوڑتی ہیں -- گولی چلتی ہے -- یہ بھاگ کر، جا کر ذبح کرنے کو چھری اپنی نیام سے نکالتے ہیں تو صاحب فرماتے ہیں -- تم اپنی لوکل چھری سے ذبح نہیں کرو گے بلکہ اس چھری سے ذبح کرو گے جو میں نے دو ہزار ڈالر کی پچھلے ماہ اسی مقصد کے لیے امریکہ سے منگوائی تھی -- تمہاری کھنڈی لوکل چھری سے اس کیوٹ سے معصوم جانور کو تکلیف ہو گی -- !!!

مختلف لوگوں کی مختلف کہانیاں ہیں، اللہ جانے کیا سچ اور کیا جھوٹ ہے، واللہ اعلم بالصواب --!

شام کی سیاہی، رات کے اندھیرے میں بہت تیزی سے تبدیل ہوئی -- میں متواتر سفر سے بہت تھک چکا تھا۔دل چاہتا تھا کہ جلدی سے ہوٹل پہنچوں اور جا کر بستر پر دراز ہو جاؤں۔ پھر کچھ استراحت کے بعد چائے نوش جان کروں۔اس پُرسکون خیال کے آتے ہی آنکھ سی لگ گئی۔ہوٹل پہنچے تو سات بج رہے تھے۔

وجدان، حیدر اور عمر فرحان نے ذرا دیر ٹیک لگائی اور نور محل رات میں دیکھنے کا ارادہ باندھا-- پوچھا، بچو-- کس سواری پر کیسے جاؤ گے--!

کہنے لگے--"رکشہ لیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں--"!

"--گڈ آئیڈیا-- میں نے سنا ہے کہ رات کو جب نور محل روشنیوں سے جگ مگا رہا ہوتا ہے تو وہاں پریوں کی آمدورفت شروع ہو جاتی ہے،ذرا سنبھل کر رہنا لڑکو--"!

اتنے میں چائے شیشے کے گلاس میں آ گئی اور بچے نور محل کو چل دیے۔

صبح انتظامیہ نور محل نے بتایا تھا کہ نور محل پر چراغاں سرِ شام ہو جاتا ہے اور رات نو بجے تک وہ عوام الناس کے لیے کھلا رہتا ہے--ارادہ تو میرا بھی جانے کا تھا مگر مجھے کل شام سے اب تک کے سفری نوٹس بھی لکھنے تھے،سو میں رک گیا،البتہ میں نے اپنی جگہ اپنا کیمرہ بھیج دیا۔

نو بجے کرامت علی نے خبر دی کہ رات کے کھانے کا انتظام اسی سڑک یعنی ویلکم روڈ نمبر دو پر ایک ہوٹل کے ہال میں ہے۔بس آپ لوگ دس بجے نیچے ٹیرس میں آ جائیں،کوچ آپ کو وہاں لے جانے کو تیار اور اسٹارٹ کھڑی ہو گی۔ میں نے وجدان کو فوراً فون پر کھانے کے لیے مطلع کیا۔

"--کرامت علی بھائی-- یہ بتائیے کہ آج رات کھانے میں کیا کیا ہے--"

"--سر جی،زبردست کوشش کی ہے--اچھا کھانا بنوایا ہے خرم شکیب صاحب نے--"

"--واہ-- پھر تو مزا آ جائے گا--"

وجدان،حیدر اور عمر پورے وقت پر آن پہنچے۔

"--کیسا نظارہ رہا،رات میں نور محل کا--"میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"--بابا جان-- آپ نے بہت مس کیا-- واقعی جس نے رات کو نور محل کے درشن نہیں کیے،اس نے نور محل کو دیکھا ہی نہیں--" وجدان کہنے لگا۔

"--بیٹا جی-- یہ ٹھیک ہے مگر مجھے کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرنا تھا،اگر وہ نہ کر پاتا تو بہت سی باتیں رہ

جاتیں-- چلو تم نے دیکھ لیا، تصویریں بنالیں، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی سٹوری تم لوگوں سے سن لیتا ہوں--"

وجدان، حیدر اور عمر فرحان نے پوری پوری تفصیل بتائی، اور آنکھوں دیکھا حال تصویروں نے بیان کر دیا۔

وجدان نے بتایا کہ محل کے استقبالیہ نگرانوں نے کیمرے تو اندر جانے دیئے مگر ٹرائی پوڈ (اسٹینڈ) لے جانے کی فیس مبلغ تین ہزار روپے طلب کی-- یہ فیس سن کر بچوں کے تو ہوش اڑ گئے۔ پھر وجدان کو خیال آیا کہ اس کے کیمرے میں اینٹی وائبریشن، وی آر لینز ہے، اس لینز کی موجودگی میں اسٹینڈ قطعی ضروری نہیں ہے۔ ٹرائی پوڈ انھوں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے تو شوق سے رکھیں، ہمیں فرق نہیں پڑتا--!

نور محل اپنی روایتی چکا چوند روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ روشنیاں ایسے رخوں سے اس کے در و دیوار پر ڈالی گئی تھیں کہ اس کی خوب صورتی میں، دن کی نسبت دوسری طرح کا اضافہ ہو گیا تھا-- واقعی نور محل اِن ابرق چمکتی روشنیون میں طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا-- اس وقت محل کے اندر جانے کی تو اجازت نہیں تھی مگر اس کے بدلے یہ اجازت ملی کہ آپ اس کے تہہ خانوں کی عمارت کو دیکھ سکتے ہیں-- وجدان اور اس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ تہہ خانے کا بھی مخصوص حصہ ہمارے لیے کھولا گیا تھا-- باقی کمرے اور دیگر حصے بند تھے-- تہہ خانے میں اس قدر روشنی تھی کہ سوئی بھی زمین پر گر جاتی تو فوراً مل جاتی۔ یہ بڑے پراسرار تہہ خانے تھے۔ جو محل کا اوپر کا نقشہ تھا، وہی زیر زمین عمارت کا نقشہ تھا۔ باہر کھلے میں جو سردی تھی، اس کے مقابلے پر تہہ خانے اس طرح گرم تھے کہ جیسے بے شمار فین ہیٹر لگے ہوں-- دیواروں کے آثار تین سے پانچ فٹ چوڑے تھے۔ ہر آثار دیوار میں، جو اصل میں محل کی مرکزی بنیادیں تھیں، گول گول سوراخ مخصوص فاصلے پر انسانی چہرے کے متوازی بنائے گئے تھے۔ بہت سے کمرے اور گیلریاں دیواریں تعمیر کر کے بند کر دی گئی تھیں۔ گویا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان بند دیواروں کمروں کے راستے کسی اور سمت سے اترتے ہیں اور ان کا استعمال کسی ایسے مقصد میں ہوتا ہے کہ جس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

کرامت علی پھر سے وارد ہو گئے--

"-- آپ لوگ باتوں میں مگن ہیں، اُدھر آپ کا کھانے پر انتظار ہو رہا ہے-- جلدی کریں، کوچ نیچے اسٹارٹ کھڑی ہے اور ہاں-- گرم کپڑے اور ٹوپی بھی پہن لیں، باہر بہت سخت سردی ہے--"

یہ کہہ کر کرامت علی باقی کمروں کے دروازے کھٹ کھٹانے میں مصروف ہو گیا۔

واقعی باہر کڑکڑا دینے والی سردی تھی۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ دن میں جتنی گرمی تھی، اس کے الٹ شدید سردی تھی۔ لگتا تھا کہ چولستان صحرا کی سرد ہواؤں نے بہاول پور شہر کا رخ کر لیا ہے۔

ڈنر" اور ینٹل کوزین ہوٹل" کے پہلی منزل کے کشادہ ترین اور خوبصورت ہال میں تھا۔ بیرے باوردی، ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھائے، بھاگ بھاگ کر مرغ کڑاہی اور عمدہ بریانی کے باؤل لا لا کر بڑی نزاکت سے، سر کھ کر رکھ رہے تھے۔ کولڈ ڈرنک، رائتہ، سلاد، پانی کی سیل بند بوتلیں میزوں پر سجادی گئیں۔ ہماری میز والوں نے نان کی بجائے تازہ گرم روٹی کا مطالبہ کیا، جسے فوراً پورا کر دیا گیا--کئی لوگوں نے چائے پینے کی خواہش کا اظہار کھانے کے بعد کیا، جسے خرم شکیب صاحب نے بہ سرو چشم اور اشارۂ ابرو سے پیشانی پر شکن ڈالے بنا قبول کیا اور سب کو خوش کر دیا--!

مجھے یہاں کہنے دیجئے کہ خرم شکیب، عمر جاوید اور محمد احمد صاحب کی یہ ٹور کمپنی مجھے صرف اس لیے پسند ہے کہ یہ سب لوگ اپنے سیاحوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کوئی سیاح اگر روٹین سے ہٹ کر کچھ کھانے کو مانگ لے تو بلا کسی احسان اور زائد معاوضے کے مطالبے کے بغیر فراہم کیا جاتا ہے اور سب سے اہم اور قابل قدر بات یہ ہے کہ یہ زائد خرچ کر دینے کے بعد جتایا نہیں جاتا۔ مسافروں کی آسانی اور آرام کی خاطر ان کے فالتو پیسے بھی خرچ ہو جائیں تو کبھی نہ ماتھے پر شکن ڈالتے ہیں اور نہ ہی ناک منہ چڑھاتے ہیں۔ میں نے جب بھی کہا کہ اس چائے یا کھانے کا بل میں ادا کروں گا، کیونکہ یہ میں نے الگ سے فرمائش کر کے منگوایا ہے تو انھوں نے خاموشی سے سن تو لیا مگر جب میں نے بل مانگا تو معلوم ہوا کہ خرم شکیب نے کبھی کا ادا کر دیا ہے--میں نے اس مہمان نوازی کی شکایت خرم شکیب سے کی تو اس نے ہمیشہ کی طرح کہا--سر، اتنی سی بات پر شرمندہ تو نہ کریں--!!!

اللہ جانے، یہ کمپنی اور یہ لوگ آنے والے دنوں میں ان فراخ دلی کی روایات کو برقرار رکھیں گے یا نہیں--میں نہیں جانتا، مگر ایک بات جانتا ہوں کہ ان روایات کا امین خرم شکیب ہے۔

مثلاً اس ڈنر کے بعد کسی نے بتایا کہ دو خواتین اور ایک ان کے ساتھی، صرف اس لیے ڈنر پر نہیں آسکے کہ ایک خاتون کی تھکن سے طبیعت ناساز ہوگئی ہے تو خرم شکیب نے فوراً ڈھیر سارا کھانا پیک کروا کر ان کے کمرے میں فوری طور پر بھجوایا--یہ احساس ذمہ داری کا بہترین اور قابل رشک مظاہرہ تھا--ورنہ جناب آج کل کے دور میں کون ہے جو اتنی اتنی سی بات کا دھیان اور خیال رکھتا ہے۔ میں نے تو سنا اور دیکھا ہے کہ بعض ٹور کمپنیاں رقم تو وافر لیتی ہیں مگر صرف صبح کا مختصر ناشتہ اور رات کا بدمزا سا کھانا دے کر مطمئن ہو جاتی ہیں۔ یہ کمپنی ہو بہو ٹیلنٹی میں یقیناً اچھی

مثال آپ ہے۔ ان کے کچن میں ہر کیمپنگ کے دوران کھانا عموماً بچ جاتا ہے، جو یہ لوگ فوراً مقامی غریب غربا میں تقسیم کر دیتے ہیں --- اس سے بڑی بات آج کے خود غرض زمانے میں اور کیا ہوگی ---!!!

ڈنر تمام ہونے کے بعد خرم شکیب نے سب لوگوں سے صبح کے نامعقول ناشتے پر دوبارہ نہیں سہہ بارہ معذرت کی اور کہا۔

"--- خواتین و حضرات، میں آپ سب دوستوں اور بہنوں کو مشورہ دوں گا کہ ہو سکے تو جلدی سو جایئے گا --- اب تک تو فقط سیاحت ہو رہی تھی --- ایڈونچر کل صبح سے شروع ہوگا کہ جب ہم چولستان میں قلعہ دراوڑ کے زیرِ سایہ پہنچیں گے اور صحرائے چولستان کے کسی ویران اور لق ودق صحرا میں اپنے رنگین خیمے گاڑیں گے --- اونٹوں پر صحرا میں سفر ہوگا، قلعہ دراوڑ میں رات کو آتش بازی کے منتظر ہوں گے --- صحرا میں بار بی کیو لگے گا اور راتوں میں بون فائر آپ کے خیموں کے وسط میں جلتا ہوگا --- بہت سے پیدل سفر ہوں گے۔ کار ریلی کی گہما گہمی آپ کو تھکا دے گی --- اس لیے میری طرف سے اَب شب بخیر۔ کل صبح آٹھ بجے امید ہے آپ خوشگوار نیند کے بعد اصل ایڈونچر کے لیے تر و تازہ ہوں گے ---"!!!

کل صبح ہم آپ کو دیسی بہاولپوری ناشتہ کرائیں گے۔ نیک خواہشوں کے ساتھ شب بخیر ---!

☙

باب ۱۴

ہمارے سفر کے ہم سفر
شخصیت، خاکے اور کردار

مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ میں ٹریکنگ، ایڈونچر اور سیاحت کے دوران صبح جلدی بیدار ہو جاتا ہوں، جب کہ گھر میں اس کے برعکس ہے۔ شاید میں نے اس کے بارے میں اپنے سفرنامے ''کشمیر، فردوس بریں'' میں بہت وضاحت سے لکھا ہے-- آج بھی ایسا ہی ہوا۔

رات پُر تکلف کھانے کی میز پر ان ساتھیوں سے تفصیلی تعارف ہوا، جو اس سفر میں میرے ہم سفر تھے۔ ایک دوسرے سے باقاعدہ تعارف میں خاصہ وقت لگ گیا۔ یہ خصوصیت انگلستان کے لوگوں میں اور پاکستانیوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے-- ہاں، مگر پاکستانی خواتین اس وقت اپنا تعارف کراتی ہیں کہ جب ایڈونچر تمام ہونے کو ہوتا ہے-- اس فطرت میں کیا رمز پوشیدہ ہے، مجھے معلوم نہیں--!

محمد حیدر میری اکلوتی سالی کا بیٹا ہے، جو سیاحت کے قصے سن سن کر ساتھ ہوا-- عمر فرحان، حیدر کا جگری دوست ہے، کہ جس نے نو عمری میں اتنے سگریٹ پیئے کہ اپنے پھیپھڑے پھاڑ بیٹھا، مگر اس حیات نو کے بعد سگریٹ نوشی سے تائب ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کب تک تائب رہتا ہے-- میں بھی سگریٹ نوش ہوں، زندگی میں کئی

دفعہ تائب ہوا ہوں، مگر یہ ایک ایسی منحوس اور بدعلت بلکہ ٹھرک ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی --- اگر چھوڑ بھی دو تو خواہ مخواہ سگریٹ کے دھویں اور خوشبو کی طلب ہوتی ہے --- بس اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ آپ دوبارہ، کسی بھی وقت پھر سے سگریٹ نوشی میں گرفتار ہو سکتے ہیں --- ہاں اگر سگریٹ کے دھویں کی خوشبو آپ کو بدبو بن کر محسوس ہونے لگے تو میرا خیال ہے کہ آپ سچ مچ سگریٹ سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں --- میں ہر اس نوجوان کو تلقین کرتا ہوں کہ جو شغل میلے میں ایک آدھ سگریٹ پیتا ہے کہ خدا کے لیے وہ ایسا نہ کرے --- سگریٹ شروع شروع میں دل لگی والی محبوبہ بے نام ہوتا ہے --- پھر یہ محبوبہ ہر دکھ، پریشانی اور خوشی میں آپ کو بے اختیار یاد آتی ہے اور آپ اسے منہ لگا لیتے ہیں --- پھر یہ محبوبہ سر پہ چڑھ جاتی ہے، وقت بے وقت، جگہ بے جگہ آپ کے ہونٹوں سے کھیلنے لگتی ہے --- پہلے پہل چھپ چھپ کر اکساتی ہے کہ مجھے پیو، میرا مزا لو؛ پھر بے باک کر دیتی ہے۔ آدمی سرعام اس محبوبہ کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ کبھی جرابوں میں چھپا کے رکھتا ہے اور کبھی درازوں میں --- پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ محبوبہ آپ کو اپنا عاشق و دیوانہ بنا لیتی ہے۔ تب آپ بے باک اور نڈر ہو جاتے ہیں --- تب یوں سمجھیں کہ اب آپ اس کے بنا نہیں رہ سکتے گویا اس نے محبوبہ سے سرچڑھی بیوی کا درجہ حاصل کر لیا ہوتا ہے --- اب آپ کو زندگی بھر نجات نہیں ہوگی --- اس منحوس کو طلاق دینا بھی مشکل ہو جائے گا --- جب بھی آپ اس کو طلاق دینے کا سوچیں گے، زندگی میں یک دم اتنی پریشانیاں اور مصیبتیں آنی شروع ہو جائیں گی کہ آپ اپنے آپ سے یہ جھوٹا وعدہ کر بیٹھیں گے کہ یہ پریشانی ذرا ختم ہو لے، تب اس منحوس شے کو طلاق دیتا ہوں --- مگر ایسا ہوتا نہیں، ہاں جو مائی کا لال اس کو طلاق دے بیٹھے میں اسے خاص سلام پیش کرتا ہوں اور اس وظیفے کے بارے میں ضرور پوچھتا ہوں کہ جو کامیابی کی طرف لایا --- مگر وظیفہ بھی کوئی نہیں بتاتا، بس اتنا کہتا ہے کہ "وِل پاور" کو وُسٹ کر کے اس منحوس سے نجات پالو تو پالو، ورنہ تمہارا اللہ نگہبان ہوگا --- !

یہ وجدان ہے، میرا بیٹا --- زیادہ پڑھائی کی وجہ سے اب اس کو غصہ بھی آنے لگا ہے، پہلے نہیں آتا تھا --- !

کھانے کی اس میز پر میرے ساتھ کی کرسی پر عمر سعید صاحب بیٹھے ہیں، چھ فٹ کے اونچے لمبے، چوڑے چکلے بدن کے ہیں --- انہوں نے از راہ تفنن طبع سر پر اُسترا پھرایا ہوا ہے؛ سر کو یوں منڈ وانے کی وجہ ابھی تک ان سے میں نے نہیں پوچھی، مزید بے تکلفی ہو جائے تو پوچھوں گا --- کبھی ٹوپی پہن لیتے ہیں اور جب عالم اضطراب میں ہوتے ہیں تو ٹوپی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ پھر جب اضطراب ختم ہو جائے تو پہن لیتے ہیں --- !

اُن کے برابر میں رضوان ملک ہیں --- کیا شاندار مونچھیں ہیں ان کی --- مونچھوں کی دونوں نوکیں بالکل

بھالے جیسی ہیں، چمکتی ہوئی --- بالکل نوجوان ہیں اور کسرتی جسم ہے، ایسے لگتا ہے کہ ورزش اور باڈی بلڈنگ ان کا شوق ہے --- سر کے بال بالکل نارمل ہیں، جب کہ ان کی مونچھوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ اپنی مونچھوں کو روزانہ خالص گھی لگا کر چمکاتے اور بار بار مروڑتے ہیں --- ترنگ میں بہت جلدی آ جاتے ہیں اور جب ترنگ میں آ جائیں تو ہر وہ کام کر گذرتے ہیں کہ جس کی توقع نہیں کی جا سکتی --- دوسروں کو چمچ گننے پر لگانا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے، مگر کبھی کبھی وہ خود بھی اس جال میں پھنس جاتے ہیں اور چمچ گننے لگتے ہیں --- کھانے پر بھنبھناتی مکھیاں ان کو بہت پسند ہیں ---!!

ان کے ساتھ ہی ان کے ایک دوست محمود احمد ہیں --- یہ دونوں دوست مل کر اس سیاحت پر نکلے ہیں --- دونوں کی عادتیں ایک دوسرے سے اس حد تک ملتی جلتی ہیں کہ محمود احمد، رضوان ملک کے اشارے تک کو بلا بات کیے سمجھ جاتے ہیں --- اور لوگوں کا خیال ہے کہ محمود احمد ہر قسم کی میم میں میخ نکالنے پر پوری طرح قادر ہیں --- کھانے پینے میں کسی قسم کے سمجھوتے کے قائل نہیں ہیں، اگر ٹیم کا کھانا پسند نہ آئے تو بلا تکلف اپنی ذاتی پسند کا کھانا اپنی ذاتی گرہ سے منگوا لیتے ہیں --- تنقید ان کا پسندیدہ شعبہ زندگی ہے۔ اس کے بغیر وہ لقمہ نہیں توڑ سکتے --- لگتا ہے کہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے قائل ہیں --- ہیرا پھیری ان کا مشغلۂ دل پسند تھا ---!

اسی میز پر پشاور کے ارشاد عالم خان بھی تشریف رکھتے ہیں --- ایک سلجھا ہوا پشتون نوجوان، جو پڑھا لکھا اور دھیمے مزاج کا ہے --- کیا عرض کروں، پر دل چاہتا ہے کہ کہہ دوں؛ مگر ہو سکتا ہے کہ میرے کہنے سے ارشاد عالم خان کا دل دکھ جائے --- اس لیے بالکل نہیں کہتا کہ عالم خان کی نفیس طبیعت اور مزاج کچھ لوگوں کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا اور جن کے لیے اس کی نرم گفتاری تکلیف دہ تھی، وہ اسے پشاوری پٹھان کہہ کر پکارتے تھے --- کئی دفعہ توں توں میں میں بھی ہوئی اور صرف اس لیے سر پھٹول تک بات نہیں پہنچی کہ ارشاد عالم خان نے بُردباری اور تحمل کا وسیع مظاہرہ کیا --- مجھے بعد میں باقی سب لڑکوں نے بتایا کہ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کسی نے ارشاد عالم خان سے پنگا کیا تو ہم خان بھائی کی طرف سے اپنی فوجی قوت لگا دیں گے --- اور ان کے قلعے پر دشمنوں کی یلغار کو سرِ عام ناکام بنا دیں گے، ہمیں قلعہ دراوڑ کی قسم ہے ---!

ارشاد عالم خان پشاور کے بلدیاتی کونسلر بھی تھے۔ عمران خان اُن کا سیاسی ہیرو ہے۔ اس سیاسی عہدے کی وجہ سے بھی حسد کے مرض میں اضافہ پایا گیا تھا --- مگر مجال ہے کہ کبھی خان صاحب کے کسی سیاسی بیان سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو --- لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ سیاست سے تعلق رکھتے ہیں --- بس اتنا کہوں گا کہ ارشاد عالم خان بڑا

پیارا بندہ اور بڑا اچھا انسان تھا--!

اسامہ جاوید اور ابرار صاحب نفیس لوگ تھے--بُرد بار اور سوجھ بوجھ والے دوستوں کے دوست، سادہ اور احساس کرنے والے--!

سامنے والی پڑوس کی میز پر ایک نوجوان جوڑی، سر جوڑے کھانے میں مصروف تھی--جاذب بابر ایک خوش شکل، چھ فٹ کا داڑھی والا جوان۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال ہوگی--اس کے ساتھ اس کی ساتھی صبا اشرف، چھوٹی سی، نازک سی--ڈاکٹر صاحبہ ہاؤس جاب کی منتظر تھیں اور جاذب کمپیوٹر انجینئر--دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی--سفر کے آغاز سے انجام تک ایک دوسرے کا سایہ بن کے رہے--کسی یار دوست نے اڑا دیا کہ فیس بک کے فرینڈ ہیں، مگر اب اصلی فرینڈ ہیں۔ سب ان کا احترام کرتے تھے--جاذب بابر کو پاکستان کی سیاحت اور ہائی الٹی ٹیوٹ ٹریکنگ کا شوقین تھا۔ اس کا ایک ہی خواب تھا کہ میں کنکورڈیا جا کر کے ٹو کے سامنے کھڑا ہو جاؤں اور پھر وہاں سے ٹریک کرتا ہوا، کنڈوگورالا سے ہوتا ہوا اسکردو آؤں۔ اس کا یہ خواب مجھے بہت پسند آیا اور بھلا لگا--کیونکہ میرا بھی کئی سال سے یہ خواب ہے کہ میں بھی کنکورڈیا میں خیمہ نصب کروں اور کے ٹو کے سامنے اپنی ہائکنگ اسٹک فضا میں لہرا کر کے ٹو کو سلامی پیش کروں اور سیدھا سیدھا اُردوکس، پایو اور ہوشے سے ہوتا ہوا واپس اسکردو آ جاؤں--لیکن یہ بات میں جس سے کرتا ہوں، وہ میری عمر دیکھتا ہے اور فٹ سے دل توڑ دیتا ہے--سر آپ نہیں جا سکتے--اصل میں وہ یہ کہتے ہیں کہ سلمان صاحب، آپ بڈھے ہو گئے ہیں، یہ آپ کے بس کا روگ نہیں ہے--مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ میں اگلے برس، جب ۶۱ سال کا ہو جاؤں گا تو سیدھا کے ٹو جا کے دکھاؤں گا--یہ میرا خواب ہے، جس کی تعبیر یقیناً خوبصورت نکلے گی--!!!

تین سہیلیاں اور بھی اس گروپ میں شامل تھیں۔ مزے کی بات یہ کہ تینوں سہیلیاں مختلف شہروں سے آئی تھیں--فاطمہ، سدرہ اور تعبیر--!

کمپنی کی طرف سے اس ٹیم کو خرم شکیب لیڈ کر رہے تھے۔ جب کہ علی رضا چنگیزی ان کا خاص الخاص اسسٹنٹ تھا جس کو پیار سے سب لوگ "چینگ" کہتے تھے--مجھے وہ بہ طور چینگ زیادہ اچھا لگا--یہی کوئی پچیس برس کی عمر--شکل صورت سے بالکل چنگیز خان کا پوتا، پڑپوتا لگتا تھا--مگر اصل بات یہ تھی کہ وہ کوئٹہ کے ہزارہ قبیلے سے بی لونگ کرتا تھا--دہشت گردی کی لہر نے اس سے اور اس کے خاندان سے آبائی شہر چھڑوا دیا تھا--بہت پڑھا لکھا نوجوان تھا--علم و ادب پر گہری نظر تھی اس کی--جثہ بہت بھاری تھا--دور سے دیکھو تو بالکل چینی پہلوان نظر

آتا تھا--کئی بار اسے پولیس والوں نے اس شبے میں پکڑ لیا کہ اس کا پاسپورٹ دیکھیں کہ چینی ہے، کورین ہے یا جاپانی ہے مگر وہ خالص پاکستانی تھا، پاکستانی ہے اور محبِ وطن پاکستانی رہے گا--!

دو اور جفاکش لوگوں کا ذکر کیے بغیر تعارف کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا--یحییٰ ہمارا کُک، نہایت محنتی اور لگن سے کام کرنے والا نوجوان--کھانا بنانے میں لاجواب--سو سو آدمیوں کا ناشتہ، پوری پوری رات جاگ کر بنانے والا--اللہ نے اس کے ہاتھ میں ذائقہ اور برکت بھی بے پناہ دی تھی، اس لیے کہ نیک نیت تھا--پھر یحییٰ کا بھائی کرامت علی--ہم کرامت سے پہلی بار فیری میڈوز کے سفر میں آشنا ہوئے--پھر یہ آشنائی دوستی میں بدل گئی--صحرا ہو یا پہاڑ، کرامت علی کی ہمتوں کی داد دی جانی چاہیے۔اس کے ہوتے ہوئے کسی کو تکلیف پہنچ جائے، یہ ممکن ہی نہیں ہے--!

اور بھی بہت سے لوگ، جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہی سمجھا جائے تو مناسب ہے--!

کوئی ذاتی نفرت کا مارا ہوا اور کوئی اخلاقی بدفطرتی سے ڈسا ہوا اور کوئی سماجی گراوٹوں کا شکار--!

اور خرم شکیب کا تو جواب نہیں، خوبصورت انسان، اچھی سوچ، فراخ دل اور پیار کرنے والا، اس سفر کا کھیون ہار--!

باب ۱۵

صبح سویرے ڈائمنڈ ہی ڈائمنڈ
بہاولپوری ناشتہ اور ولائتی لوٹے--!

یقین مانیے کہ اگر رات کو سونے سے پہلے مہمانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ صبح ہم آپ کو دیسی روایتی ناشتہ کرائیں گے تو بہت سے ایسے مجھ جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ اس رات خوابوں میں بلّی کی طرح چھیچھڑوں کے سپنے دیکھنے لگتے ہیں-- چونکہ ہم قطعی طور پر بلّی نہیں تھے، اس لیے ہمیں پوری بھاجی، کے ساتھ پانی والے اچار اور گول لچھے دار پیازوں اور گرما گرم تِلوں والے نانوں اور مصالحے دار چنوں کے خواب آنے لگے تھے-- بلکہ ایسے من چلے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو صبح بتاتے ہیں کہ رات خواب میں جب بھی یہ ناشتہ میرے سامنے آتا تھا اور میں بھاپ اڑاتے خستہ نان کا لقمہ توڑتا تھا تو عین اسی وقت آوارہ مچھر کان میں اِس زور سے بھنبھناتا تھا کہ لقمہ وہیں کا وہیں رہ جاتا تھا اور آنکھ کھل جاتی تھی-- کبھی ابا جی غسل خانے کا دروازہ اس زور سے بند کرتے کہ اس کے اچانک دھماکے سے لقمہ ہاتھ سے گر جاتا اور کبھی چھوٹی گود کی بہن اس زور سے روتی کہ آنکھ کھل جاتی اور لقمہ دھرا کا دھرا رہ جاتا-- اس رات بھی بہت سوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا--!

یہ ۱۳ فروری ۲۰۱۶ء بروز ہفتہ کی بہاولپور میں ایک انتہائی پرسکون اور خوش گوار صبح تھی۔ ایسی گلابی سردی کہ

جس کا تصور حیات بخش اور رومانوی تھا۔ گرم کپڑے پہنو تو تب بھی سکون اور اگر سادہ سا لباس زیب تن کرو، تب بھی راحت تھی۔۔ صبح کے پونے آٹھ بجے تھے۔۔ میں نے فون پر کچن کو چائے کا کہا اور اپنے کمرے سے باہر آ کر کھلے لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ جو ویٹر چائے لایا اس نے وہیں میرے لیے ایک کرسی اور تپائی بھی رکھ دی۔۔ صبح کی چائے، خنک ہوا جو کھڑکی سے آتی تھی اور سگریٹ کا کش اور بے فکری۔۔ اس سب نے مل کر طبیعت کو شادماں کر دیا تھا۔۔ بچے ابھی تک عالم استراحت میں تھے مگر اٹھنے سے پہلے کی بے چین کروٹیں لے رہے تھے۔۔!

ویٹر کے دور جاتے قدموں کی چاپ کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔۔!

پھر کسی سینڈل کی باریک ایڑی کی محتاط اور احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم اٹھاتی ٹک ٹک کی آواز دور سے چلی اور نزدیک آتی چلی گئی۔۔!

لگتا تھا کہ مجھے واہموں کی بیماری نے آن گھیرا ہے۔۔ مجھے رقص کرتا درویش فرشتہ لگتا ہے۔۔ ملنگوں کی دھمال کسی اور دنیا میں بہا کر لے جاتی ہے۔۔ صوفیوں کے درباروں میں اڑتے اور پھڑپھڑاتے کبوتر عالم وجد میں نظر آتے ہیں۔۔ پرندوں کو ڈالنے والا دانہ پکھراج، الماس، یاقوت اور عقیق بن کر دکھائی دیتا ہے۔۔ قصیدہ بردہ شریف، مجھے الہامی موسیقی بن کر اپنی روح میں سرسراتا ہوا لگتا ہے۔۔ پھر یہ سفلیت اور معصیت کیوں ہے کہ ٹک ٹک کی آواز کسی سینڈل کی لگتی ہے۔۔!

غالباً میری نیند ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔۔ میں چائے کی چسکی اور سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بھی عالم خواب میں ہوں۔۔ اور میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ادھورے خواب بے معنی اور بے چین کن ہوتے ہیں۔۔!

مجھے اپنی وہ نظم یاد آئی، جس کا عنوان تھا، بلکہ ہے۔۔ ''ادھ کھلی آنکھ سے دیکھا میں نے۔۔''

اس نظم کا خیال آتے ہی میں نے اپنی آنکھوں کو ادھ کھلا ہی رہنے دیا۔۔!

منظر کچھ دھندلایا۔۔ پر نظر آیا۔۔ پھر سٹ کر اوپر جاتی سیڑھیوں کی آڑ میں تحلیل ہو گیا۔۔!

پتہ نہیں۔۔ غالباً میں سو ہی گیا تھا۔۔ یا شائد چائے میں کوئی نشہ آور ملاوٹ تھی۔۔ یا میں چائے میں نکوٹین کی راحت محسوس کرتے کرتے، آج کے بھرپور اور پُر مشقت دن کے لیے توانائی ذخیرہ کرنے میں بذریعہ قیلولہ مصروف ہو گیا تھا۔۔!

ایک چھریرا، دبلا بھرپور بدن، سیاہ برقعے میں ملبوس، ہاتھ میں چند کتابیں، بازو کے برابر میں ایک نوجوان میری میز کے سامنے آئے۔ نصف نقاب سے جھانکتی کاجل بھری مضطرب آنکھیں مجھے دیکھ کر ٹپٹائیں اور

دونوں سائے تیزی کے ساتھ مزید اوپر کی منزل میں جانے والی سیڑھیاں چڑھ گئے۔۔ میں نے اپنا واہمہ سمجھ کر درگذر کر دیا۔۔!

ابھی چند منٹ اور گذرے تھے کہ پھر ایسے ہی واہمے کا شدت سے احساس ہوا۔۔ اب کی بار وہ چار تھے۔ دو برقعے اور دو عاشق۔۔ وہ بھی اوپر تیزی سے سدھار گئے۔۔!

ابھی کچھ زیادہ وقفہ نہ آیا تھا کہ پھر ایک برقعہ اور ایک چادر میں احتیاط سے لپٹا ہوا نازک بدن، ایک نوجوان کے ساتھ میرے سامنے سیڑھیوں سے ظاہر ہوئے اور ان ہی اوپر والی سیڑھیوں میں چڑھ کر غائب ہو گئے۔

سب نازک بدنوں میں ایک قدر مشترک تھی اور وہ تھی بازو کے حصار میں کتابیں۔۔!

یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔۔!

چائے ختم ہو گئی۔۔ بیرا برتن اٹھانے آیا۔۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"۔۔کیا اوپر بھی کمرے ہیں۔۔؟"

"۔۔جی جناب۔۔ بالکل۔۔" وہ ذرا سی بائیں آنکھ دبا کے بولا۔

"۔۔سر، آپ کو بھی اوپر کمرہ مل سکتا ہے۔۔"!

میں نے جواباً کہا۔۔ "میرے پاس یہ شاندار کمرہ ہے تو۔۔"

کہنے لگا۔۔ پوری مکاری اور شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ۔

"۔۔اوپر والے کمرے پوری طرح سجے ہوئے ہیں۔۔"

"۔۔کیا مطلب۔۔؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"۔۔سر، کمرے کے ہمراہ کنواری کنیائیں بھی ہیں، اسکول اور کالج کی ہیں۔۔ ایک گھنٹے سے چھ گھنٹے تک کا ریٹ بڑا مناسب ہے۔۔ سر، مزا نہ آئے تو ڈبل پیسے واپس۔۔ پوری گارنٹی ہے سر۔۔ آپ حکم تو کریں، کڑوا پانی پسند ہو تو وہ بھی حاضر کر دیا جائے گا! دیسی پسند ہو تو دیسی، ولایتی چاہیں تو ولایتی۔۔ سر، ایک سے ایک حسین اور نازک ڈائمنڈ ہے۔۔ بس، آپ یس کر دیں۔۔ ریٹ بتاؤں سر۔۔ میرا کمیشن الگ ہو گا۔۔"

میں ہکا بکا اس کی مکروہ شکل دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔۔ وہ شاید سمجھ گیا کہ میں اس کے مطلب کا بندہ نہیں ہوں۔۔ گھبرا کے بولا۔

"۔۔سر، میں مذاق کر رہا تھا۔۔ سوچا، اگر اتنی سی بات سے سر جی کا دل خوش ہوتا ہے تو کہنے میں کیا ہرج

ہے--- سر، اوپر شکایت نہ کیجئے گا، میں معافی چاہتا ہوں--"

بچے بستروں سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی، جو کارگر رہی۔

"--- بچو، جوانوں جلدی سے اٹھ جاؤ--- اگر دوسرے کمروں کے لوگ اٹھ گئے تو تمہیں نہانے کو فقط ٹھنڈا پانی ملے گا، ابھی تو پانی گرم ہے--- ابھی نہا لو--- پھر لاہور جا کر ہی نہا سکو گے--- صحرا میں تو منہ دھونے کے پانی کا بھی امکان نہیں ہے--"

یہ اطلاع کارگر رہی--

"--- جس نے شیو کرنی ہے، کر لے، ورنہ صحرا میں مجنوں بنا پھرے گا--"

چند منٹ میں وہ سب ہو گیا، جو ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا--- ابھی سامان باندھ ہی رہے تھے کہ کرامت علی آ گیا--

"--- آغا جی، پندرہ منٹ میں نیچے آ جائیں--- سامان کمرے کے باہر رکھ دیں، وہ ہم خود لے جائیں گے۔ کوچ کی چھت بھی پیک کرنی ہے--"

جب ہم چلنے لگے تو کمرے کی شیشے کی کھڑکی سے نگاہ نیچے پڑی۔ ہمارا بلکہ سب کا سامان کوچ کی چھت پر لد چکا تھا۔ اب ایک عدد جنریٹر، پیٹرول اور پانی کے بڑے بڑے کین اوپر رکھے جا رہے تھے۔ پتیلے، گیس سلنڈر، انڈوں کے کریٹ، ڈبل روٹیوں کا کارٹن، سبزی سلاد کے تھیلے چھت پر ٹھونسے جا رہے تھے۔ گویا لق دق صحراؤں کی طرف چلنے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی--!

پارکنگ میں ایک بڑا سایہ دار درخت تھا، جس کے گرد گملوں کا ایک فینسی دائرہ لگا تھا، جس میں سلاد یعنی کاہو لگا عجیب بہار دے رہا تھا۔

کوچ ڈرائیور خرم شہزاد میرے پاس آیا--- کہنے لگا۔

"--- آغا جی--- کہیں تو دو چار گملے سلاد ہمراہ رکھ لیں--"

"--- ضمیر مانتا ہے تو رکھ لو--" میں نے کہا۔

"--- اوہ--- نو سر--"

میں واش روم سے نکل کر گیٹ پر آیا تو اسی بیرے سے آمنا سامنا ہو گیا--- دیکھتے ہی بولا--- "سر جی جا رہے ہیں--- بڑے ہی اعلیٰ نگینے آپ نے مس کر دیے ہیں--"

''--ابے بکواس نہ کر--رکھ کے چانٹا ماروں گا تجھے--''

''--سر جی، آپ تو مائنڈ ہی کر گئے--آپ سے مذاق چلتا ہی ہے--'' وہ بولا۔

''--لعنت تیری شکل پر--''

''--او کے سر خدا حافظ--پھر کبھی آ ئیں تو مجھے یاد رکھیے گا، بڑے اعلیٰ پیس ہیں میرے پاس، تو ہیں نکور، لش پش کرتے--'' وہ آنکھ دبا کے بولا اور پکن میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا--!!!

بہاولپوری روایتی ناشتہ، اسی ڈیزائن اور قبیل کے ریستوران میں فراہم کیا گیا کہ جیسے ریستوران کبھی پچیس تیس چالیس سال پہلے لاہور کے اندرون شہر اور اس کے باہر جی ٹی روڈ پر ہوا کرتے تھے--ہو سکتا ہے کہ آج اگر نئی نسل کو ان کا نقشہ بتایا جائے تو بچے حیران بلکہ پریشان ہی ہو جائیں--مگر یہاں بہاول پور میں اس انداز اور ڈیزائن کو جب ہم نے ان ہی حالوں اور ماحول میں دیکھا تو سوچا کہ اس کے نقشے اور ماحول کا ذکر ضرور کر دیا جائے۔ کیوں کہ جب جدیدیت ان پرانے شہروں میں اپنا زور پکڑے گی تو یہ قصہ پارینہ ہو جائیں گے--!

تین سیڑھیاں کشادہ چڑھ کر ایک وسیع و عریض ہال؛ ہال کا احاطہ شروع ہوتے ہی دائیں بائیں، فرش تا چھت بڑے بڑے سفید شیشے کہ جن کو بس اتنا صاف کیا گیا تھا کہ اندر کے ماحول کا دھندلا مگر واضح عکس باہر سے دکھائی دیتا ہو--غالباً ان پر جمی چکنائی کو بس صرف واجبی سا گیلے جھاڑن سے اتنا اتارا گیا تھا کہ چکنائی اور مٹی کے دھندلے گول دائرے غور کرنے پر صاف نظر آتے تھے۔ بائیں طرف کی لمبی دیوار کے ساتھ باپردہ کیبن؛ ہر کیبن کے درمیان میں دیوار سے لگی ایک میز اور دونوں طرف دو دو لوگوں کے بیٹھنے کے لیے سیٹی نما گدے دار بنچ۔ کیبن میں چھت کے قریب لگا ایک چکنائی سے آلودہ دھندلا بلب۔ یہ جوڑوں کے لیے جنت سے کم ماحول نہیں تھا--مگر یہ جنت اس وقت بنتا ہے کہ جب جوڑا کیبن کے دروازے پر پڑا، دبیز اور غلیظ پردہ اپنے کیبن کے دروازے پر کھینچ دیتا ہے--پردے اور معانقے کی یہ سہولت آج کے ریسٹورانٹس میں قصہ پارینہ ہو چکی ہے مگر اللہ کے فضل سے یہاں پوری قدیمی روایت کے ساتھ موجود تھی--دیکھ کر یک گونہ سکون ملا کہ ماحول، تڑپتے دلوں کی تھوڑی سی بھڑاس نکالنے کو بہر حال موجود تھا۔ اگر بیرے سے اچھی سلام علیک بذریعہ حضرت قائداعظم ہو جائے تو سکھ، چین اور دل و جان کے ارمان نکالنے کو سب میسر ہو جاتا ہے--!

ریستوران کے درمیانی ہال میں ایک میز اور چار کرسیوں کی روایت تھی مگر ہماری ٹیم کے لیے سر دست

میزوں کو قطار میں جوڑ کر چاروں جانب کرسیاں خصوصاً لگوائی گئی تھیں۔ اندر ایک شیشے کا الماری نما کاؤنٹر تھا کہ جس کے پیچھے کبھی کبھی پہلوان جی براجمان ہوتے ہوں گے۔ پہلوان جی سے مراد مالک کم مینیجر صاحب ہیں۔ کاؤنٹر کے اندر بیکری کے کیک، بسکٹ، ٹیشو پیپرز ایسے بکھرے ہوئے کہ دیکھ کر خواہ مخواہ گھبراہٹ ہونے لگے--داخلے کے شیشوں والے دروازے سے انسان کے علاوہ مکھیوں کی آمد و رفت بلا معاوضہ اور بے روک ٹوک تھی--دروازے کے باہر دائیں طرف پوریاں تلی جا رہی تھیں اور تندور میں نان لگ رہے تھے، جب کہ بائیں طرف بہت سے چمکتے ہوئے پتیلے قطار میں رکھے تھے کہ جن پر بجی ہوئی کالی میل زدہ ٹاکی، چھوٹا ہر تھوڑی دیر بعد پھیر کر چمکاتا تھا--پتیلوں کے پیچھے پہلوان جی آسن جمائے بیٹھے تھے اور ہر کسی پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے اور رقمیں بھی وصول کیے جاتے تھے--!

یہاں ہمارا دیسی روایتی ناشتہ تھا--لگتا تھا کہ ہم لوگوں کی آمد کی خوشی میں صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بہت سی ناگواری، گوارا میں بدل گئی تھی--!

ناشتے میں حلوہ پوری اور بھاجی، میٹھے اور نمکین پوڑے بھی آئے--میٹھے پُوڑے تو ہم نے لاہور میں بھی تناول فرمائے تھے مگر نمکین پوڑے یہاں پہلی بار دیکھے اور چکھے--! گرما گرم، تازہ بہ تازہ مکوں والے نان، جن کو نان بائی کلچہ کہتا ہے، اس کے ساتھ چنے نہیں بلکہ "چکڑ چھولے" بہ طور سالن تھے--ابلے ہوئے انڈے اور حلوہ بھی ہمراہ تھا--جس کا جو دل چاہے کھائے اور کمپنی کے حق میں دعائے خیر کرے--ہم نے بھی خوب پیٹ بھر کے کھایا اور دعائیں دیں۔ کیوں کہ بتا دیا گیا تھا کہ اب کھانا بعد دوپہر صحرا میں ملے گا--سو جو کھانا ہے کھا لو، پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی--اور کہنا نہیں کہ ہم بھوکے پیاسے رہ گئے--چائے حسب دستور شیشے کے گلاسوں میں، وافر چینی کے ساتھ عنایت کی گئی--میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ لگتا ہے کہ یہاں کے لوگوں میں شوگر لیول بہت لُو پایا جاتا ہے--!

یہ اس سفر کے دلچسپ مرحلے ہیں کہ یقین کامل ہے کہ اگر ہم خود سے سفر کریں تو ان مراحل سے یقیناً محروم رہیں گے--یہ سب ہماری زمینی اور قدیم روایات کا عکس تھا۔ جس کا ذکر ہر اس شخص کے لیے باعث توجہ اور دلچسپی ہو گا جو اس انداز تہذیب سے اس لیے ناآشنا رہتا ہے کہ اس کا گذر ایسی جگہوں سے کبھی نہیں ہوتا--مگر یہ ہماری پاکستانی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا حصہ ہے--!

لیجیے صاحب--ناشتے سے فیض یاب ہوتے ہی خرم شکیب صاحب کوئی نیا اعلان کرنے یا ہدایات دینے

کو تشریف لے آئے۔

"--دیکھئے جناب--اب ہم چولستان کے صحرا میں ہی جا کر دم لیں گے--وہاں شاید پینے کا پانی نایاب ہوگا--طہارت اور منہ دھونے کے لیے بھی پانی ملنے کی کوئی خاص امید نہیں ہے--سو پانی کا اپنا اپنا بندوبست یہیں سے کر لیجئے--ہر بندہ اپنے لیے کم از کم تین سے چار بوتلیں پانی یہیں سے خرید لے--وہاں کار ریلی کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ پانی کم یاب ہو جائے۔اس لیے احتیاط ضروری ہے؛ اور ہاں--ایک کام اور بہت ضروری ہے--ابھی ہم کسی بڑے میڈیکل اسٹور پر گاڑی کو روکتے ہیں--آپ لوگ وہاں سے "وٹ ٹیشو" کے بنڈل حسب ضرورت ضرور خرید لیں--"

کسی من چلے نے پوچھ ہی لیا--"وہ کیوں جناب--"

خرم شکیب نے اپنی مسکراہٹ ضبط کر کے کہا۔

"--اس لیے کہ پانی سے منہ دھونے کی بجائے اپنا چہرہ اور چہرے پر پڑی گرد اس سے صاف کر لیجئے گا--یقین مانیں کہ آپ لوگوں کو اس سے منہ ہاتھ صاف کر کے، ہر بار منہ دھونے کا سا لطف آ جائے گا اور--اور--"

خرم شکیب مزید کچھ کہتے کہتے رک سا گیا--کسی من چلے نے پوچھا اور کہا--بتا دیں ناں--!

"--اور یہ کہ--اور یہ کہ آپ اس ویٹ ٹشو سے وہ کام بھی بہ وقت ضرورت لے سکتے ہیں جو پانی سے بھرے لوٹے سے رفع حاجت کے بعد لیا جاتا ہے--"

یہ کہہ کر خرم شکیب تیزی سے شرما کر پہلوان جی کے پاس چلے گئے اور حساب بے باق کرنے میں مصروف ہو گئے--!

محمود احمد اور رضوان ملک نے بھرپور قہقہہ لگایا اور بیک زبان بولے۔

"--چلو جی--پھر چل کر ولایتی لوٹے لیتے ہیں--آپاں کو لوٹا دن میں تین بار درکار ہوتا ہے--"!!!

باب ۱۶

چولستان سے محبت کی کہانی
جو پہاڑوں سے اُتر کر صحرا میں دَم لیتی ہے--!

جس کسی نے صبح صبح پو پھٹتے ہی آسمان کی روشن ہوتی، خواب ناک فضاؤں میں طوطوں کے جھنڈ اڑتے دیکھے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان طوطوں کی رفتار اور پرواز کس قدر تیز اور اپنے اپنے رُخوں پر تیر کی طرح سبک ہوتی ہے--

وہ ایسے ہی سبک انداز میں گاڑی کو ڈرائیو کر رہا تھا--!

قلعہ دراوڑ بہاول پور سے پورے ۷۶ کلومیٹر پر صحرائے چولستان میں تھا--!

صاف لگتا تھا کہ فرخ شہزاد کوچ چلا نہیں رہا بلکہ اس قدر تیز رفتار ہے کہ جیسے سب کچھ سلوموشن میں ہو--لگتا تھا کہ پرندہ ہوا میں اڑ نہیں رہا تیر رہا ہے--ہائی وے، جس کا رخ رحیم یار خان کی طرف تھا، صاف شفاف تھی--ٹریفک بھی بہت کم تھا--اکثر گاڑیاں جو راستے میں مل رہی تھیں، چولستان کار ریلی کے جھنڈوں، اسٹیکروں اور فلیکس سے آراستہ تھیں--بہت سی ایسی جیپیں کاریں بھی روڈ پر رواں دواں تھیں کہ جن پر چولستان جیپ ریلی کے الاٹ کردہ نمبر، بڑی خوبصورتی سے سجا بنا کر مالکان نے لگا رکھے تھے--ایک حیرت انگیز جشن کی ایسی تیاریاں تھیں

کہ جذبہ اور لگن دیکھ کر دل باغ باغ ہوتا تھا--!

وجدان، حیدر اور عمر فرحان اس چولستان کار ریلی کو دیکھنے کے لئے بہت مدت سے بے چین اور جذباتی تھے--آج اور کل ان کی مرادوں کا دن تھا--!

کوئی دو ماہ پہلے دسمبر کی بات ہے کہ ہم سب گھر والے سردی سے سکڑے اپنے اپنے کمبلوں میں بیٹھے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔کوئی پہاڑوں کی سیاحت کی بات چلی تو وجدان کہنے لگا--!

''--میری خواہش تھی کہ امریکہ حصول تعلیم کے لئے جانے سے پہلے ہنزہ، گلگت، عطاء آباد جھیل، پسو کونز اور دریائے شمشال کا وہ ملاپ دیکھ لوں جو دریائے ہنزہ میں ہوتا ہے--فیری میڈوز، بابوسر ٹاپ کے ساتھ ساتھ بتورا گلیشیر، بتورا جھیل، راما کی تین جھیلیں، لولوسر جھیل اور جھیل سیف الملوک بھی دیکھنے کی تمنا تھی، وہ بھی دیکھ لی--کشمیر میں کیرن، شاردا اور سب سے خوبصورت ٹاپ اڑنگ کیل بھی دیکھ لیا--مگر دو جگہ کی تمنا ابھی بھی باقی ہے--دیوسائی کا میدان اور چولستان--''!!!

''--اور سوات کا تو تم نے ذکر ہی نہیں کیا--''میں نے لقمہ دیا۔

''--ہاں، وہ بھی دیکھا، بہت بار دیکھا، بچپن سے اب تک بار بار دیکھا--ماہوڈنڈ جھیل اس زمانے میں دیکھی، جب ماہوڈنڈ جانا ایک آنر کا درجہ رکھتا تھا! اب تو ماہوڈنڈ مری جیسی آرٹی فیشل جگہ بن چکی، اس کی قدرتی خوب صورتی سیف الملوک کی طرح غلاظت کا شکار ہو چکی ہے۔ہم نے اُسے بہت اچھے وقتوں میں قدرتی حالت میں دیکھا تھا--پھر سوات میں دھما کہ لیک کا ایڈونچر آپ سفرنامے میں بھی لکھ چکے ہیں! اس کے سفرنامے پر آپ کو ادبی ایوارڈ بھی ملا تھا--سوات میں کئی پہاڑ سر کیے--وہ کیسے بھلایا جا سکتا ہے--''

''--اب رہ گئی ایک جگہ، چولستان--وہاں کا خواب کیوں دیکھتے ہو--''میں نے پوچھا۔

''--بابا جان--چولستان میں جو جیپ ریلی فروری کے وسط میں ہوتی ہے، اس کا گلیمر انوکھا اور ناقابل فراموش ہوتا ہے--میری دلی تمنا ہے کہ امریکہ جانے سے پہلے یہ ایڈونچر بھی ضرور دیکھوں--اور پھر اسی صحرا میں قلعہ دراوڑ ہے--جس نے چولستان صحرا میں قلعہ دراوڑ نہیں دیکھا تو سمجھو کہ پاکستان کا کوئی قدیم قلعہ نہیں دیکھا--میں نے سنا ہے کہ وہ آسیب زدہ قلعہ ہے--؟''

''--لوگ یونہی باتیں مشہور کر دیتے ہیں--میں بھی چولستان صحرا میں قلعہ دراوڑ کا خواب دیکھتا ہوں--شاید اللہ پورا کر ہی دے--خوابوں کی اکثر تعبیریں مالک کائنات کے اختیار میں ہوتی ہیں--اللہ بہتر

کرے گا، جو اللہ کو منظور---"!

وقت اپنی رفتار سے گزرتا گیا۔یہاں تک کہ فروری کی چھ سات تاریخ آ گئی۔

اب وجدان روزانہ ہی اپنی چولستان جانے کی خواہش کا اظہار کرنے لگا۔مگر مجھے کسی بھی سمت سے وہاں کا سفر دکھائی نہ دیتا تھا۔

انہی دنوں وجدان کا اپنے دوستوں کے ساتھ سوات کی سیر کا پروگرام بن گیا۔مگر وہاں جاتے ہوئے وجدان نے پھر مجھ سے کہا کہ آپ عمر جاوید بھائی سے بات تو کریں۔ہو سکتا ہے کہ ان کی کمپنی کا ایسا کوئی پروگرام بن رہا ہو۔

میں نے اسی شام عمر جاوید کو فون کیا---وہ کہنے لگے کہ کچھ دن پہلے چولستان ٹیم بھیجنے کا ارادہ تھا---لوگوں نے کوئی رسپانس ہی نہیں دیا، اس لئے یہ ایڈونچر ملتوی کر دیا ہے۔لیکن ہم چار ہیں اور آپ کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔کچھ کریں مہربانی فرما کر---جواب آیا کہ کوشش کرتے ہیں، اگر بارہ تیرہ لوگ بھی تیار ہو گئے تو سمجھیں چولستان ٹور ہو گیا---

شام چھ بجے عمر جاوید کا مجھے فون آیا---اگر آپ چاروں تیار ہیں سو فیصد تو ایک پارٹی پانچ لوگوں کی انٹرسٹڈ ہے---آپ کہتے ہیں تو ان سے پیسے پکڑ لوں---؟

میں نے کہا، میں رات نو بجے کے قریب کنفرم کروں گا۔کیوں کہ مجھے وجدان سے پوچھنا ہے اور وہ اس وقت سوات میں مالم جبہ سے بحرین کے درمیان کار ڈرائیو کر رہا ہے اور سگنلز کی وجہ سے رابطہ ممکن نہیں ہے---رات ساڑھے آٹھ بجے وجدان سے رابطہ ہوا۔میں نے اسے صورت حال سے مطلع کیا---اس نے کہا بس پندرہ منٹ ٹھہر جائیں، میں حیدر اور اس کے دوست عمر فرحان سے کنفرم کر کے بتاتا ہوں---اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد چولستان کا سفر کنفرم کر دیا گیا---

پھر اللہ نے ایسی عمر جاوید کو برکت دی کہ دو دن میں جانے والوں کی تعداد بیس تک پہنچ گئی---میں نے عمر جاوید سے درخواست کی کہ خرم شکیب کو ٹیم انچارج بنا کر ہمارے ساتھ کریں تو مزا آ جائے گا---کہنے لگے وہ ابھی تین دن پہلے فیری میڈوز سے واپس آیا ہے۔انکار نہ کر دے کہیں---میں نے کہا اس کو میری خواہش بتائیے گا، وہ ضرور راضی ہو جائے گا۔ورنہ ہمیں تو سفر کا خاک مزا نہیں آئے گا---خرم شکیب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سفر میں جان ڈال دیتا ہے---تھوڑی دیر بعد عمر جاوید نے بتایا کہ خرم آپ کے ساتھ سفر پر تیار ہو گئے ہیں---کہتے ہیں کہ اگر آغا

صاحب کا ساتھ ہے تو انکار کی گنجائش نہیں ہے--!

یوں چولستان کا خواب بگڑتے بگڑتے بن گیا--اس وقت، ہر گذرتے لمحے کے ساتھ چولستان ہمارے قریب آ رہا تھا یا ہم اس کے پاس ہوتے جا رہے تھے--!

مرکزی ہائی وے پر جگہ جگہ سرکاری طور پر چولستان کار ریلی کے بڑے بڑے بل بورڈ آویزاں تھے--گویا یہ نئے آنے والوں کے لیے راستے کی رہنمائی کا کام بھی دے رہے تھے۔ کوچ بڑی سڑک سے ایک ذیلی سڑک پر اتری اور احساس ہونے لگا کہ یہاں چولستان میں تو جشن کا سماں ہوگا--رنگ برنگی جھنڈیوں، محرابوں اور فلیکس بورڈوں سے نا صرف راستے کی نشاندہی ہو رہی تھی بلکہ ان رنگین بورڈوں کو دیکھ کر چولستان کار ریلی کی بین الاقوامی اہمیت کا اندازہ بھی ہو رہا تھا--!

ہم احمد پور شرقیہ کے قصبے کے مرکزی بازار میں کھڑے تھے--!

صحرا میں ریت کے بے طرح جھکڑوں سے بچنے کے لئے سب ہی لوگ پرنے خریدنے کے لئے پرنوں والی دکان پر دھاوا بولے ہوئے تھے--!

بھرے بازار میں نیم کے درخت کے نیچے کبوتر دانہ چگ رہے تھے اور ملنگ بے خودی میں رقص کر رہا تھا--!

''--دم گٹ کوں--دم گٹ کوں--''

ملنگ کے گھنگرو والے چمٹے سے ایک بول کی لے ابھر رہی تھی--!

''--دم مست قلندر علی علی--''

''--دم دم دے اندر علی علی--''

پچھلی نشستوں سے ایک دبی دبی آواز آئی--

''--آخر یہ ملنگ لوگ ایک ہی نام کیوں جپتے ہیں--کسی اور ہستی کا نام ان کو نہیں ملتا کیا--؟؟؟''

''--اگر ہے تو تم بتا دو ناں--''

فاطمہ نے بہ آواز بلند جواباً کہا--کوئی جواب نہ آیا--سکوت اور خاموشی میں انجن کی آواز سب آوازوں پر بھاری ہوگئی--!

☙

باب ۱۷

خواجہ غلام فریدؒ کے دیس میں
جہاں صوفی بستے ہیں، حق ہُو کی صدائیں ہیں

الف اللہ، چنبے دی بوٹی، میرے مرشد من وچ لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی دے کے، ہر رگے ہر جائی ہُو
جگ جگ جیوے میرا مرشد سوہنا، جس اے بوٹی لائی ہُو

اے وے اللہ والے یاں دی جھگی جی
اے وے نبیؐ پاک دی جھگی جی
اے وے مولا علیؓ دی جھگی جی
اے وے میرے پیر دی جھگی جی
اے وے سرسبز دی جھگی جی

چھڈ دے دنیا دے جن جال
ایتھے کج وی نیں بنا بندے یاں نال

رکھیں ثابت صدق اعمال

دم گٹ کوں، دم گٹ کوں، گٹ کوں گٹ کوں

مجھے لگتا تھا کہ احمد پور شرقیہ کی فضا کے ذرّے ذرّے میں صوفیت کا نشہ گھلا ہوا تھا۔ جن کے گوشت پوست میں ذات الٰہی کے وجد کی ذرہ بھر بھی آمیزش تھی، وہ خود بخود اس نشے سے خود کو سرشار محسوس کرتے تھے، جو اس سے بے زار اور مبرّا تھے، وہ ایسی موسیقی کے دلدادہ تھے، جو انسانی ذہن اور روح میں کثافت گھولتی تھی--سو یہی حال یہاں بھی دیکھنے کو مل رہا تھا--!

پتہ نہیں کیوں لگتا تھا کہ چولستان کا یہ خطہ صوفی ازم کے ماورائی ماحول اور اثر کے زیرِ نگیں ہے--!

کلام چاہے سلطان باہو کا ہو یا بابا بلھے شاہ یا بچل سرمست کا سب میں محبتوں کے مرکز ذات باری تعالیٰ کے گرد رقص جنوں کرتے نظر آتے ہیں--جہاں میں اس وقت کھڑا ہوں، وہ زمین خواجہ غلام فرید کی زمین ہے کہ کبھی وہ اس دھرتی پر سفر کرتے تھے اور اسی میں دفن ہیں--یہ وہ اللہ والے لوگ اور ہستیاں ہیں کہ ان کے مزاروں پر دن ہو یا رات کلام الٰہی کی برکات، تلاوت کی صورت میں جاری وساری رہتی ہیں--یہی دلیل عارفانہ ہے کہ کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قربت الٰہی ایسی تھی کہ بعد از مرگ ان صوفیا کو ہمہ وقت سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص اور کلام پاک کی بابرکت تلاوت سے نواز دیا گیا--یہی اشارہ ان کے بقائے دوام سے ہم کنار ہونے کی دنیاوی دلیل ہے۔ پھر ان کی شاعری کو عارفانہ درجہ دے کر زبان زدعام کے مرتبے پر فائز ہونے کا اعزاز بخش دیا گیا--!

اُدھر کچھ ایسے بھی ہیں کہ مرنے والے کو ایک فاتحہ، ایک آنسو اور ایک چھوٹی سی سورہ کے ثواب سے بھی محروم کر دیتے ہیں--اور اسی کو اس کی اور اپنی نجات کا سبب سمجھتے ہیں--!

قلعہ دراوڑ میں بسنے والے نوابوں کو خوش نصیبی سے خواجہ غلام فریدؒ کی قربت اور محبت نصیب ہوئی--!

خواجہ غلام فرید کو روہی (چولستان صحرا) کی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اسی لیے وہ اپنی کافیوں میں روہی کی دوشیزاؤں کے حسن و جمال کا نقشہ خوبصورتی اور دل کی لگن کے ساتھ بیان کرتے ہیں

وچ روہی دے رہن دیاں نازک نازک جٹیاں

راتیں کرن شکار دلاں دے ڈیہاں ولوڑن مٹیاں

قلعہ دراوڑ کے مکینوں کو خواجہ غلام فریدؒ سے خاص انسیت تھی اور جب کہ ادھر خواجہ غلام فرید بھی ان پر اپنی

روحانی نظر کرم رکھتے تھے--لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی پوری ۵۶ سالہ زندگی میں ایک بار بھی نہ تو قلعہ دراوڑ میں گئے اور نہ ہی نوابوں کے کسی محل میں اپنا قدم رکھا--نواب صادق اور دیگر نوابین خود چل کر فقیر کے تکیے، حجرے، آستانے پر قدم بوسی کے لیے آنا باعث سعادت سمجھتے تھے--اگر کسی پریشانی یا مسئلے میں گرفتار ہوتے تو خواجہ کے در پر آتے، درخواست کرتے، انتظار کرتے، چند لمحے کی ملاقات کرتے، خواجہ کا جواب سنتے اور کسی تردد کے بنا چلے جاتے--جو وہ رہنمائی دیتے اس پر عمل کرتے--یہ وہ چولستان کے نواب اور امیر تھے کہ جب ان کی سواریاں قلعہ دراوڑ سے برآمد ہوتیں تو لوگ ایک لمحے کے سلام اور دیدار کے لیے دھوپ میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا باعث سعادت سمجھتے تھے--لیکن فقیر کے حجرے کی کچی زمین پر یہی نواب، خواجہ کی ملاقات کے منتظر ہوتے تھے--!

افسوس آج کے زمانے میں نہ ایسے صوفیا ہیں اور نہ ہی ایسے زانوئے ادب تہہ کرنے والے ہیں--!

کاروبار کی دنیا گرم ہے--مال و زر سمیٹنے کے بازار سجے ہیں--چالاکی اور چال بازی کے جدید سائنسی ہتھکنڈے ہیں اور یہ دنیا ہے--!

اور اگر آج کے دور میں خواجہ غلام فرید، سلطان باہو، سرمست اور قلندر جیسی نیک روحیں ہیں بھی تو ان کا ذکر کہیں نہیں ملتا--لگتا ہے کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے، وہ اپنے حجروں کے دروازے خاموشی سے بند کئے ذکر الٰہی میں مگن ہیں--اگر وہ اللہ کے بندے ایسا نہ کریں تو بہت سے مافیا، ان کو خبر ہوئے بغیر ان کو بیچ کر کھا جائیں--ان کو پتہ بھی نہ چلے کہ اس ہمدرد مرید نے کب اور کہاں اور کتنے میں ان کو فروخت کر دیا--اور وہ کب اللہ کے ولی کو ٹیشو پیپر کی طرح استعمال کر کے ڈسٹ بن کے سپرد کر دے--!

اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کا زمانے کی بے مہر نظروں سے پوشیدہ رہنا ہی ان کے لیے اور ہمارے لیے بہتری کا سبب ہے--!!!

میں چونکہ اس وقت احمد پور شرقیہ میں سے گذر رہا ہوں تو آپ کو ایک بردباری، تحمل اور صوفیت کے حوالے سے ایک واقعہ سناتا ہوں۔

بہاول پور کے نوابوں میں سب سے زیادہ ذکر صوفیت کے حوالے سے نواب محمد صادق سوم کا ملتا ہے۔ان ہی کے دور میں خواجہ غلام فرید بھی ہم عصر تھے--

یہاں احمد پور شرقیہ میں ایک بزرگ مولانا محمد احمد بھی ہوتے تھے--اس زمانے میں ہندوستان میں نیا نیا دیوبندیت کا چرچا ہوا تھا--ان کو یہ مسلک اچھا لگا اور انھوں نے اس کو قبول کر لیا اور سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ یہ

خواجہ غلام فریدؒ لوگوں کو بے راہ رو کر رہا ہے-- یہ خبر نواب صادق اور خواجہ غلام فرید کو بھی پہنچ گئی -- اس خبر کا خواجہ غلام فرید کو ملنا تھا کہ انھوں نے اسی وقت اپنا رختِ سفر باندھا اور سیدھے احمد پور شرقیہ مولانا محمد احمد کے گھر پہنچ گئے-- وہاں دیکھا کہ مولانا صاحب ہجرت کے لئے گھر کا سامان باندھے بیٹھے ہیں اور جن لوگوں سے لین دین ہے، ان کا حساب بے باق کرنے میں مصروف ہیں-- خواجہ غلام فریدؒ نے مولانا صاحب کو اس ہجرت کا کام کرنے سے روکا اور کہا کہ مغربین کی نماز آپ پڑھائیں گے-- ساتھ ہی خواجہ نے قلعہ دراوڑ میں نواب صادق کو پیغام بھیجا کہ میں یہاں احمد پور شرقیہ پہنچ چکا ہوں، آج شام نماز مغربین مولانا محمد احمد کی اقتداء میں ہوگی، آپ بھی فوراً احمد پور شرقیہ مغرب سے پہلے پہلے پہنچ جائیں-- نواب صادق یہ اطلاع پا کر حیرت زدہ رہ گئے مگر خواجہ غلام فریدؒ کے حکم کی سرتابی ممکن نہ تھی-- فوراً پہنچ گئے--!

نماز مغربین مولانا محمد احمد کی امامت میں ہوئی۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست بدری کے احکامات واپس ہو گئے-- مولانا صاحب صوفیت کے قائل ہو گئے-- حالات پھر اسی طرح سے سازگار ہو گئے-- اور احمد پور شرقیہ میں مذہبی اعتدال پسندی کا بول بالا ہو گیا--!

اگر ہم غور کریں تو موجودہ عہد کے سو برسوں میں ہمیں کوئی ایسا ملنگ، درویش اور حجرہ نشین اللہ والا درویش نہیں ملتا جو اپنے اسلوب کا حکمت بھرا شاعر ہو-- برصغیر کے جن صوفیاء کا نام صوفیت کے آسمان پر درخشاں ستارہ ہے، وہ سب کے سب ایسے مزاج کی شعریت بیان کرتے تھے کہ ایک کا اسلوب، دوسرے سے جدا بھی ہے مگر آفاقیت کی سطح پر یک جان نظر آتا ہے-- آج کا نام نہاد صوفی علمی، سماجی اور اخلاقی افکار سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا-- صرف تعویذ گنڈوں، جھاڑ پھونک اور صدقہ خیرات کے لیے مال کا متلاشی اور فکرِ دولت کی غلاظت میں لدا پھندا نظر آتا ہے-- ایسے حالات میں کسی باہو، فرید، شہباز، سرمست کی کیا امید کی جاسکتی ہے--!

یاد رکھیے-- کائنات کے سب سے بڑے حکمت والے نے اپنے کلام میں جگہ جگہ فقط عقل مندوں کو ہی مخاطب کیا ہے، عقل والوں کے لیے نشانیاں بنا کر دی ہیں، عاقلوں سے ہی ہم کلام ہوا ہے-- اس نے کہیں ایک جگہ بھی نہیں کہا کہ یہ نشانی احمقوں اور بے وقوفوں کے لیے ہے-- وہ صرف عقل والوں سے مخاطب ہونا پسند کرتا ہے-- یہی حکمت اعلیٰ ہے۔ اسی لیے بہت سی تحریریں دنیا میں عام لوگوں اور ناقص عقلوں والوں کے لیے نہیں ہوا کرتیں-- اور ان عام سے لوگوں کو ان تحریروں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہوا کرتی۔ ان کو کھانے، پہننے اور دکھاوے سے دلچسپی ہوتی ہے، جو مٹ ہی جانا ہے--!!!

باب ۱۸

زرخیزی، دشتِ ویراں میں بدلتی ہے
کبھی نخلستان اور کبھی صحرا جھلک دکھاتے ہیں--!

دو رویہ سرسبز اور ہریالے درختوں کی رومان انگیز چھاؤں میں سرمئی تیرتی سڑک چولستان کے ریتلے میدانوں اور صدیوں سے کھڑے قلعے، دراوڑ کی طرف جاتی تھی۔

سڑک کے دونوں طرف درختوں کے تنوں کی قطاروں کے پیچھے دہقانوں کے کھیت سبزے کی ہری چادر اوڑھے، ایسے سرشار اور شنیل کے دوشالے کی طرح بچھے تھے کہ دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا-- غالباً دھوپ میں موجود زم خوالٹراوائلٹ نے اس سبزے کو پولا ئزر فلٹر سے گذار کر جاذب نظر بنا دیا تھا-- میرا یہ بھی خیال تھا کہ سبزے کے اس رنگ روپ کی ایک وجہ فضائی کثافتوں کی غیر موجودگی بھی تھی-- کہ ہریالی کے تمام رنگ اپنی شدت اور مستی کے ساتھ جلوہ گر تھے-- یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خطے کی زرد رُو مٹی میں یہ تاثیر پائی جاتی ہو کہ وہ فصلوں کی رنگینی کو نکھار کر اپنے کسان کو اپنے رنگ روپ کے جوبن کے ساتھ دکھانے پر قدرتی طور پر قادر ہو--!

ان کھیتوں کے درمیان کہیں کہیں پانی کے جوہڑ یا بہتے تنگ کھالے سورج کی روشنی کے اس پانی میں انعکاس کے سبب چاندی بن کر چمکتے تھے-- شاداب اور ہریالے کھیتوں میں چمکتے شفاف پانی کے نالے اور کھالے،

سیاہ گھنے بالوں میں بیچ سے نکلی سیدھی مانگ کی طرح اپنا جوبن اور شباب دکھاتے تھے--!

کوسٹر اس تنگ اندرونی سڑک پر ایک متناسب رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ ہماری منزل چولستان روہی میں قلعہ دراوڑ تھی۔ وہاں پہنچنے کی لگن اب جلد بازی میں ڈھل چکی تھی-- ایک ایسا خواب، جو لگتا تھا کہ کچھ ہی دیر میں اپنی تعبیر سے ہم کنار ہو جائے گا-- ایک خواب ناک طلسماتی دنیا، جس کے اپنے ہی انداز طلسم خوانی تھے۔

تقریباً ہر انسان کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ جب خواب، حقیقت پر اور حقیقت خواب سے مل کر اوورلیپ کر رہی ہوتی ہے-- یہ وہی لمحات تھے کہ خواب دیرینہ، جاگتی حقیقت میں بدل رہا تھا-- تشنگی جاگنے لگی تھی اور تیزی سے بدلتے منظر اپنی ذات کو انمول کرتے جا رہے تھے--!

ایک چھوٹا سا گاؤں ''اڈہ شاہی والا'' آیا-- مجھے لگا کہ یہ ایک خوب صورت گاؤں ہے۔ سرسبز کاشت شدہ زمین، صحرا کی سی فضا میں نگینے کا کردار ادا کر رہی تھی-- ایک پرسکون اور روایتی گاؤں اور اس میں سے گذرتی یہ تنگ سرمئی صاف ستھری سڑک۔ سڑک سے ہٹ کر کچی زمین، کناروں پر پیپلی اور سفیدے کے اونچے لمبے ڈھینگ سے سبز شاداب، گھنے اور سایہ دار درخت-- پھر کچی ہموار اور کشادہ جگہ سے پیچھے ہٹ کر دیہاتی قسم کی کندھے سے کندھا جوڑے لکڑی کے کھوکھوں سے بنی اور اشیاء سے سجی دکانیں-- اگر کوئی پکی دوکان بھی تھی تو اس نے دکانوں کی قطار اور روایت سے کسی قسم کا انحراف نہ کیا تھا-- نہ کوئی گند اور نہ کوئی غلاظت یا کوڑے کے ڈھیر تھے-- نہ کوئی رش تھا اور نہ بے طرح ریڑھیاں-- ہر شے سلیقے اور قرینے سے سجی سجائی لگتی تھی-- ترتیب اور نفاست میں تہذیب نظر آتی تھی-- میں نے بے بسی سے اس ترتیب و نفاست کو رشک بھری نظر سے دیکھا-- دل ہی دل میں ایک آہ ابھری کہ کاش میرا شہر بھی ایسا ہی ہو جائے-- دل بولا، مت سوچو ایسی باتیں، اب ایسا ہو نہیں سکتا، جو غلاظت اور بے ترتیبی اس شہر لاہور میں بھر کر پرورش پا چکی ہے، اب اس کا ازالہ ممکن نہیں ہے-- اس لیے کہ ان ہی لوگوں نے تمہارے شہر کے حسن و جمال کو پامال کیا ہے کہ جو اپنے گاووں میں گند ڈالنے پر لڑ پڑتے ہیں، وہی تمہارے شہر کو تمہارا سمجھتے ہیں، اپنا نہیں سمجھتے-- اگر اپنا سمجھتے ہوتے تو تمہیں یہ شکایت نہ ہوتی--!

اب سڑک بل پر بل کھاتی تھی-- لگتا تھا کہ موڑ در موڑ ہر زرعی مربع کے کونوں اور کناروں پر ہی آتا ہے-- ہر موڑ پر آویزاں بینرز، فلیکس اور بل بورڈز جیپ ریلی اور قلعہ دراوڑ کے بقیہ فاصلے اور راستے کی صحیح سمت رہنمائی کا فریضہ نہایت توجہ سے انجام دے رہے تھے-- کسی سے رک کر پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ مقام کدھر اور کتنی دور ہے کہ جس کے ہم، راہی ہیں--!

پھر"یزمان" کا علاقہ، بستیاں اور چھوٹے چھوٹے چند دکانوں پر مشتمل بازار آتے چلے گئے-- یہ پورا علاقہ ہی یزمان کے قدیمی نام سے مشہور ہے-- یزمان پہنچ جانے کا مطلب تھا کہ لیجئے، بس صحرا آیا چاہتا ہے--!

صحرا کی نوید اس بات کی خبر دیتی تھی کہ قلعہ دراوڑ بھی پہنچے کہ پہنچے--!

یزمان سے نکلتے ہی ارد گرد کی زمینوں کا لینڈ اسکیپ اپنے رنگ روپ بدلنے سا لگا--!

اب زمین کی مٹی کے رنگ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگے تھے-- زرخیزی، یکایک صحرا میں بدل جاتی-- پھر زرد مٹی کے وسیع و عریض میدان، اونچے نیچے ٹیلے آ جاتے، جھاڑیاں اور ریتلی مٹی نخلستان کا منظر دکھانے لگتی-- اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اب زرخیز فصلیں اور ہریالی بس عنقا ہی ہو جائے گی-- مگر پھر ان بنجر اور ویران میدانوں میں کھیتوں کی ہریالی کے سبز قطعے ذرا دیر کو سر ابھار کر گم ہو جاتے-- یہ چنے کی شاداب فصلیں تھیں کہ ان کو ہلکی سی بارش کا پانی بھی زندگی دے دیتا ہے-- میں ان کسانوں اور دہقانوں کی ہمت، محنت اور عظمت کو دل ہی دل میں سلام پیش کر رہا تھا کہ جنہوں نے اس ریگستان میں ان چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، بنجر، بے آب و گیاہ، خشک ٹیلوں کو زہریلی کانٹے دار جھاڑیاں کاٹ کر ہموار کیا۔ جفاکش دہقان نے پھر اس قطعہ زمین کی ریت سے مٹی کو چھانا-- روڑی کنکر الگ کر کے پھینکے اور اللہ کا نام لے کر چنے کی فصل لگا دی کہ اس صدیوں کی مُردہ زمین میں اس کے سوا کچھ اور لگ ہی نہیں سکتا۔ بس یہی فصل ہے کہ اس بنجر زمین کو چند سالوں میں شادابی اور زرخیزی دے دیتی ہے۔ پھر بارش کے انتظار میں حالتِ دعا میں بیٹھ گیا۔ کبھی بارش ہوئی تو فصل لہرا گئی اور نہ ہوئی تو کملا کر مر گئی-- اسی پر صابر و شاکر ہوا۔ وہ ہمارے بابا بلھے شاہ نے کیا سچ کہا تھا کہ آج بھی امر ہے۔

بندے دا کم پانی لانا، بھر بھر مشکاں پاوے

مالک دا کم پھل پھل لانا، لاوے یا ناں لاوے

ذرا اور آگے بڑھے تو صحرا میں دُور دُور ہریالی کے قطعے ناپید ہونے لگے-- باریک مٹی، موٹی ریت میں مل کر جھکڑوں کی صورت میں ہر سمت اڑتی نظر آنے لگی-- ببول کے ٹنڈ منڈ قحط زدہ بڈھے کی ہڈیوں جیسے سوکھی چمڑی کے درخت اور کانٹے دار جھاڑیوں کی بڈھی کھوسٹ مائی کی طرح جھکی جھکی زمین بوس ٹہنیاں دور دور نظر آنے لگیں--!

اب زمین کا ماحول پوری طرح بدلا ہوا محسوس ہوا، ہوا میں نمی کی بجائے خشکی نے سر ابھارا، سورج کی روشنی جو ذرا پہلے شفاف تھی، زردی مائل محسوس ہونے لگی-- زمین پر نظر پڑتی تو جہاں ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا وہاں خود بخود

ریت میں چھوٹے چھوٹے ایسے ڈمپل پڑنے لگتے، جیسے کسی ڈمپل والی کے گالوں میں مسکرانے سے یکا یک پڑتے ہیں اور پھر غیر محسوس طور پر تحلیل ہو جاتے ہیں--!

صحرا نے اپنے آنے اور ہونے کی نشانیاں دینا شروع کر دی تھیں--شیشوں سے باہر ان مناظر کو دیکھ کر سیاحوں نے بے ساختگی میں اپنے منہ سر پرنوں میں لپیٹ لیے اور خواتین نے اپنے رنگین دوپٹوں سے چہرے بے اختیار ڈھانپ لئے؛ حالانکہ اندر اے سی چل رہا تھا--!

اگلا موڑ مڑتے ہی ایک بوسیدہ گاؤں، کیکر کے کچھ درخت اور کانٹوں بھری جھاڑیاں ظاہر ہوئیں--

ببولوں اور کیکر کے مٹی کی چادر اوڑھے درختوں کی قطار جوں ہی آگے سے ہٹی، دور افق کی دھندلی لکیر پر یک دم قلعہ دراوڑ کی لمبی دیوار نمودار ہوئی--دل اس کی پہلی جھلک دیکھتے ہی اچھل کر حلق میں آ گیا--ایسا لگتا تھا کہ قلعہ دراوڑ دھندلے افق پر ایک آسیب زدہ، زمین سے اونچی اٹھی کرسی پر پردہ نشیں کی طرح وقار سے آویزاں تھا--!!!

باب ۱۹

چولستان کے قلعہ دراوڑ کے اردگرد ایک عجیب سی، بے مہار دنیا آباد ہے--!

کبھی اردگرد دیکھ کر لگتا تھا کہ سارے ہی خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔

کبھی لگتا کہ میں غلط جگہ پر پہنچا دیا گیا ہوں، یہ تو وہ جگہ ہی نہیں ہے۔

میرے خواب تو کچھ اور تھے، میرے چاروں طرف کچھ اور ہی ہے۔

ایسے لگتا تھا کہ کھیون ہار نے ویران جزیرے کی بجائے آباد بستی میں اتار کر میرے احساسات، میرے خوابوں اور میرے تصورات سے دھوکہ کر دیا ہے۔

میں تو ویرانے صحرا کی تلاش میں مارا مارا یہاں آیا تھا، مگر یہاں تو صحرائی دیہات میں ایک میلے کا سماں ہے--!

میں سوچتا تھا کہ قلعہ دراوڑ صحرا کے بیچوں بیچ ہوگا-- چلو، اگر بیچوں بیچ نہیں بھی ہوگا تو صحرا کے لق و دق ویرانے میں کنارے پر ہوگا-- اس کے سامنے، اردگرد، دور دور تک کھجور کے دھول سے اٹے درخت ہوں گے، کچھ کچی پکی جھونپڑیاں فاصلے فاصلے پر ہوں گی-- کچھ اونٹ کھجور کے درختوں کے تنوں سے مہاریں باندھے جگالی

کرتے ہوں گے -- کسی ایسے گاہک کی تلاش میں یا انتظار میں جو شوقین مزاج ہو اور ان کی کوہانوں پر بیٹھ کر صحرا میں دور تک، ویرانے کے بیچ میں جانے کا آرزومند ہو --!

میں نے سن اور پڑھ رکھا تھا کہ قلعہ دراوڑ صحرائے چولستان میں ہے! اس کے گرداگرد ریت، خاموشی اور سناٹے کا لازوال ویرانہ ہے -- پرانی کتابوں میں جگہ جگہ لکھا ہوا پڑھا تھا کہ قلعہ دراوڑ سناٹے کی حدود میں ایستادہ ہے، کسی ایسے مندر کی طرح جس کے اردگرد مور اڑتے ہیں، ریت میں کالے بچھو چہلیں کرتے ہیں، دور دور تک آبادیوں کے نام و نشان نہیں ہیں -- ان پرانی اور بوسیدہ کتابوں میں یہ بھی لکھا تھا کہ قلعہ دراوڑ کے گرد تین شہر شمال، مغرب اور جنوب کی سمتوں میں ہوتے ہیں۔ شمال میں چھوٹا سا شہر بہاول پور، مغرب میں احمد پور شرقیہ اور جنوب میں خان پور -- تینوں شہروں کا قلعہ دراوڑ سے فضائی راستہ پورے پورے اٹھارہ میل ہے --!

مشرق میں ۱۲۰ میل کے فاصلے پر صحرائے چولستان کے آخری مشرقی کنارے پر جیسل میر کا رومانوی قلعہ ہے! کبھی کسی زمانے میں جیسلمیر چولستان میں باہم یک جا تھا -- اب بھی صورت حال وہی ہے مگر زمینی حالت بدل چکے ہیں -- جیسلمیر جو کبھی ہمارے چولستان کا مشرقی سرا تھا، اب ہندوستان کی ملکیت میں ہے -- باجے راؤ! اسی چولستان کا جنگ جو شہزادہ تھا۔ مستانی اس کی محبوبۂ دل نواز تھی -- تاریخ کے ان صدیوں پرانے اوراق اور باجے راؤ کی محبوب، حسین معشوقہ مستانی، ہندو پاکستان کے چولستان کی ایک ناقابل فراموش داستانِ عشق ہے -- کوئی کہتا ہے باجے راؤ قلعہ دراوڑ میں پیدا ہوا اور قلعہ جیسل میر میں پرورش پائی اور کوئی کچھ اور کہتا ہے -- مگر یہی وہ چولستان اور اُدھر راجستان ہے کہ جہاں باجے راؤ نے مستانی جیسی دلیر، جنگ جو اور لازوال حسن کی مالکہ سے عشق کیا اور مر گیا --!

میرے سارے خوابوں کی یہ دنیا یہاں قدم رکھتے ہی گویا چکنا چور ہو گئی --!

یہاں تو ماحول ہی بدلا ہوا تھا --!

ویرانے نایاب تھے، بس ایسا لگتا تھا کہ صحرا کے کنارے اور قلعہ دراوڑ کے سائے تلے میلے لگے ہوئے ہیں --!

طرح طرح کے لوگوں کے اژدہام ہیں! کھوے سے کھوا چھلتا ہے --!

ٹھیلوں، ریڑھیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہیں -- جس کو ٹھیلا لگانے کی جگہ نہیں ملی اس نے زمین پر اپنی چادر بچھا کر کچھ نہ کچھ بیچنے کو سجا رکھا ہے -- عارضی دکانوں اور خوانچہ فروشوں کے وارے کے نیارے ہیں -- سب کچھ، کم یا

زیادہ--- ہر جگہ بک رہا ہے---!

ہمیں بہاول پور میں بتایا گیا تھا کہ قلعہ دراوڑ کے آس پاس کچھ بھی نہیں ملتا--- یہاں آ کر اور یہ بات سوچ کر بے اختیار ہنسی آتی تھی---!

سب کچھ تو مل رہا ہے؛ کوئی ریڑھی پر گرما گرم پکوڑے اور تازہ بہ تازہ سموسے تل رہا ہے۔ چائے کے اسٹال قدم قدم پر ہیں، چائے مانگو تو باری نہیں آتی۔ چائے کی اتنی طلب ہے کہ چائے فروش اور اس کا کمزور سا دیہاتی سیاہ جھلسی ہوئی رنگت والا لڑکا، جھوٹی پیالیاں دھوئے چلا جاتا ہے مگر مانگ پھر بھی پوری نہیں ہوتی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر چائے فروش جھوٹی اور آلودہ پیالیوں میں ہی چائے ڈال کر گاہکوں کو دے دیتا ہے۔ ان گاہکوں کو بھی بہت جلدی ہے۔ ان کو لگتا ہے قطعی اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ ان آلودہ پیالیوں سے کوئی زہر یبیماری بن کر ان کے رگ و جاں میں اتر سکتا ہے۔ وہ تو بس جلدی سے چائے پینے کے متمنی ہیں، سو لے لے کر پیئے جا رہے ہیں---!

پکوڑہ فروش اپنی میلی چادر زمین پر بچھائے، آلو، پیاز اور پالک مرچیں کاٹے جا رہا ہے۔ اس پر دھول اور قدموں سے اٹھنے والی گرد بڑے سے چلی جا رہی ہے--- پکوڑے تلے جا رہے ہیں اور پرانے روی اخباروں میں ڈال ڈال کر دیئے جا رہے ہیں--- پکوڑہ فروش کو بس یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کوئی گاہک جلدی میں میری بجائے اگلے پکوڑہ فروش کو بوہنی نہ کروا دے--- اس لیے جس قدر جلدی ہو سکے کچے پکے ہی کڑاہی سے اتار کر بیچ دو---!

اسی طرح پھل فروش ہیں--- بس دو ہی پھل یہاں سب سے زیادہ ہیں--- چھوٹے چھوٹے کینو اور مریل سے کیلے--- دام اُن کے اُن کی جسامت اور صحت کے مطابق ہی ہیں۔ وہ بھی زمین پر پڑے بک رہے ہیں---!

پانی کی بوتلیں ڈھیروں ڈھیر موجود ہیں--- اللہ جانے اصلی ہیں یا نقلی--- مگر پانی چونکہ بظاہر شفاف نظر آ رہا ہے۔ اس لئے بکے جاتا ہے۔ گرمی اس قدر ہے کہ ہر کسی کی زبانیں پیاس سے تالو کو لگی ہوئی ہیں--- یہ سوچنے کا تو موقع ہی نہیں ہے کہ یہ پانی ٹھیک بھی ہے کہ نہیں--- سب سے زیادہ اس پانی والے کی بوتلیں بک رہی ہیں کہ جس نے بڑے بڑے ٹبوں میں برف ڈال کر ان میں بوتلیں ٹھنڈی کرنے کو رکھی ہوئی ہیں---!

دو تین ریڑھی بانوں نے بخی کی سلاخیں آگ کے گرد گاڑ رکھی ہیں--- ہلکے ہلکے سینک پر مرغ بخی بن رہی ہے۔ وہاں بھی گاہک ارد گرد کھڑے ہیں اور اپنی اپنی مرغ بخی کو بھوکی نظروں سے ٹکٹکی باندھ کر یوں نظریں جمائے دیکھ رہے ہیں، جیسے اگر سلاخ پر چڑھے مرغ سے ذرا بھی نظر ہٹائی تو حضرت مرغ نظر بچا کر صحرا کی طرف

بھاگ جائیں گے--!

فقیروں اور مانگنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ الامان--الحفیظ--کس کس سے جان چھڑائیں؛ کس کس کو کہیں معاف کرو بابا--زیادہ تر مانگنے والوں کے چہروں پر مسکینی اور حقیقی غربت صاف نظر آتی ہے--ایک کو کچھ دو تو درجنوں گھیر لیتے ہیں--مانگنے والے بچے اور بچیاں بھی تعداد میں کم نہیں ہیں--پیسے بھی مانگتے ہیں اور جو کچھ کوئی کھا رہا ہو، اس کے کھانے میں بھی حصہ مانگتے ہیں--اتنے بھوکے ہیں کہ جب کوئی میز سے کھانا کھا کر اٹھ جاتا ہے اور دکاندار کو پیسے دے کر نکل جاتا ہے تو بچے ہوئے نانوں کے ٹکڑے، چچڑی ہوئی ہڈیاں، بچی ہوئی چٹنی دہی سے کھانے لگ جاتے ہیں--میز پر بچا ہوا پانی یا کسی مشروب کی بوتل میں چند گھونٹ یا قطرے بھی ہاتھ لگ جائیں تو ایسے سکون اور اطمینان سے پینے لگتے ہیں کہ دیکھ کر سچ مچ ترس بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے--لگتا ہے کہ یہ میلہ ان کو پورے سال کی دعاؤں کے بعد نصیب ہوتا ہے--!

فقیرنیاں بھی یہاں کچھ کم نہیں ہیں--زیادہ تر فقیرنیوں نے میلے کیلئے ٹوپی والے برقعے اوڑھ رکھے ہیں--مجھے لگتا ہے کہ یہ فقیرنیاں، موقع اور حالات سے پرانی واقف ہیں اور یہاں ٹرانزٹ پوزیشن میں ہیں--بہت سی فقیرنیاں چُنی، چادر میں ہیں--مگر جو مقامی صحرائی دیہاتوں کی مانگنے والی عورتیں ہیں، ان کے حلیے اور حالت سب سے زیادہ دگرگوں ہے۔ ان میں مانگنے اور پیچھا کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے--بس خاموشی سے سڑک کنارے یا کسی دیوار کی آڑ میں چپ چاپ بیٹھی ہیں؛ منہ سے کچھ نہیں کہتیں، بس بے بسی سے نووارد خوش لباس لوگوں کو معصومیت بھری اور آس بھری نظروں سے تکتی ہیں، کوئی اُن کو کچھ دے جائے تو ان کے سیاہ اور خشک ہونٹوں کے کناروں پر ہلکی سی تھکان بھری مسکراہٹ کا شائبہ لہرا کر دم توڑ جاتا ہے--!

کچھ ایسی چلتر باز مانگنے والیاں بھی تھیں؛ جو یقیناً ایسے میلے ٹھیلوں میں مانگنے کے اعلیٰ اوصاف حمیدہ سے کلی طور پر آگاہ تھیں۔ ان کی جوانیاں ان کے میلے، بوسیدہ اور بدبودار لباسوں میں بھی مچلتی اور بے قرار نظر آتی تھیں--یہ اپنے گنوں اور ادا سازگروں کی ماہر تھیں--ان کے ساتھ ان کے تو مولود اور دو دو چار چار سال کے ننگ دھڑنگ بچے بھی تھے۔ یہ چھوٹے بچے ان کے مانگنے کے کاروبار میں اہم ترین "ٹول" کا کردار ادا کر رہے تھے--جب بھی نوجوانوں کی ٹولی ان کے پاس سے گزرتی، وہ ماؤں کے بلائے بغیر، اپنے کھیل کھلے چھوڑ کر آجاتے، ایک نظر آنے والے جوان جہان لڑکوں کو دیکھتے، اپنی دیوار سے ٹیک لگائے ماں کے پاس آتے، اس کے کرتے کا دامن اٹھاتے اور گود میں گر کر اس کی بڑی بڑی مکروہ اور سیاہ چھاتیوں کو دیوانوں کی طرح چوسنے لگتے--جوان بھکارن،

لڑکوں کو اپنے اپنے طریقے سے حالات و واقعات کے مطابق متوجہ کرتی، مگر وہ انداز میں اپنی دوسری چھاتی ایسے انداز سے کھجانے لگتی، جیسے وہ غیر ارادی طور پر خارش کے مرض سے نجات حاصل کرنے کو تسکین دے رہی ہو--!

پان سگریٹ کے کھوکھے بھی کچھ کم نہ تھے۔صاف لگتا تھا کہ سب عارضی طور پر بار برداری کی گاڑیوں میں لاد کر اس موقع پر بھرپور کاروباری سوچ کے تحت یہاں لا کر لگائے گئے ہیں۔ان میں پان سگریٹ کے علاوہ، ممنوعہ گٹکا، ہر طرح کی ٹافی گولی، چھوٹی چھوٹی ٹارچیں، رومال، ٹشو پیپرز، غرض چھوٹی موٹی سب طرح کی چیزیں برائے فروخت موجود تھیں--رش کے رش اور ٹھٹھ کے ٹھٹھ یہاں لگے پڑے تھے--ایسا لگتا تھا کہ یہاں سب کچھ مفت ہی مل رہا ہے! آپ غلط فہمی میں نہ رہیے گا--جو سب مل رہا تھا خاصے مناسب اور معقول دام پر تھا--ہاں، البتہ ایک کھوکھے والا بیس روپے سے سو روپے تک کا پان بیچ رہا تھا--میں نے چینگ سے پوچھا--اس سو روپے والے پان میں کیا خوبی ہے تو تابعدار بچہ چینگ کہنے لگا--آغا صاحب میں تو پان کھاتا نہیں، پتہ کر کے بتاتا ہوں--کچھ دیر بعد آ کر اس نے بتایا خاص طرح کا پان ہے، خوب نشہ دیتا ہے، یہ پان کھا لو تو بندہ ساری رات صحرا میں بھنگڑا ڈال سکتا ہے۔اسے سردی بھی نہیں لگتی اور مستی بھی خوب آتی ہے۔ یہ بات اس کو کسی اس پان کے شیدائی نے بڑی رازداری سے بتائی تھی--!

پھر کسی نے بتایا کہ بھنگ کے پکوڑے بھی یہاں مل جاتے ہیں، مگر وہ صرف رات کو ہی دستیاب ہوتے ہیں--ان کو کھانے کے بعد صحرا بہت چھوٹا اور غیر ڈراؤنا لگنے لگتا ہے--!

ایک نامعلوم نوجوان جو ہمارے برابر چل رہے تھے، بلا کسی تعارف اور تعلق کے فرمانے لگے--سر جی، اس میلے کی وجہ سے پورے پنجاب میں یہ چار دن شراب شارٹ ہو جاتی ہے--میں نے حیرت سے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ایسے لاتعلق سڑک کراس کر گیا، جیسے چلتے چلتے کوئی چھوکرا داتا دربار کے باہر ۷۰ سالہ سنیاسی باوا کا اشتہار ہاتھ میں پکڑا کر رفو چکر ہو جاتا ہے--اس اشتہار میں واضح لفظوں کے ساتھ لکھا ہوتا ہے کہ باوا جی سے اپنی مردانہ طاقت کا علاج کرانے کے بعد آپ چار بیویاں اور سات کنیزیں راضی کر سکنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو سکتے ہیں--!

اُدھر شاہی مسجد کے ریلپکا کی پچھلی دیوار کے موڑ پر ایک سانڈنی سی سیاہ رو، سات من کی عورت ایک میلی سی دری بچھائے، مسجد کے زیر سایہ محفوظ مقام پر بیٹھی تھی۔اس کے بائیں طرف چار اینٹوں سے بنا ایک چولہا اور چند لکڑیاں پڑی تھیں۔چولہے پر اس عورت کی رنگت جیسی چھوٹی سی کڑاہی دھری تھی--دری کے دائیں کنارے پر چند

سفید خالی بوتلیں شیشیاں پڑی لڑھکتی تھیں اور دری کے بائیں کنارے پر سات آٹھ مردار سے سانڈے ایک رسی میں بندھے پڑے تھے۔ ان کی کمروں سے رسی شائد اس لیے باندھی گئی تھی کہ کم بخت حرامی موقع کا فائدہ اٹھا کر فرار نہ ہو جائیں -- وہ کالی موٹی بھینس سی عورت سانڈے کا تیل بنا بنا کر تازہ بہ تازہ بیچتی تھی اور سانڈنی کی سی بکر وہ آنکھ سے ہر کسی کو ایسی وحشی نظروں سے دیکھتی تھی، جیسے اپنا گاہک بنانا چاہتی ہو -- مجھے بھی اس نے اسی بھیانک نظر سے دیکھا اور تیل فروخت کرنے کے لیے ایک گندہ سا اشارہ بھی کیا کہ مجھے بھرے بازار میں ٹھنڈے پسینے آ گئے --!

اکلوتی کچی سڑک پر گاڑیوں کے ٹائروں اور لوگوں کے گھسو گھسو چلتے پیروں سے یوں دھول اڑ رہی تھی، جیسے صحرا میں مٹی اور ریت کا طوفان آیا ہوا ہو -- حالانکہ نہ فضا میں اور نہ ہی زمین پر جھکڑ کیا، ہوا کا ایک مردار سا جھونکا بھی نہیں تھا -- اس گرد سے نجات کے لیے منہ سر کا لپیٹنا فرض میں شامل ہو گیا تھا --!

نو بہار اور من پسند قلفی والے بھی اپنے ٹھیلے سجائے کھڑے تھے۔ ان ہی کے آگے پیچھے "گولہ گنڈا" یعنی برف کے رنگین گولے والے بھی تھے، جو برف کے ڈلوں کو الٹے رندے پر گھس گھس کے برف کے گولے سرکنڈوں پر بناتے اور اس پر رنگ رنگ کے نیلے، پیلے، سرخ، گلابی، میٹھے، کھٹے رنگ ڈال ڈال کر فروخت کر رہے تھے -- زیادہ تر فقیروں کے بچے ادھر بھیک مانگتے اور اس حق حلال کے پیسے کو جا کر گولہ گنڈا اور قلفیوں والوں کی نذر کر دیتے -- بچوں کی بھی موج لگی ہوئی تھی اور قلفیوں والے بھی دونوں ہاتھوں سے سکے اور روپے "مٹھور" یعنی "بٹور" رہے تھے -- لگتا تھا کہ سب ہی عید منا رہے ہیں --!

ہماری ٹیم کا ایک جوان بہت تلملایا ہوا آیا --!

اس کا سرخ چہرہ اور باچھوں سے نکلتی کف دیکھ کر میں نے بے اختیار پوچھ ہی لیا -- بھیا کیا ہوا -- سب خیر خیریت تو ہے --؟

اس نے جواب میں جو کہانی اور بپتا سنائی، وہ کچھ یوں تھی۔

"-- ہونا کیا تھا آغا صاحب -- صبح ناشتے کے نان چھولے لڑ گئے -- بڑے صبر سے یہ ۶۷ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا میں نے -- کئی بار لگا کہ دست کو سٹر میں ہی خطا ہو جائے گا -- جیسے ہی یہاں دراوڑ کے گاؤں میلے میں اترا، تو مجھے بیت الخلا کی تلاش ہوئی -- خوش قسمتی سے ایک سرخ اینٹوں کی دیوار پر ایک بڑا سا بورڈ بیت الخلا کا لگا دیکھا -- اس کو دیکھتے ہی طبیعت نے پھر جوش مارا -- اور دل کو قرار آیا کہ چلو اس جگہ یہ نعمت تو موجود ہے -- آپ لوگ تو آگے نکل گئے، میں سیدھا بیت الخلا کی طرف گیا -- جہاں پہ بورڈ لگا تھا -- وہاں وہ سرخ دیوار میں ایک

"موکھلا" تھا۔ دروازہ یا راستہ اسی موکھلے سے جاتا تھا-- گویا دیوار میں توڑ کر اتنا سوراخ بنایا گیا تھا کہ آدمی جھک کر اندر چلا جائے-- مجھے اس ٹوٹی دیوار کے موکھلے نما سوراخ سے کیا لینا دینا تھا، مجھے تو اپنے پیٹ میں بل کھاتے فضلے کو جلد از جلد خارج کرنے کی خواہش تھی-- موکھلے کے دائیں بائیں دو چار پائیاں، آمنے سامنے بچھی تھیں اور ان پر کلف لگے ہوئے ابرق شلوار قمیض پہنے چار پانچ چوڑھے ایسے بیٹھے تھے کہ جیسے درباری، دربار کے ایوان خاص میں بیٹھے ہوتے ہیں-- میں سمجھا معزز لوگ ہیں، جو چارپائیوں پر ستار ہے ہیں-- میں اندر جانے لگا تو مجھے انہوں نے روک لیا۔ بڑی تمیز سے پوچھا۔

"--باؤجی-- کتھے جاناں اے--"

میں نے کہا"-- واش روم جانا ہے--"

بولے-- بالکل ٹھیک اے جناب-- پر اے دسو، وڈا پیشاب کرناں اے کہ چھوٹا--؟"

میں نے بے اختیار سچ بول دیا"-- وڈا جناب--"

کہنے لگے-- وڈے پیشاب دے دس روپے تے چھوٹے دے دس روپے-- تو سی، اللہ بھلا کرے دس روپے ایڈوانس ایتھے دے دیو--"

میں نے مصیبت کے مارے نے جلدی سے پچاس کا نوٹ نکال کر ایک سیانے چوڑھے کو پکڑا دیا اور باقی تیس روپے کا منتظر ہوا-- دوسرا چوڑھا بولا-- ابھی کھلا بھان نہیں ہے-- فارغ ہو کر واپسی پر لے لینا--"تسی اپنا کم کرو جا کے--!"

میں کبڑا ہو کر ٹوٹی دیوار سے اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں، اندر واش روم تو کوئی نہیں ہے-- ایک برآمدہ ہے اور اس برآمدے میں دائیں بائیں دو کمرے ہیں، ایک کمرے پر ہیڈ ماسٹر کی تختی لگی ہے اور دوسرے کمرے پر اسکول آفس کی تختی لگی، میرا منہ چڑا رہی ہے-- باتھ روم کا کہیں نام و نشان نہیں ہے-- میں بھاگ کر واپس ان خوش لباس چوڑھوں کے پاس آیا-- ٹوٹی دیوار سے منہ نکال کر پوچھا--

"-- واش روم کدھر ہیں--؟"

تین چوڑھے بیک زبان بولے"-- اوکی شے اے--؟"

اس سے پہلے کہ میں وضاحت کرتا-- ان میں سے ایک سیانا بولا۔

"--باؤجی-- جتھے مرضی کرلو-- ساری جگہ اپنی ہے--"!!!

میں تیزی سے واپس پلٹا--ساری جگہ ہی اپنی تھی--ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے پیچھے دو اور کمرے تھے--ایک کمرے میں جھانکا تو گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا، وہاں تین بچے بلیک بورڈ کے نیچے لائن میں بیٹھے فراغت ضروریہ سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے مصروف تھے اور ایک آدمی دوسرے کونے میں کھڑا پیشاب کر رہا تھا--میں گھبرا کر واپس باہر نکل آیا اور دوسرے کمرے کا رخ کیا--وہاں دو خواتین شلواریں نیچے کھسکائے دو دو اینٹوں کی کھڈی بنائے باتیں بھی کر رہی تھیں اور پاخانہ بھی خارج کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ایک چیخی--وے دفع ہو--ایتھے زنانیاں نظر نہیں آندیاں--"

میں گھبرا کے پلٹ آیا--دور دیوار کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں تھیں--میں جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا اور پھر سکھ چین کی بنسی بجا کر واپس خوشی خوشی مو کھلے سے باہر آیا--ایک چوڑھے نے بڑی ہمدردی سے پوچھا--

"--بھاجی--صفائی (طہارت) دے واسطے روڑا مل گیا تھا--؟"

میں نے بے اختیار کہا"--جی بھائی جی--بقایا پیسے تو دے دیو--؟"

چوڑا بولا--"نیامت مسیح، سگریٹ لین گیا ہے، ذرا ایتھے بہہ کے انتظار کرلو--"

میں نے کئی منٹ انتظار کیا--نیامت مسیح نے ناں آنا تھا، ناں آیا--میں سمجھ گیا کہ سب ملے ہوئے ہیں--میں نے کہا ابھی آتا ہوں اور آ کر آپ کے قافلے سے مل گیا ہوں۔

"--آغا صاحب، جنھوں نے اسکول بیچ دیا ہو، وہ بھلا پیسے کب واپس کرتے ہیں--؟"

میں نے کہا"--بھول جاؤ تمیں روپے کو، بس اس سکھ کو یاد کرو جو پچاس خرچ کر کے تمہیں حاصل ہوا ہے--!!!"

باب۲۰

کئی ہیولے، کئی عکس

میں اُسے مزید اُجڑتے دیکھ رہا ہوں

ٹیروں اور ٹاٹروں سے اڑتی گرد کے دبیز اور دھندلے، زرد آسمان تک اٹھے پردے کے پس پردہ چولستان کی دو نایاب عمارتوں کے غیر واضح نقش مجھے ذرا ذرا نظر آنے لگے تھے---!

ایک اونچی بنیادوں کی کرسی پر بنی، وسیع و عریض سفید مسجد جو بالکل سامنے تھی---یہ سڑک جس پر ہم چلے جاتے تھے، وہ ناپختہ دھول اڑتی سڑک، مسجد کی سیڑھیوں کی چوکی سے بائیں طرف مڑتی تھی---!

بائیں طرف، مسجد کے مقابل، کچی سڑک کے کنارے ایک پختہ بڑی سی دکان، جو ایک طرح کا جنرل اسٹور بھی تھا اور ضرورت کی ہر بنیادی شے اس میں رکھی نظر آتی تھی۔دوکان کے ساتھ ایک بڑا سا چھپرالی برآمدہ تھا کہ جس میں دو بڑی بڑی، بان کی چارپائیاں پڑی تھیں---غالباً لوگوں، مسافروں، خریداروں کے ستانے اور آرام کرنے کے لئے---گویا چیزیں بھی خریدو، ذرا سا آرام کرو اور واپس اپنی منزل کی طرف کمر کس کے روانہ ہو جاؤ---اس برآمدے نما کشادہ چھپر کے ساتھ کچھ کھونٹے بھی تھے جو غالباً اس لئے تھے کہ اگر آپ اپنے اونٹوں پر آؤ تو انہیں یہاں باندھ دو---!

کوسٹر نے مسجد سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر ہمارے قافلے کو اتارا تھا-- مسجد سے کوئی پندرہ بیس قدم پہلے پولیس نے تین چار بیریر پچ پکی سڑک کے لگا کر آگے گاڑیوں کے جانے کو قطعی ممنوع قرار دے رکھا تھا اور ان رکاوٹوں کے سامنے گول دائرے میں، معہ اپنے صاحب بہادر کے ایسے بے فکری سے بیٹھے تھے، جیسے باراتی کھانا کھلنے کے انتظار میں کھانے کے شکاری بن کے بیٹھے ہوں-- ہر آنے والے نو وارد "منڈے کڑیوں" کو یوں دیکھتے تھے کہ جیسے اندر تک پوسٹ مارٹم کر کے کسی خاص قسم کے اسلحے کے ہونے نہ ہونے کا یقین اور اس کے سائز اور جسامت کا باریک بینی سے جائزہ بلکہ سکریننگ کر رہے ہوں--!

حساس چیکنگ پوائنٹ سے فقط خاص الخاص گاڑیوں کو گذارنے کی اجازت تھی-- ہم عام عوام الناس کی ٹرانسپورٹ کو دائیں طرف نیچے ایک بہت بڑے میدان میں اتارا جا رہا تھا کہ وہی جگہ ان گاڑیوں کا پارکنگ میدان تھا-- جس میں بڑے بڑے کیچڑ کے رقبے تھے-- میدان لمبائی کے رخ پر تھا-- بالکل دیکھنے میں ایسے لگتا تھا کہ خشک دریا کی چکنی مٹی اور ریت کا آمیزہ اس کی سطح ہے-- میدان کے کناروں پر چکر والے چھوٹے بڑے جھولے، مداریوں کے خیمے، فقیروں کی عارضی جھگیاں، پکوڑوں سموسوں کے دھول میں اٹے اسٹال، بندر کے کرتب دکھانے والے مداری، اور پتہ نہیں کیا کیا تھا-- تفصیل تو اس وسیع وعریض گہرے میدان کی اسی وقت معلوم ہوئی تھی کہ جب ہم نے اس حصے میں قدم رکھنا تھا-- ابھی تو فقط سڑک کی اونچائی سے جو کچھ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا، بتا دیا ہے--!

بائیں طرف بھی جنرل اسٹور کی چھت کے پس منظر میں دور، بہت دور، کچھ افق کے اس پار، آسمان سے ذرا نیچے، مگر قدرتی اونچائی پر قلعہ دراوڑ کی اونچی بیرونی دیواریں، دیواروں پر اونچے برج نظر آتے تھے-- اڑتی دھول کا پردہ کچھ واضح نہیں ہونے دیتا تھا-- بس اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ لیجئے قلعہ دراوڑ آ گیا ہے اور وہ ہمارے تیز اٹھتے قدموں کی دسترس میں ہے۔

مسجد کی کرسی کم از کم فرش زمین سے بیس فٹ اونچی تھی-- گویا ایک دیوار کی طرح تھی۔ چند قدم کی پکی سڑک پر چلنے کے بعد یہ ناپختہ سڑک دائیں اور بائیں دو سمتوں میں چلی۔ بائیں والی سمت ویران، بوسیدہ، دیواروں اور قدیم آثار کی طرف جاتی نظر آئی-- جب کہ دائیں والی سڑک مسجد کے پچھواڑے آ گئی-- عین مسجد کی قبلہ گاہ کے سامنے قلعے کا بیرونی دروازہ اور دروازے کے دونوں اطراف میں طویل بوسیدہ دیواریں تھیں، جو دور تک ٹوٹی پھوٹی نظر آتی تھیں--

مسجد کی اونچی قبلہ گاہ کے عین سامنے قلعہ دراوڑ کا بیرونی اونچا بوسیدہ دروازہ تھا-- ایک پُرشکوہ دروازہ،

جس کے کواڑ کھلے تھے۔ میرے قدم وہیں رک گئے--!

یہ دروازہ قلعے کی بیرونی حفاظتی دیوار کا داخلی دروازہ تھا۔ اصل قلعہ اس دروازے کو عبور کرنے کے بعد اندر کہیں تھا۔ اس بیرونی دروازے اور حصاری دیوار سے قلعہ اندر، کافی دور تھا۔

داخلے کی ڈیوڑھی بوسیدہ ہوجانے کے باوجود اپنی تعمیراتی خوبصورتی میں آج اس نازک حالت میں بھی بے مثال تھی--میں سوچ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ جب یہ اپنے زمانہ عروج میں ہوگی تو کیا شاندار اور ٹھاٹھ باٹھ ہوں گے--!

قلعہ دراوڑ میں داخلے کا یہ پہلا دروازہ اپنی خوبصورتی، مضبوطی اور طاقت کے آثار کی آج بھی جھلک مارتا تھا--میرے قدم خود بخود رک گئے--میں اس اونچی ڈیوڑھی کو اتنی توجہ سے دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا حق ادا ہوجائے اور جو آثار موجود تھے، وہ یقیناً دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے--!

ڈیوڑھی، بالکل ویسی ہی تھی، جیسا کہ قلعوں میں داخلے کی روایت ہوا کرتی تھی--!

دو ہاتھیوں کے برابر دروازے کی اونچائی، مہارت اور پختگی سے بنا ہوا لکڑی اور لوہے کا قدیم دروازہ کہ ہاتھی ٹکر مارے تو سنبھل کر مقابلہ کرنے کی طاقت وتوانائی کھو بیٹھے--چوکور خانوں کی لکڑی میں لوہے کی ٹھوس اور نوک دار ڈھالیں یک جان، دو قالب کی طرح ایک دوسرے میں پیوست، پہلے ہاتھی کے ماتھے کی اونچائی سے ہر آہنی ڈھال سے باہر نکلے ہوئے تقریباً آٹھ آٹھ انچ کے موٹے، نوکیلے اور مہلک کیل کہ اگر حملہ آور کا ہاتھی اس دروازے کو کھولنے یا توڑنے کے لئے ٹکر مارے تو نوکیلے کیل اس کے ماتھے کو چھید کر رکھ دیں، وہ ان ہی کیلوں میں ایسا اٹک جائے کہ وہیں تڑپ تڑپ کر جان دینے پر مجبور ہوجائے--!

دروازے کے دو پٹ ہیں؛ بائیں پٹ میں حسب روایت موری دروازہ ابھی بھی سالم موجود ہے۔ ڈیوڑھی کا فرش کبھی کا اکھڑ چکا ہے؛ اب فرش کی بجائے فقط ریت ہی ریت ہے۔ دونوں پٹ بے دردی سے کھلے اور ریت میں دھنسے پڑے ہیں۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ بس ذرا سی سولنگ فرش پر لگا دی جاتی تو نہ صرف اس قدیمی آثار دروازے کی عمر بڑھ جائے بلکہ یہ کھلنے اور بند ہونے کے لائق بھی ہو جائے--ایسے نایاب دروازے اب، آج کے دور میں نئے سرے سے بنانا اور لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ نئے دروازے کی وہ تاریخی اہمیت بھی نہیں ہوگی، جو اس قدیم تاریخی دروازے کی اہمیت ہے کہ صدیوں بعد بھی زندہ سلامت اپنی جگہ پر قائم ودائم کھڑا ہے۔ بس ذرا پرانا پرانا نظر آتا ہے۔ پرانا نظر آنا اس کا حق ہے، ورنہ آثار قدیمہ کہلانے کے حق سے محروم ہوجائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ قلعہ دراوڑ کے بیرونی احاطے میں داخلے کا یہ بیرونی دروازہ، اس کی پختہ اور منفرد انداز میں تعمیر کی گئی ڈیوڑھی کا حصہ اور چوکھٹ ایک خاص طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ جو حالات یہاں لوگوں کی جانب سے برباد کئے جانے کے نظر آ رہے ہیں-- اس وحشت اور بربریت سے یہ عمارت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتی نظر آ رہی-- سینکڑوں سال میں تو عمارت فقط موسمی حالات اور قدرتی بوسیدگی کا بس اتنا شکار ہوئی ہے کہ ابھی بھی دم باقی ہے-- مگر معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ جو نقصانات صدیوں میں حملہ آوروں نے نہیں پہنچائے، وہ نقصان آج کے عہد کے لوگ ان آثارِ قدیمہ کو پہنچائے چلے جا رہے ہیں-- لگتا ہے کہ پچھلی صدیوں کے لوگ وحشی اور جابر اور آثار شکن نہیں تھے بلکہ موجودہ صدی کے لوگ ان سے کہیں زیادہ وحشی اور بے حس اور آثار شکن ہیں-- ان کا باطن اپنے اسلاف اور ان کی نشانیوں سے نفرت بھی کرتا ہے اور ان کو تباہ و برباد کر دینے کے درپے بھی ہے-- مجھے لگتا ہے کہ تعلیم، سائنسی ترقی اور وسعتِ اقدار ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ ان میں موجود وحشت، بربریت اور ہر اس شے کو برباد کر دینے کی خواہش، جس کو وہ بنا نہیں سکتے، اتنے وحشیانہ اور جابرانہ انداز میں موجود ہے کہ وہ جب تک بربادی نہیں پھیر دیتے ان کے اندر موجود بدکردار عفریت کو سکون نہیں پہنچتا-- جو بربادی اس عہد کے نوجوانوں نے آثارِ قدیمہ کی پورے ملک میں کی ہے، اس کو آپ ہر آثارِ قدیمہ کی نایاب عمارت میں خود جا کر دیکھ سکتے ہیں-- لگتا ہے کہ دیہاتی اور مزدور طبقہ اور اس کے نوجوان اپنی محرومیوں کا انتقام اس انداز میں لے رہے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے ورثے برباد ہو جائیں۔ اس لیے کہ ان کا اپنا کوئی ورثہ اور کوئی سلف نہیں ہے تو ملک اور تہذیب کا ورثہ کیوں سلامت رہنے دیا جائے-- یہ دم کٹے ہیں، بے جڑ کے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ جن کے ورثے ہیں، ان کو ہر طرح کے ورثوں سے محروم کر کے اپنے جیسا دم کٹا بنا دیا جائے-- جب اس فطرت کے لوگ ایک آدھ ڈگری، سند کہیں سے ہیرا پھیری کر کے لے لیتے ہیں تو اس کو تعلیمی خرچ کی پکی رسید سمجھ لیتے ہیں-- اس پکی رسید کو حاصل کرنے کے بعد ان میں یہ آگ اور بھڑک جاتی ہے کہ وہ سب کچھ برباد کر دو، جو ہمارا نہیں ہے، ہمیں مل نہیں سکتا یا جو ہم بنا نہیں سکتے-- پھر وہ یہی کرتے ہیں جو میں یہاں اور پاکستان کے ہر تاریخی ورثے کے ساتھ "بلدکار" کی صورت میں دیکھ رہا ہوں--!

مجھے نظر آ رہا ہے کہ اس ورثے اور آثارِ قدیمہ کی عمر ایسے لوگوں کی موجودگی میں زیادہ نہیں ہے-- اس لیے چاہتا ہوں کہ اس کو تحریر میں لکھ دوں تا کہ یاد رہے کہ ہم نے اپنے ورثے کیسے اور کیونکر برباد کئے--!

قلعہ دراوڑ کی اس بیرونی حفاظتی دیوار کے "حصاری دروازے" کے دونوں مرکزی ستونوں سے باہر کو

ایسے آثار تھے کہ جیسے کبھی اس دیوار کے ساتھ ساتھ باغیچے ہوں۔ تقریباً پندرہ قدم باہر دو ستون قد آدم تھے کہ جن کے اب صرف آثار ہی باقی تھے۔۔ فقیر اور فقیرنیاں ڈیوڑھی کے دالان میں، ڈیوڑھی کے باہر چوب دار تھڑوں پر ایسے قبضہ جمائے بیٹھے تھے، جیسے ان کا قرض اتار کر ہی ہمارا اندر داخلہ ممکن ہوگا۔۔ مجھے دکھ اس وقت شدید ہوا کہ جب سیاہ رُو اور مکروہ صورت بھینس نما فقیرنی اسی وقت وہاں اپنا سنگھاسن سنبھالنے پہنچی۔۔ میں اس وقت دروازے اور دیوار کی تصاویر بنا رہا تھا۔۔ اس نے آتے ہی اپنے ننگ دھڑنگ دس برس کے لڑکے کو حکم جاری کیا کہ اس ستون سے کوئی اینٹ اکھاڑ لا کہ میں اس پر بیٹھ کر بھیک مانگ سکوں۔۔ لڑکے نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک بڑا پتھر ڈھونڈا اور لا کر بیرونی استادہ ستون کی اوپر والی بے آسرا اینٹوں کو ایسے ضرب لگائی کہ بے بس اور لاچار، صدیوں سے لگی اینٹیں نیچے گرنے لگیں۔۔ اس نے ان میں سے دو صاف ستھری سالم اینٹیں اٹھائیں اور جا کر اپنی ماں کے آگے پھینک دیں۔۔ فقیرنی نے ان دونوں اینٹوں کو زمین پر جوڑ کر رکھا اور اپنے من من بھر کے کولہے اس پر ٹکا کر اڈے پر بیٹھ گئی۔۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔ حرامزادی، سور کی بچی، خنزیر کی حرامی نسل۔۔!!!

کوئی روکنے والا نہیں ہے۔۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔۔ لگتے ہیں، پر گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔۔!

باب ۲۱

عجیب داستان ہے، پیلو کے درخت کی،
اِس درخت پر آسیبوں کا سایہ ہے اور میں نیچے بیٹھا ہوں

ہماری رہنمائی، دیکھ بھال اور نگہداشت ایک معصوم سے چینی جاپانی نوجوان "چینگ" کے سپرد کر کے سارے کمپنی والے کہیں صحرا میں نکل گئے تھے۔ تاکہ صحرا کے کسی اچھے اور محفوظ مقام کا انتخاب کر کے خیمہ بستی بسائی جا سکے۔۔۔ چوں کہ جیپ ریلی کی وجہ سے اچانک رش بہت زیادہ ہوتا جا رہا تھا، تو ہو سکتا ہے کہ اگر صحرا میں ہموار اور محفوظ جگہوں پر آنے والی ٹیموں نے قبضہ جما لیا تو نہ صرف مزید اندرونی صحرا میں جانا پڑے گا، جس سے اس میں کئی خطرات کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً نامعلوم صحرائی قذاق جو بڑے ظالم اور وحشی صفت ہوتے ہیں۔۔۔!

ایک نوجوان جو ہمارے قافلے میں کچھ زیادہ ہی خدشات اور تحفظات کا مارا ہوا تھا، یہ سن کر بولا۔

"۔۔۔یارو نظر رکھنا، ایسا نہ ہو کہ کمپنی والے، ہم لوگوں کو اس ویرانے میں چھوڑ کر ہی فرار نہ ہو جائیں۔۔۔ ہمارا تو سارا سامان بھی اُن کی کوچ میں رکھا ہے۔۔۔"

یہ واہیات خیالات سن کر مجھے سچ مچ آگ سی لگ گئی۔۔۔ میں نے کہہ ہی دیا۔

"۔۔۔تم کبھی اچھی بات بھی سوچ لیا کرو۔۔۔ سب تمہارے جیسے نہیں ہوتے۔۔۔ شکر ہے کہ یہ کمپنی تمہاری

نہیں ہے، ورنہ ایسا ہی ہوتا جو تم کہہ رہے ہو--"

"--سر جی، آپ تو برا ہی منا گئے ہیں، اس کمپنی میں آپ کا حصہ لگتا ہے--" یہ سن کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔

"--حصہ وصہ کوئی نہیں ہے میرا، مگر یہ ضرور پتہ ہے کہ ایک گندی مچھلی، سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے--اس قلعہ کے پیچھے اور مسجد کے پچھواڑے ایک سبز پانی کا صدیوں پرانا تالاب ہے، جواب چھپڑ ہے، وہ تمہارے لیے بہترین رہے گا--"

میری بات سن کر وہ ایسی مکروہ ہنسی ہنسنے لگا، جیسے میں نے اس کی پسند کی بات کہہ دی ہو۔

میرا دل تو اسی بیرونی حصاری دیوار کے دروازے کی ڈیوڑھی کی نقش کاری اور حسنِ بناوٹ میں اٹکا ہوا تھا--غالباً جس نے بھی اس کو ڈیزائن کیا ہوگا بہت نفیس طبع ہوگا اور جس مالک نے اس کے ڈیزائن کی نقش کاری کو تجویز و منظور کیا ہوگا، وہ سب سے زیادہ نازک مزاج اور ذوقِ سلیم رکھتا ہوگا--مجھے کہیں کوئی ایسی سند نہیں مل سکی کہ اس دروازے، ڈیوڑھی اور بیرونی داخلے کی حفاظتی دیوار کی تعمیر کس نے کرائی، کب ہوئی--دیوار کے آثار تین فٹ سے کم چوڑے نہ تھے اور اونچائی ڈیوڑھی کے تقریباً برابر تھی۔ نقش و نگار دیوار میں بھی اپنی آن، بان، شان اب بھی دکھاتے تھے--ڈیوڑھی کی بیرونی دیواروں کی تمام تر خوبی یہ تھی کہ جو بھی محرابیں، چراغ گاہیں تھیں اینٹوں سے بنائی گئی تھیں اور طاقچوں میں کسی ایسے مصالحے کا پلستر تھا کہ ابھی تک نہ اس میں کوئی دراڑ آئی تھی اور نہ ہی وہ کریک ہوا تھا۔ چھوٹی طرح طرح کے سائز کی اینٹوں سے کناروں کی کنگریاں بنائی گئی تھیں کہ آج بھی ہوا میں سلامت کھڑی تھیں۔ بیرونی ماتھے پر تین مستطیل مگر بہ طرز بیضہ لمبائی کے رخ حاشیے تھے۔ صرف درمیان والے بیضے کے عین وسط میں ایک ابھرا ہوا خوبصورت نقش تھا--دو کھڑی تلواریں، جن کے مڑے ہوئے دستے دائیں بائیں تھے، اوپر جا کر تلواریں یک جان ہو جاتی تھیں۔ نصف تلوار کے وسط میں ایک نصف نیا چاند اور اس چاند پر پانچ کونوں والا ستارہ--یہ نقش ابھی بھی اپنی جگہ سلامت کھڑا تھا، جب کے دائیں بائیں کے بیضوں میں وہ اثناد ہائے زمانہ کا شکار ہو کر گر چکے تھے مگر ان کے پس منظر کا ہلکا سا نشان باقی تھا کہ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی یہاں بھی یہی نشانات آویزاں تھے--لگتا ہے کہ خدانخواستہ یہ ایک جو سلامت ہے، بہت جلد اپنے انجامِ فنا تک پہنچ جائے گا--ماحولیاتی آثار اور ارد گرد کے لوگوں کے تیور بھی یہی بتاتے تھے۔

یہ دروازہ، اس کی بناوٹ اور طرزِ تعمیر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا--میرے خیال میں جس نے اس حسین طرزِ تعمیر دروازے کو فراموش کر دیا، گویا سب کچھ فراموش کر دیا--!

اندر داخل ہوتے ہی سامنے غالباً حفاظتی دستوں کی کوٹھریاں اور دمدمے تھے کہ اب اپنی بوسیدگی میں اپنی قدرتی اور فطری انجام پر پہنچ کر فنا ہو چکے تھے۔ فقط گول چھتیں ہوا میں اللہ توکل کھڑی تھیں اور اندر فقط ملبہ ہی ملبہ تھا۔

ایک رستہ دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف کشادہ جاتا تھا -- بائیں طرف والا رستہ تباہ حال، ویران اور گرے ہوئے قدیم مکانات کا عبرت ناک نقشہ پیش کرتا تھا۔ جب کہ دائیں طرف کا رستہ کھلا تھا -- ہم اسی پر مرکزی قلعے کی طرف بڑھے جو کافی اونچائی پر قائم ودائم تھا -- مجھے لگتا تھا کہ حصاری دیوار کے اندر قلعہ دراوڑ کے مکینوں اور نوابوں کے اُن ملازمین کے گھر تھے کہ جن کا تعلق کسی نہ کسی نسبت سے اندرونی محلات اور مختلف امور انجام دینے والوں سے تھا۔ جن میں باورچی، حجام، نوکرانیاں، ڈرائیور، مویشیوں کے رکھوالے، موچی، نائی وغیرہ اور حفاظتی فوج کے ملازمین تھے -- دراوڑ کے مکینوں کی باقی رعایا، قلعے سے باہر اپنے گھر بسائے بیٹھی تھی -- کسی غیر متعلق شخص یا خاندان کو نہ ہی قلعے کے حصار میں اور نہ ہی حصار کے عین باہر رہنے کی اجازت تھی -- گویا درجہ اول کے ملازمین اور ان کے خاندان فصیل کے اندر رہائش پذیر تھے، جب کہ درجہ دوم اور سوم والے فصیل کے جنوبی حصے کے باہر رہتے تھے --!

ملازمین کے رہائشی حصے قلعے کی فصیل سے کم وبیش چار پانچ سو گز دور تھے -- قلعے کی فصیلِ خاص اور انتہائی بیرونی حصاری دیوار کے درمیان کا یہ میدانی فاصلہ بتاتا تھا کہ چولستان کے نوابوں اور سرداروں کو حفاظتی آثار بنانے پر فوجی انداز میں عبور حاصل تھا -- اگر دشمن یا حملہ آور بیرونی حفاظتی دیوار پھاند یا توڑ کر اندر آنے میں کامیاب ہو جائے تو اونچائی پر قائم قلعہ سے اسے اس میدان میں ہی، قلعے کی فصیلوں تک پہنچنے سے پہلے ہی تہ تیغ کر دینے کے پورے انتظامات تھے -- کیونکہ اونچائی سے میدان میں دشمن کو زیر کرنا بہت آسان ہدف ہوتا ہے -- قلعہ دراوڑ اس اعتبار سے قابل بھروسہ قلعہ تھا -- اس کی خوبصورتی اور بناوٹ کے قاعدے بھی لاجواب تھے، یہی بات ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ سال گزر گئے ہیں اور یہ اپنی آب وتاب کے ساتھ کھڑا ہے -- مگر لگتا ہے کہ اب زیادہ وقت قائم نہ رہ سکے گا --!

اندر داخل ہوتے ہی کچھ رستہ ایک چوڑے کچے گلیارے میں داخل ہوا --

ایک بوسیدہ مگر مضبوط دیوار کچھ دور تک چلی -- اور میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

ایک عریاں، قدیم درخت نے میرے قدم روک لیے --!

ارے -- شاید یہ وہی درخت ہے جو قلعہ دراوڑ اور چولستان کی تاریخ میں صدیوں سے کھڑا ہے اور

طلسمات کا حامل ہے--!

عجیب ہیئت اور شکل کا درخت تھا--کوئی کہتا تھا کہ یہ درخت اس وقت سے یہاں موجود ہے کہ ابھی یہاں قلعے کا نام ونشان بھی نہیں تھا مگر یہ درخت اس وقت بھی تھا اور آج بھی سلامت، ہرا بھرا ہے--!

بڑھاپا اس درخت کی ہر شاخ اور تنے سے ٹپکتا تھا--!

کوئی کہتا ہے کہ اس کی عمر ڈیڑھ ہزار سال ہے اور کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ جتنی اس قلعے کی کل عمر ہے، یہ اس سے بھی پچاس سو سال قدیم ہے--!

اس کا بوڑھا اور بل کھاتا ہوا تنا نیچے سے ٹنڈ منڈ تھا--جڑیں مضبوط تھیں کہ آج بھی اچھی طرح زمین میں پوری شان وشوکت سے جمی ہوئی تھیں--شاخیں اپنے بڑھاپے سے سوکھ کر ایسے ایک دوسری شاخوں کے گرد بل کھائے ہوئے تھیں کہ ایک آرٹ ورک کا گمان ہوتا تھا--اوپر کی شاخوں پر پتے گھنے اور سرسبز تھے--قدیم بل کھائے تنے میں سرسبز شاخیں کہیں کہیں، چیدہ چیدہ تھیں اور کہیں کہیں سبز پتے بھی تھے--بڑھاپا اس کے انگ انگ سے ٹپکتا تھا--مگر تن آوری میں ایسے جوان لگتا تھا کہ جتنی بھی تعریف کرو، کم ہی شمار ہوگی۔

میں اس درخت کے نیچے رک گیا، پھر بیٹھ گیا--

کسی مقامی نے گذرتے گذرتے میری ہمدردی میں اونچی آواز سے کہا، یہاں نہ بیٹھو یہ آسیب زدہ درخت ہے--میں نے دل میں سوچا، مجھے تو خود آسیبوں سے محبت ہے--!

یہ پیلو کا درخت تھا--!

چھتیس راگنیوں میں ایک راگنی پیلو ہے کہ جس کے سر عورت کو مدہوش اور مرد کو اس بے خود مدہوشی پر فریفتہ کر دیتے ہیں--!

اس درخت کا انگ انگ، تنے کا مدہوشی اور بے خودی کے عالم میں خود اپنی ہی شاخوں کے گرد لپٹنا بتاتا تھا کہ راگنی اور مدھرتا اس کے تن بدن سے آج بھی عالم بے خودی میں چھلکتی ہے--!

نرم ونازک پتے، بے آب وگیاہ ہونے کے باوجود سُر سنگھار سے سجے بنے تھے--!

بڑھاپا تھا مگر پھر بھی جوانی کا پتہ دیتا تھا--!

میں اس آسیبی پیلو کے درخت کے نیچے گیان دھیان میں تھا--بارہ سو سال ایک لمحے میں پلٹ چکے تھے--کوئی راگنی، کہیں دور سُر بکھیر رہی تھی--مجھے لگتا تھا کہ یہاں کی باسی دیوی داسیاں روز صبح اس کے سائے میں

آتی ہیں، چہکتی ہیں، مستیاں کرتی ہیں اور اپنے دانتوں کے موتیوں کو اس کی شاخوں سے رگڑ رگڑ کر چمکاتی ہیں--!

عجیب داستان ہے اس پیلو کے درخت کی--

یہ امن اور امان کا درخت ہے-- جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوں، یہاں صدیوں پہلے بیابان، ویران اور ہر طرف پھیلا ہوا صحرا تھا-- بیچ صحرا کے قدرت نے ایک درخت اُگا رکھا تھا-- گھنا اور خوبصورت درخت، جو عموماً ایسے ویران صحراؤں میں ہوا نہیں کرتا-- کہتے ہیں کہ ایک جوگی بوٹیوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا، یہاں آن نکلا-- جب وہ یہاں پہنچا اور درخت دیکھ کر اس کے سائے میں آرام کرنے کو اس کی طرف بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ کا بچہ، درخت کی گنجان جڑوں میں چھپا بیٹھا ہے۔ جب کہ صحرا کے ویرانے میں دور دور تک کسی بھیڑ بکریاں چرانے والے کا بھی کوئی نام ونشان یا آثار نہیں ہیں-- اس نے ایک عجیب منظر دیکھا-- کیا دیکھتا ہے کہ جب بھی بھیڑ کا بچہ درخت کی چھاؤں کے احاطے سے باہر نکلتا ہے، تو ایک دور بیٹھا بھیڑیا اس پر حملہ کرتا ہے۔ بھیڑیے کو حملہ آور ہوتا دیکھ کر بچہ پھر سے بھاگ کر درخت کی چھاؤں یا جڑ کے قریب چلا جاتا ہے-- جوں ہی بھیڑ کا بچہ درخت کی پناہ میں آتا ہے، بھیڑیا رک جاتا ہے-- جیسے اسے بھیڑ کا بچہ نظر آنا بند ہو جاتا ہو یا اس درخت کی پناہ میں آنے کے بعد بھیڑیے کی جرأت نہیں ہوتی کہ بچے کو ہلاک کرنے کی نیت سے درخت کے پاس آسکے۔ جوگی کو ایسے لگتا ہے کہ یہ کوئی طلسماتی درخت ہے کہ اس کی پناہ میں آئی جان، دشمن کے جان لیوا حملے سے محفوظ پناہ گاہ ہے-- وہ دور بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس طلسماتی درخت کے اثر کو دیکھنے سمجھنے اور جاننے میں انہماک سے مصروف ہو گیا۔

یہ آنکھ مچولی اور زندگی اور موت کا کھیل بہت دیر تک جاری رہا-- بچہ درخت کے سایہ دار احاطے سے نکلتا تو بھیڑیا پوری قوت سے جھپٹتا، وہ پھر اس درخت کی پناہ میں آجاتا-- اُسے اس درخت کی پناہ میں پا کر بھیڑیا خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتا-- جوگی نے بہت غور کیا کہ یہ درخت ایک آہنی محفوظ قلعہ ہے-- کوئی ایسی بات ہے کہ شکاری اپنے شکار پر قادر نہیں ہو پا رہا-- اس جوگی کا نام ہندو تاریخوں میں "بابا رتیا برت" کے نام سے موجود ہے--!

جوگی بابا رتیا برت گرمی سے بے حال ہوا تو اس نے سوچا، وہ بھی اسی درخت کے نیچے جا کر ستاتا ہے-- جوگی نے یہ بھی دیکھا کہ وہ نامراد بھیڑیا بھی تھک ہار کر کہیں نکل گیا ہے-- جونہی بابا درخت کے نیچے پہنچا، درخت کی جڑ میں چھپا، بھیڑ کا بچہ ڈر کر نکلا اور صحرا کی طرف منمناتا ہوا بھاگا-- اُدھر چالاک بھیڑیا بھی مکاری اور چالبازی میں استاد تھا۔ وہ دور جا کر صحرا میں ریت کھود کر گڑھے میں چھپے لگا کر بیٹھا ہوا تھا، جوں ہی اس نے بھیڑ کے

بچے کو دیکھا تو اپنی کمین گاہ سے نکل کر حملہ کیا، جو جان لیوا ثابت ہوا---!

اس زمانے میں یہ جگہ ایک ویرانہ تھی--- بہت فاصلے پر ایک چھوٹا سا قلعہ اور تھا۔ اس قلعے پر سکھ حکمران حکومت کرتے تھے۔ حاکم سردار کا ایک بھانجا "سوجان سنگھ" نام کا تھا، جس کو شکار اور صحراؤں میں اپنا گھوڑا دوڑانے کا شوق تھا--- سوجان سنگھ بھی اکثر اِدھر آیا کرتا تھا اور اس کے تجربے میں بھی تھا کہ اگر کوئی ہرن اس درخت کی پناہ میں آجاتا اور اس پر تیر مارا جاتا تو تیر راستے میں گر جاتا یا اِدھر اُدھر نکل جاتا، بس جانور ہر طرح سے محفوظ رہتا تھا--- یا پھر شکار نظر آنا بند ہو جاتا تھا--- سوجان سنگھ بھی اس راز سے آگاہ تھا مگر بات کی باریکی سمجھنے سے ابھی تک قاصر تھا۔

ایک دن سوجان سنگھ اِدھر آیا تو اس نے بابا رتیا برت کو وہاں درخت کے نیچے بیٹھے پایا۔ بابا جوگی رتیا برت رشتے میں سوجان سنگھ کا چچا لگتا تھا۔ وہ وہاں درخت کی جڑ سے پانی نکال کر کوئی ایسا عرق بنا رہا تھا کہ جس سے کیمیا گری ہو سکتی تھی اور عام سا پیتل، اس کے "تڑکے" اور "تا" سے سونے میں بدل سکتا تھا۔

دونوں نے تبادلہ خیال کیا--- کہتے ہیں کہ سوجان سنگھ نے عرق چکھ کر دیکھا--- عرق چکھنے سے اُس کی عقل کے بند دروازے کھل گئے--- اس رات اس نے خواب دیکھا۔ اس خواب میں اُسے ایک بزرگ ملے اور انھوں نے سوجان سنگھ کو پوری بات سمجھائی--- صبح جب سوجان سنگھ نیند سے بیدار ہوا تو خواب اس کے دماغ پر سوار تھا--- اس نے اس خواب میں بزرگ کی طرف سے دی گئی "مت" پر عمل کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا۔

سوجان سنگھ نے اپنے ماموں صاحب سے کہا کہ مجھے وہ پیلو کے درخت والی جگہ ہبہ کر دو، میں وہاں ایک قلعہ بنانا چاہتا ہوں--- ماموں نے کہا کہ جگہ تو میری ہے، وہ تو میں ابھی تمہیں تحفہ میں دے دیتا ہوں، مگر سرمایہ کہاں سے آئے گا کہ تمہاری مرضی کا اتنا بڑا قلعہ تعمیر ہو سکے--- وہ بولا کہ وہ میرا مسئلہ ہے، آپ فکر نہ کریں---!

ماموں سردار نے سوجان سنگھ سے پوچھا--- اور بتا تو مجھ سے کیا چاہتا ہے---؟

سوجان سنگھ نے بزرگ کی ہدایات کو ذہن میں یاد کیا اور کہا کہ ہمارے پاس جو سب سے بڑی اور خوبصورت بھینس ہے، وہ دے دو اور ساتھ میں ایک مسلمان قصائی کہ مجھے جہاں قلعہ بنانا ہے، اس زمین پر بھینس کو ذبح کرانا ہے--- اس نے کہا "بلی" چڑھا دو بھینس کی--- اس نے کہا، نہیں، میں نے وہ کرنا ہے جو مجھے بزرگوں نے کہا ہے۔

عین اس جگہ جہاں پر اس وقت مجھے یہاں اس پیلو کے درخت کے سائے میں دائیں طرف اونچائی پر قلعہ نظر آ رہا ہے--- روایت کے مطابق اس بھینس کو وہاں ذبح کیا گیا۔

بزرگ کی ہدایت کے مطابق اس بھینس کا گوشت، اس زمین پر صدقہ کر کے بکھیر دیا گیا کہ جس زمین پر قلعہ بنانا مقصود تھا-- اور وہیں، اسی جگہ سوجان سنگھ بھینس کی کھال لے کر بیٹھ گیا-- اس نے بھینس کی کھال کو خود محنت اور لگن کے ساتھ صاف کیا اور بڑی نفاست کے ساتھ دباغت کیا-- جب کھال دباغت ہو کر چمڑے میں تبدیل ہوگئی تو پھر اس چمڑے سے باریک باریک رسی نما فیتے کاٹنے اور جوڑنے شروع کیے-- کچھ ہی دنوں کی محنت کے بعد بھینس کی کھال کا چمڑہ ایک طویل دھاگے میں تبدیل ہوگیا-- تب سوجان سنگھ نے اس ایک رسی سے اس زمین کا ایک رخ ماپ کر نشان لگایا، اور پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا رخ ناپ کر کلے گاڑ دیے۔ یہ کل احاطہ قلعہ دراوڑ تھا--!

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قلعہ دراوڑ مربع شکل میں کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی ہر دیوار کی لمبائی ایک سی پیمائش اسی وجہ سے رکھتی ہے۔ پھر اس رسی کو بزرگ کی ہدایت کے مطابق قلعے کے عین مرکز میں گہرا گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔

یہ حالات واقعات دیکھ کر ماموں سردار کے خاص مشیروں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا کہ لگتا ہے کہ سوجان سنگھ کی نیت خراب ہے۔ وہ اپنے ماموں کے قلعے کے مقابلے پر ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ ضرور آپ پر حملہ کرے گا اور اپنی حکومت قائم کرے گا۔ اس کا حل یہ ہے کہ اس کو پیسہ دولت دینا بند کر دو تاکہ اس کا پراجیکٹ یہیں کا یہیں دھرا رہ جائے-- یہ بات ماموں سردار کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ جو سوجان سنگھ کی امداد کر رہے تھے، بالکل بند کر دی اور قلعہ دراوڑ کی تعمیر رک گئی--!

سوجان سنگھ جب بھی قلعے کی تعمیر کے سلسلے میں کسی مشکل کا شکار ہوتا تو اسی پیلو کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ جاتا-- پھر ایسا گیان دھیان پاتا کہ رکاوٹ اور مشکل حل ہو جاتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا-- کیا دیکھتا ہے کہ درخت کے سائے میں کوئی بزرگ آرام کر رہے ہیں: اس نے انھیں آداب کیا اور ان کے پیروں کی طرف اپنی پریشانی میں مبتلا بیٹھ گیا-- بزرگ استراحت چھوڑ کر اٹھے-- پوچھا-- نوجوان کیوں افسردہ اور پریشان حال ہو--؟

سوجان سنگھ نے بڑے دکھ سے پورا قصہ سنایا اور رو کر کہا'' -- میں اور میرا پیدا کرنے والا جانتا ہے کہ میری نیت میں اقتدار کی بھوک نہیں ہے-- قلعے کا کام بند ہوگیا ہے-- آپ جیسے کسی بزرگ نے کہا تھا کہ تم یہاں قلعہ بناؤ-- میں نے ان سے کہا تھا-- کیسے بناؤں، میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے-- انھوں نے فرمایا

تھا--سب ہو جائے گا--"

یہ بزرگ مسکرائے--بولے--"فکر نہ کرو--سب ہو جائے گا--بس ایک وعدہ کرو--"

پوچھا--فرمادیجئے--ہو جائے گا--"

کہنے لگے"--قلعہ تو وہ اونچے ٹبے پر بن رہا ہے--تم ایسا کرو کہ یہاں سامنے حفاظتی دیوار قلعے کے گرد بنادو کہ یہ درخت جس کے نیچے ہم بیٹھے ہیں، لکڑہاروں اور دشمنوں کی نظر سے پوشیدہ ہو جائے--یہ درخت رحمتوں والا ہے--جب تک سلامت رہے گا، یہ قلعہ اور حصاری دیوار بھی سلامت رہے گی--جب کوئی اس کو ختم کرے گا، تب قلعہ بھی زمین بوس ہو جائے گا--"

یہ کہہ کر وہ چپ کر گئے--پھر ایک وقفے کے بعد بولے--

"--تم نہیں جانتے--یہاں صحابہ کرامؓ کی نیک روحوں کا مسکن ہے، یہ جگہ جائے پناہ ہے، ان کی برکت ہے--"

"--تم فکر نہ کرو قلعہ بنے گا--میں اپنا زادِ راہ اور کپڑوں کا تھیلا اس درخت پر لٹکائے دیتا ہوں--تمہیں جس قدر بھی مال و زر کی ضرورت ہو، اس میں سے نکال لیا کرو--غریبوں کو کھانا کھلایا کرو اور قلعے کو تعمیر کرتے رہو--کبھی تنگی نہ ہوگی--"

ایسا ہی ہوا--دنیا والے حیران تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے قلعہ تعمیر ہو کر کھڑا ہو گیا۔

میں اسی بابرکت پیلو کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا--!

کوئی کہتا ہوا گزر گیا تھا--یہاں نہ بیٹھو، اس درخت پر آسیبوں کا سایہ ہے--!

میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا--میری اولاد در اولاد کو علم اور شہرت اسی طرح ملے کہ جیسے میرے جدِ امجد مولانا محمد باقر شہید نے اگلی نسلوں کے لئے دعا کی تھی--اور آج ہم اسی دعا کے ثمر میں سب کچھ پا رہے ہیں--!!!

ختم

باب ۲۲

میں ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہوں
قلعہ دراوڑ کی دیومالائی مگر حقیقی داستان

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس درخت کے سائے کو چھوڑ کر اٹھ جاؤں--- مگر مجھے آگے، نئے سفر کی طرف بڑھنا ہی تھا---!

مجھے لگتا تھا کہ اس کے سائے میں بھی برکتیں ہیں، جو خود بخود مجھ پر نچھاور ہو رہی ہیں---!

گیان دھیان کہتا تھا کہ رک جا، یہ برکتوں والا ٹھکانہ ہے--- پر لوگ کہتے تھے کہ آسیب کے سائے ہیں--- میں نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا؛ روشنی کی خوبصورت اور نازک کرنیں چھن چھن کر آ رہی تھیں؛ مگر اس چھدرے، بوڑھے درخت سے کوئی ایسی کرن مجھ پر نہیں پڑ رہی تھی کہ جس میں تمازت اور جھلسا دینے والی گرمی ہو--- میں حیران تھا، اتنے چھدرے درخت میں چھاؤں ہی چھاؤں تھی--- جب کہ میرے سامنے میدان اور ریت، تمازت آفتاب سے جھلس رہی تھی--- یقیناً اس کی چھایا میں پناہ ہی پناہ تھی---!

سوجان سنگھ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے کہ ہر حکیم کی دوا کے باوجود اس کی ماں کے یہاں حمل نہیں ٹھہرتا تھا--- جوگی بابا رتیا برت، تیرتھ یاترا سے آیا تو اس کے آگے یہ مسئلہ سوجان سنگھ کے ماموں سردار نے پیش کیا--- اور

پوچھا کہ کیا جتن کریں کہ میری بہن اولاد کا منہ دیکھے-- جوگی بابا نے حساب جوڑ کر کہا کہ سو بھینس پورن ماشی کی رات کو کنیا کا ہاتھ لگوا کر بھینٹ کرو-- جب وہ امید سے ہو جائے تو پھر اماوس کی درمیانی رات کو مزید سو بھینس، حاملہ کنیا کے گرد پھیرے لگوا کر بھینٹ کر دو-- اور جب اوپر والے کے حکم سے لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام "سوجان سنگھ" رکھ دینا--

ایسا ہی کیا گیا اور ایسا ہی ہوا-- سوجان سنگھ کی بقیہ زندگی کی کہانی، ایک انوکھی کہانی ہے-- اگر آج سوجان سنگھ کی زندگی پر کوئی فلم بنائے تو یقین مانیے کہ وہ فلم چولستان اور جیسلمیر کے شہزادے باجے راؤ جیسی ہی ہوگی، جس کے دل کی رانی مستانی بنی اور امر ہوگئی-- یاد رہے کہ باجے راؤ کے ایک بیٹے کا نام سوجان سنگھ تھا--!

قلعہ دراوڑ میری آنکھوں کے سامنے اونچے نیچے میدان کے پار صاف نظر آ رہا ہے--!

لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے چلے آ رہے ہیں-- میں پیلو کے متبرک درخت کے نیچے بیٹھا ہوں-- وجدان میری تصویریں بنا رہا ہے اور اس کے چہرے سے لگتا ہے کہ وہ یہ سوچ رہا ہے کہ غالباً بابا تھک گئے ہیں، ان کو آواز دے کر اٹھانا مناسب نہیں ہے-- حیدر اور عمر فرحان بے قراری سے اردگرد کے کھنڈروں میں تاکا جھانکی کر رہے ہیں-- ادھر میں گہری سوچ میں غرق ہوں--!

سوچ رہا ہوں کہ سوجان سنگھ اور اس کی زندگی کی کہانی ہی تو یہ قلعہ دراوڑ ہے-- وہی اس قلعے کا اصل مالک ہے۔ وہی اس کو بنانے والا ہے-- اسی کی کہانی نہ سنائی تو سمجھو قلعہ دراوڑ ادھورا رہ گیا-- وہی اس قلعہ دراوڑ کا پہلا حکمران تھا۔ اگر اس کا ذکر نہ ہو تو قلعہ دراوڑ ہی بیان نہ ہو سکا-- دراوڑ کی تاریخ بھی ادھوری رہ جائے گی اور سفرنامہ بھی پھیکا پڑ جائے گا-- سوجان سنگھ، قلعہ دراوڑ کی جان تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید یہ قلعہ بھی نہ ہوتا! پھر خیال آیا کہ اگر یہ پیلو کا درخت نہ ہوتا تو شائد پھر بھی قلعہ دراوڑ نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو ایسا نام ور نہ ہوتا--!

سوجان سنگھ ہی اصل میں قلعہ دراوڑ کا مرکزی ہیرو ہے اور آخری ہیرو اس قلعہ دراوڑ کے نواب صبح صادق چہارم تھے-- نواب محمد صادق اس قلعے کے آخری حکمران اور فرمان روا تھے--!

یہ کیسے ممکن ہے کہ میں قلعہ دراوڑ کے پہلے حکمران اور بانی قلعہ کے ذکر کو در گذر کر جاؤں-- یہ داستان جو میں لکھ رہا ہوں، اس کا ہیرو میں ہرگز نہیں ہوں-- مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں، میں کا ڈسا ہوا نہیں ہوں-- میں تو ایک چار دن کا مسافر ہوں، جو چولستان میں قلعہ دراوڑ کے عشق میں اپنے بچوں کے ساتھ چلا آیا ہوں--!

اس وقت میرے نزدیک قلعہ دراوڑ کا ہیرو سوجان سنگھ ہے اور میں اپنے گیارہ بارہ سو سالہ قدیم ہیرو کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں کہ جس کو چولستان کی ریت کے ذرے بھی فراموش نہ کر سکے اور نہ ہی کر سکیں گے۔۔!

بڑی عجیب اور دلچسپ داستان ہے سوجان سنگھ کی۔۔ حقیقی بادشاہ کی جان ہمیشہ ہتھیلی پر ہوتی ہے۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ آج رات زندہ سلامت ہے اور کل رات اس کی لاش محل کی اونچی والی برجی سے پس دیوار پھینک دی جائے۔۔ جب کہ غیر حقیقی بادشاہ اپنے عوام کی لاشوں پر حکمرانی کرتا ہے! وہ جتنے لوگوں اور رعایا کے گلے کاٹتا ہے، اتنے دن اس کی حکمرانی کے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کلیہ ہمیشہ سے رائج ہے اور سلسلہ بند جاری رہے گا۔۔!

سوجان سنگھ روہی چولستان کا حقیقی بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں اس پر پیلو کے درخت کے بزرگوں کا سایہ تھا کہ وہ بزرگ بھی حقیقی صاحبانِ کشف اور متبرک صحابہ کرامؓ تھے۔۔! جو قلعہ دراوڑ میں دفن ہیں۔

جن بزرگ نے پیلو کے درخت پر اپنا تھیلا لٹکایا تھا، وہ حضرت سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ تھے۔ ان ہی کی برکات اور نظر کرم سے قلعہ دراوڑ سوجان سنگھ کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا۔۔!

سردار ماموں جب بہت پریشان اور حیران ہوا کہ سوجان سنگھ کی ہر امداد بند کر دینے کے باوجود بھی قلعہ دراوڑ اپنی پوری آن، بان، شان سے تیار ہو گیا۔۔ مشیروں نے مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ سوجان سنگھ کی نیت خراب ہو اور وہ سنگھاسن پر حملہ آور ہو جائے، فوراً سیاسی چال چلنی چاہیے۔ پرانے اختلافات کو ختم کر کے رشتے داری اور محبت کو بیچ میں لے آنا چاہیے۔ جب وہ رشتوں کی محبت کے جال میں ٹھیک طرح پھنس جائے تو سوجان سنگھ کی شادی پر زور دیا جائے اور قلعہ رام کلی، جس سے ہماری پرانی دشمنی چلی آتی ہے! اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنا چاہیے۔ رام کلی کا سردار بہت غصے والا اور جذباتی انسان ہے۔ اگر ہمارے در پردہ آدمی اسے غصے دلانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ لازماً سوجان سنگھ کو قتل کرا دے گا اور اگر شادی پر راضی ہو گیا تو ہمارے خفیہ لوگ سوجان سنگھ کو ایسے خاندانی اور گھریلو مسائل میں الجھا دیں گے کہ بات آپس میں قتل و غارت گری تک پہنچ جائے گی اور اپنے سسرال والوں کے ہاتھوں سوجان سنگھ سو طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے گا اور اس کو اپنی پڑ جائے گی۔ یوں ہماری جان اس سے چھوٹ جائے گی۔۔ اور قلعہ دراوڑ بھی ہمارا ہو جائے گا۔۔!

سردار ماموں نے سازش تو تیار کر لی، مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ الٹی گلے پڑ گئی۔

اس زمانے کا قلعہ رام کلی، آج کا اُچ شریف ہے۔۔!

رام کلی کے سردار نے دو شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ قلعہ دراوڑ کا سردار اور بے تاج بادشاہ خود، بہ نفسِ

نفیس، قلعہ دراوڑ سے اپنی نگرانی میں بارات لے کر آئے گا اور دوسرے اس کے راضی اور ناراض دونوں قسم کے رشتے دار اونٹوں پر سوار ہو کر بارات میں لازمی آئیں گے -- شرائط منظور کر لی گئیں۔

شرطوں کے منظور ہوتے ہی رام کلی کے سردار نے باضابطہ اور سرکاری طور پر دور دور تک اعلان کرا دیا کہ آج سے میری بیٹی مست گلابو، سوجان سنگھ کی منگیتر ہے --!

قلعہ رام کلی کا سردار بھی بہت چالاک اور دھوکے باز آدمی تھا۔ اس نے اُدھر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ سوجان سنگھ کے پورے خاندان اور مصاحبوں کو اکٹھا قتل کر کے سردار ماموں کے چھوٹے قلعے اور قلعہ دراوڑ پر خاموشی سے قبضہ کر لوں گا۔

سوجان سنگھ اپنے ساتھ ہمیشہ ایک مہا پنڈت کو رکھتا تھا، جو علوم سیارگان، علم ہندسہ اور نجوم کو جانتا تھا اور کہتے ہیں کہ کئی دیویاں اس کے قبضے میں تھیں، جو غیب کی پہلے سے نشاندگی کر دیتی تھیں -- جب بارات قلعہ رام کلی پہنچی اور ابھی اندر داخل نہ ہوئی تھی کہ مہا پنڈت نے سوجان سنگھ کو بتایا کہ رام کلی کے سردار کی نیت تیری اور ہم سب کی زندگی پر خراب ہے۔ اپنا اونٹ جو اسی کی ہدایت پر بارات میں سب سے پیچھے رکھا گیا تھا، اب کام آیا۔ مہا پنڈت نے سوجان سنگھ سے کہا -- نکل بھاگ یہاں سے، جو جو قلعے کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے، قتل کر دیا جا رہا ہے۔ دھوکہ ہو گیا ہے ہمارے ساتھ -- جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، خود اس میں گرتا ہے۔

غرض قلعہ رام کلی کے سردار اور مست گلابو کے باپ نے سارے درباریوں، عزیز و اقارب اور سردار ماموں کو بھی قتل کر دیا -- صرف مہا پنڈت اور سوجان سنگھ جان بچا کے بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔

مہا پنڈت اور سوجان سنگھ نے طے کیا کہ دریائے ہاکڑہ کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ وہ بھاگتے رہے، یہاں تک کہ سوجان سنگھ ذہنی، اعصابی اور جسمانی تھکن کا شکار ہو کر بے دم ہو گیا -- مہا پنڈت نے کہا اونٹ کو زمین پر نہیں بٹھانا۔ اگر اونٹ بیٹھ گیا تو اس کے بیٹھنے کے نشان اور تمہارے قدموں کے کھرے سے ان کو تمہارا سراغ مل جائے گا۔ وہ ہمارے پیچھے ہی آ رہے ہوں گے۔ مہا پنڈت نے تجویز دی کہ جب کوئی درخت آئے تو تم اس کے نیچے سے گذرتے ہوئے درخت کی شاخ پکڑ کر اس پر ٹھہر جانا اور جب درخت سے نیچے اترو تو شاخ بھی توڑ لینا، اس سے اپنے پیروں کے نشان مٹا کر کہیں نکل جانا۔

قریب کے کھیت میں ایک سکھ اپنی نوجوان لڑکی کے ساتھ کھیتی باڑی اور آبیاری کا کام کر رہا تھا۔ سوجان سنگھ پانی میں اتر گیا اور چلتا ہوا ان تک پہنچا۔ اس طرح اس کے پیروں کے نشان بھی غائب ہو گئے۔

سوجان سنگھ نے کسان سکھ سے پناہ مانگی جو اس نے دے دی۔اس زمانے کا اصول تھا کہ جب پناہ دے دی تو زبان دے دی اور اگر زبان دے دی تو جان اور مال بھی قربان کر دیا؛ گویا وچن دے دیا تو شرن دے دیا--!

اُدھر مہا پنڈت نے چالاکی یہ کی کہ ایسا بن گیا کہ جیسے وہ خود سوجان سنگھ کا دشمن ہو اور اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو-- اتنے میں رام کلی سردار کے سپاہی بھی مہا پنڈت کو مل گئے--وہ بھی ان کی تلاش میں بھولا بن کر شامل ہو گیا-- یہاں تک کہ یہ سب لوگ اسی سکھ کسان کے گھر پہنچ گئے۔اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہاں کافی دیر پہلے دو اونٹ سوار اُدھر کو جاتے دیکھے تھے--پوچھا، گھر میں یہ نوجوان کون ہے--کہا کہ میرا داماد ہے--

مہا پنڈت خاموشی سے سارا تماشہ دیکھتا رہا اور چپ رہا۔

دشمنوں کی فوج کے ساتھ بھی ایک عاقل سیانا تھا۔صورت حال دیکھ کر کہنے لگا--لو جی، مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے۔رواج ہے کہ میاں بیوی رات کو اکٹھے سوتے ہیں۔ہم صبح تڑکے ہی چھاپا ماریں گے۔اگر ہم بستری کی علامتیں نہ ملیں تو قتل کر دیں گے، کیونکہ یہ سوجان سنگھ ہو یا ناں ہو، ہم سے جھوٹ کیوں بولا گیا--

چولستان روہی میں مشہور ہے کہ قدیم چولستانی لوگ پرندوں کی زبان سمجھتے تھے۔کسان پرندوں کی بولی سمجھتا تھا--اس نے سنا کہ اس کے گھر کی منڈیر پر بیٹھے دو کبوتر یہ بات کر رہے تھے کہ اگر یہ دونوں بہ طور میاں بیوی رات کو نہ سوئے تو صبح مارے جائیں گے۔کسان نے فوراً یہ بات آ کر اپنی بیٹی کو بتائی اور پوچھا، اب کیا کریں--لڑکی نے کہا یہ لڑکا مجھے بھاتا ہے، آپ باپو جی اس کو داماد کہہ چکے ہو، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔سردار کسان نے گرو گرنتھ کے اشلوک پڑھے اور وہ میاں بیوی ہو گئے۔

صبح تڑکے میں کہ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ فوج نے ہلہ بول دیا--دیکھا کہ دونوں پڑے میاں بیوی کی طرح یک جان سوتے تھے۔فوج واپس چلی گئی--آج کا دور ہوتا تو پوری پوری بائیو میٹرک تصدیق کی جاتی--!

سات دن اور رات دونوں وہاں رہے--ساتویں دن سوجان سنگھ اپنی بیوی کو لے کر قلعہ دراوڑ آ گیا--!

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی میرے دوستو--!

سوجان سنگھ بہت بے چین رہتا تھا--اس کو بے چینی اور بے قراری میں اتنی گرمی لگتی کہ کپڑا ٹھنڈا کر کر کے سر پر رکھتا اور جسم کو لگاتا تھا--گویا کسی بات نے اس کا بلڈ پریشر بڑھا رکھا تھا، جس کو وہ ٹھنڈے پانی سے قرار دیتا تھا--اس کی بیوی پھولن کور نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا--ہم سکھ قول کے پکے اور وعدے کے سچے ہوتے ہیں، جیسے

تیرے باپو نے تیری مجھ سے شادی کر کے کھرا قول نبھایا، اسی طرح میں اپنی منگیتر مست گلابو سے کیا قول نبھانا چاہتا ہوں۔ میری منگ ان کے پاس ہے، انھوں نے دھوکے سے میرا پورا خاندان قتل کر دیا؛ بتا، میری پھولن کور میں کیا کروں--- مجھے چین نہیں آتا۔ میرا وچن سچا تھا اور سچا ہے، ان کا وعدہ جھوٹا تھا اور جھوٹا ہے---؟

پھولن کور مائی، سوجان سنگھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ سوچ کر کہنے لگی اگر اپنے خاندان کا انتقام لینا ہے تو عقل سے منصوبہ بندی کرو---ایسا کرو کہ اپنے جنگجو، آدمی قلعہ دراوڑ سے اجناس کے تاجر بنا کر رام کلی بھیجو---

آدمی گندم چاول کے تاجروں کے بھیس میں گئے۔ رام کلی قلعے میں کوئی سرداران کا خریدار نہیں آیا---وہ روز آواز لگاتے اور روز ناکام واپس آجاتے۔

سوجان سنگھ، اپنی بیوی پھولن کور سے رات کو سر جوڑ کے بیٹھا اور ناکامی کی داستان سنائی---عورت سمجھ دار تھی، کہنے لگی پتہ کرو کہ ان کے یہاں کس چیز کی قلت ہے، بس اُسی کا تاجر بھیجو---

پتہ چلا کہ قلعہ رام کلی میں جانوروں کی گھاس کا قحط ہے---بس گوہر مقصود ہاتھ لگ گیا---اگلے دن ہی ماہر سپاہی گھاس کے تاجر بن کر قلعہ رام کلی گئے---سردار نے یہ خبر سنی تو فوراً دربار میں حاضر کیا اور سو بیل گاڑیوں کی قیمت طے کر کے مال لانے کو کہہ دیا۔

سوجان سنگھ نے اس کامیابی کی خبر اپنی بیوی پھولن کور کو سنائی اور پوچھا---نیک بخت، بتا، اب کیا کرنا ہے---؟

کہنے لگی---بس آدھا کام تو ہو گیا ہے---تم ایسا کرو کہ لکڑی کے بڑے بڑے سو صندوق فنافٹ بنواؤ---کہ ہر صندوق میں پانچ سپاہی مسلح آسانی سے لیٹ یا بیٹھ جائیں؛ یوں سو صندوقوں میں پانچ سو سپاہی آسانی سے آجائیں گے۔ ہر صندوق پر گھاس چپکا دو اور گاڑیوں میں رکھ کر اوپر ہری ہری گھاس لاد دو---!

اُسی طرح کیا گیا---جوں ہی بیل گاڑیاں قلعہ رام کلی میں پہنچیں، گھاس کے صندوقوں میں بیٹھے سپاہیوں نے حملہ کر دیا۔ حکمران کو بھی تہہ تیغ کر ڈالا---اور سوجان سنگھ کی منگیتر مست گلابو کو زندہ سلامت قلعہ دراوڑ لے آئے۔

اس رات سوجان سنگھ نے پیار محبت کے بعد پھر اپنی بیوی پھولن کور سے مشورہ کیا کہ اس رام کلی کے قلعے کا کیا کریں---اس قلعے کو اگر یونہی چھوڑ دیا تو پھر کچھ عرصے میں نیا محاذ بن جائے گا---!

اگلے دن کہتے ہیں کہ سوجان سنگھ نے اپنی روہی کی تمام رعایا کو قلعہ دراوڑ طلب کیا اور قلعہ رام کلی تک دمیوں کی ایسی قطار بنادی کہ جس کا ایک سرا قلعہ دراوڑ کو لگتا تھا اور دوسرا قلعہ رام کلی میں تھا---پھر اس نے حکم دیا

کہ قلعہ رام کلی کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ دو اور اگلے آدمی کے ہاتھ میں دے دو۔ اس طرح مفتوحہ قلعے کا سارا ساز و سامان اور اینٹیں قلعہ دراوڑ منتقل ہو گئیں، جس سے قلعہ دراوڑ کے گرد حفاظتی دیوار کو نہ صرف اونچا کر دیا گیا بلکہ مزید بنا بھی دیا گیا--!

جب قلعہ دراوڑ میں امن ہوا تو ایک دن سوجان سنگھ کی بیوی پھولن کور کہنے لگی--اے میرے جان جی، تمہاری منگیتر اب یہاں دراوڑ میں آ گئی ہے، وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت اور جوانی کے شہد یلے رس سے بھرپور ہے۔ حُسن میں، میں اس سے بہت کم ہوں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے طلاق دے دو اور اسے بیوی بنا لو-- کہتے ہیں کہ یہ سن کر سوجان سنگھ دھاڑ دھاڑ رونے لگا اور اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا تم میرے مصیبت کے وقت کی ساتھی ہو، یہ تو ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں--!

جب یہ بات مست گلابو کو پہنچی تو اس نے صدمے سے زہر پھانک کر جان دے دی--!

پھر قلعہ دراوڑ میں ایک بڑی اور پہلی تقریب ہوئی۔ قلعہ دراوڑ کے در و دیوار پر رات میں خالص گھی کے چراغوں سے چراغاں کیا گیا--اس روز چولستان کے پہلے باقاعدہ حکمران کی تاج پوشی ہوئی--سوجان سنگھ، راول سنگھ اول کے نام سے قلعہ دراوڑ کا تاریخی حکمران تسلیم کیا گیا--!

باب ۲۳

فروری میں جلتی دوپہر اور قلعہ دراوڑ میں قلعے کے گرد چکر لگاتا اور آنسو بہاتا ہوں--!

قلعہ دراوڑ کے گرد ایک جشن کا سماں تھا--!

سیاحوں کے علاوہ بے شمار مقامی لوگ بھی جوق در جوق چلے آتے تھے--مگر ان کے ساتھ ایک بھی مقامی عورت نہیں تھی البتہ بیرونی علاقوں سے آئے سیاحوں میں عورتوں لڑکیوں کی بھی بڑی تعداد تھی--!

قلعہ دراوڑ کی مرکزی فصیل اور بلند و بالا داخلے کا دروازہ، یہاں دور سے بھی صاف نظر آتا تھا، مگر بند تھا--معلوم ہوا کہ آج قلعہ دراوڑ کے اندر کے درشن نہیں ہو سکتے--جو دیکھنا ہے باہر باہر سے دیکھ لو--شام کو دن ڈھلے ہی "جشنِ دراوڑ" کا اہتمام ہے۔ قلعے کی فصیلوں سے آتش بازی کے ایسے مظاہرے ہوں گے کہ کبھی کم ہی دیکھے ہوں گے--فوجی جوان قلعے کا بیرونی انتظام سنبھالے چوکس کھڑے تھے۔

قلعہ دراوڑ اور اس کا دروازہ بہت اونچائی پر تھا--درمیانی میدان سے ہو کر ایک کچا مگر کشادہ اور صاف ستھرا راستہ قلعے کی فصیل کے ساتھ ساتھ ہو کر قلعے میں داخلے کے پرشکوہ دروازے کو جاتا تھا--!

سینکڑوں سرخ آراستہ کرسیاں، قلعے کی فصیل اور دروازے کے سامنے نچلے میدان میں سلیقے قرینے سے

قطار اندر قطار لگی تھیں---رات کو ہونے والی تقریب کا وسیع و عریض اسٹیج عین قلعے کے دروازے کے باہر سجایا گیا تھا---مگر ابھی اسٹیج اور کرسیوں پر تیز دھوپ براجمان تھی اور پہرے پر چوکس فوجی جوان کھڑے تھے---یہ بھی سنا کہ رات کو جب تقریب شروع ہوگی تو بڑے بڑے کرنل اور جنرل بھی آئیں گے---ارد گرد کے شہروں کی انتظامیہ کے بڑے بڑے افسران بھی یہاں پہنچیں گے---موسیقی کا ایک بڑا پروگرام ہوگا، جس میں چولستان کے لوک فن کار خصوصاً حصہ لیں گے---اس وقت پورا قلعہ دراوڑ چاروں طرف سے تیز اور خیرہ کن روشنیوں سے جگمگا رہا ہوگا---زمین و آسمان اور قلعہ دراوڑ کا ہر انگ اور دیوار جتھہ نور بن جائے گی---روہی کی موسیقی ان میدانوں میں اپنے سُر بکھیرتی ہوگی اور لوک روہی رقص بھی ہوں گے۔ گویا چولستان روشنیوں سے جگ مگ کر رہا ہوگا---قلعے پر اتنی روشنی ہوگی کہ قلعہ دراوڑ میلوں دور صحرا سے بھی نظر آنے لگے گا---!

مگر اس وقت سورج عین آسمان کے وسط میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا کہ بے اختیار پسینہ آتا تھا، حلق خشک ہو کر بار بار گھونٹ گھونٹ پانی مانگتا تھا---قلعے کے ارد گرد مگر دور دور کانٹوں بھری جھاڑیاں تو ضرور تھیں، مگر کسی سایہ دار درخت کا نام ونشان نہیں تھا---بس وہی ایک پیلو کا درخت تھا کہ جس کے نیچے ابھی کچھ دیر پہلے میں بیٹھا تاریخ کی کہانیوں کو بے اختیار تازہ کرتا تھا---!

مقامی لڑکے بالے قلعے کی حصاری دیوار کے ساتھ کھڑے بوسیدہ عمارتی کھنڈرات کی ادھ کھڑی دیواروں کے سایوں میں چھپے ہمیں حیرت سے دیکھتے تھے---جیسے تماشہ دیکھ رہے ہوں---ان کے لئے ہم تماشہ ہی تھے---ہمارے لباس، ہمارے ہیٹ، ہماری سلفیاں اور ہم سیاحوں کے ساتھ جو خواتین تھیں، وہ ان کی خاص دلچسپیوں اور جملے بازیوں کا نشانہ تھیں---کوئی بھی الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے صابر وشاکر تھے---!

ایک آدھا خوانچے والا بھی کسی طرح قلعے اور دیوار کے درمیانی میدان میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بڑی مدت بعد میں نے "دال سیویوں" والے کو دیکھا تھا---لوہے کے اسٹینڈ پر بڑے سے گول تھال میں بڑے اہتمام سے اس نے بیسن کی روایتی سیویوں اور چٹخارے دار چنے کی دال سے لبالب بھر رکھا تھا---اس پر بڑی ترتیب اور نفاست سے لیموں قطار اندر قطار سجا رکھے تھے---پھیری والے کا لباس حیرت انگیز طور پر کلف لگا، صاف ستھرا تھا، سر کا صافہ بھی قرینے سے سر پر لپٹا ہوا تھا۔ اس کے پیر کی جوتی جو سیاہ چمڑے کی پشاوری چپل تھی، سیاہ پالش سے لش پش کر رہی تھی---وجدان اور حیدر کا پکا خیال تھا کہ یہ خفیہ کا آدمی ہے، جو عوام میں کھڑے ہو کر مقامی حالات و واقعات پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے---میں ان کی بات سے کافی حد تک اتفاق رکھتا تھا اور اس بات سے

بہت مطمئن ہوا کہ اگر اس طرح انتظامیہ نظر رکھتی ہے تو بہت ہی اعلیٰ بات ہے اور انتظامات کی بہترین دلیل ہے--اس کی پھیری کا سودا بھی نفیس تھا--سیاح اس سے مصالحے لیموں والی "کراری دال سیویاں" خریدنے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے--اس گرم دوپہر میں جب وہ تازہ لیموں "دال سیویوں" پر ہاتھ ایک فٹ اوپر ہوا میں لہرا کر نچوڑتا تو لیموں کی خوشبو ایسی بھلی لگتی کہ کھانے کو دل تڑپ جاتا--!

میرا بڑا دل چاہا کہ میں بھی کراری، مصالحے لیموں والی روایتی دال سیویوں سے اپنے کام ودہن کو فیض یاب کروں مگر فقط اس ڈر سے صبر کیا کہ اگر اس پردیس اور صحرا میں نظام شکم برا منا گیا تو سب رکرا ہو جائے گا--!

قلعہ دراوڑ کی زمینی کرسی، باہر سڑک کی سطح سے کم از کم بیس پچیس فٹ اونچی تھی--بیرونی حصاری دیوار کا مرکزی دروازہ اور اوپر والی فصیل، قلعے کا مرکزی دروازہ بھی مشرق کی جانب تھا--اس میں کیا حکمت تھی، میرے علم میں نہیں تھی--لاہور میں بادشاہی مسجد میں داخلے کا مرکزی دروازہ اور قلعے کا مرکزی فصیلی دروازہ آمنے سامنے ہیں--لاہور کے شاہی قلعے کا مرکزی دروازہ مغرب کی جانب ہے اور مسجد کا مرکزی دروازہ مشرق کی طرف ہے--

قلعہ دراوڑ کی بیرونی حصاری دیوار کہ جتنی بھی سلامت تھی، اس پر آرائشی رنگین روشنیاں، جن کو عرف عام میں "مرچیں" کہا جاتا ہے، لگی ہوئی تھیں۔ بیرونی دیوار کا دروازہ بھی رنگین مرچوں سے آراستہ تھا--لاہور میں اب مرچوں سے رات کو عمارتوں پر چراغاں کی روایت ختم ہو چکی ہے۔اب اس کی جگہ یہاں لاہور میں چائنا کی رنگین لڑی بتیوں نے لے لی ہے--آج یہاں دراوڑ میں بڑی مدت کے بعد بجلی کی مرچ بتیاں دیکھیں تو خواہ مخواہ دل خوش ہو گیا--ایسا لگتا ہے کہ لاہور میں چائنا کی رنگین لڑی بتیاں آنے کے بعد دور کے چھوٹے شہروں والے الیکٹرک اسٹورز رنگین آرائشی مرچ لڑیوں کو اَونے پَونے خرید کر لے گئے ہیں اور وہاں اس کو روشن کر کے قدیم روایتوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں--!

سامنے قلعے کی آسمان تک اٹھی دیواروں پر جگہ جگہ چولستان فیسٹیول اور چولستان جیپ ریلی کے فلیکس، بڑے بڑے پردوں کی شکل میں قلعے کی فصیلوں کی نایاب اور کشادہ دیواروں پر آویزاں تھے--!

دراوڑ قلعے کی یہ سامنے والی پوری فصیل بہت اچھی حالت میں تھی--اول یہ کہ قلعہ تعمیر کرنے والوں نے اس کو مضبوط ترین اور ملاوٹ کے بغیر مصالحے سے تیار کیا تھا یا پھر فصیل کے اس حصے کی آثار قدیمہ نے خاص رکھوالی کی تھی تاکہ کم از کم قلعہ دراوڑ سامنے کی سمت سے تو اچھا بھلا دکھائی دے--باقی فصیلیں کس حال میں تھیں، یہ تو ابھی چاروں طرف دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے--!

ایک صاف سی بات کہوں، کوئی بُرا مانے یا اچھا مانے-- قلعے کی ماتھے کی فصیلوں پر یہ رنگین اور گزوں پھیلے اور لمبے لٹکتے فلیکس، مجھے بالکل اچھے نہیں لگے۔ انھوں نے قلعے کی تعمیراتی خوبصورتی اور ذاتی پرشکوہ حسن کو گہنا کر رکھ دیا تھا-- ایسا لگتا تھا کہ دولھا کے گلے میں کسی نے شادی کا کارڈ بھی فریم کرا کے لٹکا دیا ہے--!

ہم نے فیصلہ کیا کہ قلعے کی فصیل کے گرد چکر لگاتے ہیں، اطراف کو دیکھتے ہیں، اونچی فصیل کے بام خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس کا آغاز قلعے کے بائیں طرف سے شروع کرتے ہیں--

میں دیکھ رہا تھا کہ جونہی میں بائیں طرف کی فصیل کے پہلو میں آیا تو فصیل کی تعمیراتی خوبصورتی نے بلا مبالغہ آنکھوں کو خیرہ کرنا شروع کر دیا--- پہلے موڑ پر دیوار قلعہ کا محراب دیوار، نصف چاند سے بھی زیادہ وسیع تھا، کیونکہ وہ دو مستقیم دیواروں کو اپنے دائیں بائیں کے کناروں پر باہم جوڑ کر یک جان کرتا تھا-- موڑ کے جوڑ کی محرابی فصیل کی نصف خوبصورتی مشرقی دیوار سے منسلک اور پیوستہ تھی اور بقیہ نصف جنوبی دیوار کا زاویہ قائمہ تھی-- ایسا لگتا تھا کہ جب ایک سمت کی دیوار ختم ہوتی ہے تو گولائی کی دیوار میں اردو کے حرف "ن" کی طرح کی محرابی دیوار ہوتی تھی--!

ابھی ایک اچٹتی نظر دیکھا تھا کہ کچھ فلک بوس دیواریں، جن کی اونچائی بلا مبالغہ سوفٹ سے ہرگز کم نہ ہو گی-- بہت اچھی حالت میں بھی تھیں اور کچھ دیواروں کے زیادہ تر نچلے حصے یوں گرے پڑے تھے، جیسے کسی نے دیواروں کی اینٹوں کو بے رحمی سے کھرچ کھرچ کر اکھاڑ لیا ہو-- ابھی میں اس بربادی کے منظر پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آیا یہ مخصوص طرح کی اکھاڑ پچھاڑ زمانوں کے نشیب و فراز کا نتیجہ ہے، یا بوسیدگی اس کی وجہ ہے، یا وقت نے دیواروں کی اتنی کاری گری سے ایک دوسرے میں پھنسی اور چونے والوں اور توڑی کے مصالحوں سے جڑی اینٹوں کو فقط زمین کے فرش سے چند فٹ اوپر تک ہی کیوں باہر نکال پھینکا--!

میں غور سے ایک ایک اینٹ اور دیوار کو دیکھ دیکھ کر بات اور حال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ مجھے کسی نے مخاطب کیا۔

"--سر، السلام وعلیکم-- میں آپ کو سرائیکی وسیب اور روہی میں خوش آمدید کہتی ہوں--"

میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا--!

وسیب ٹی وی کی نازک اور تیکھے نقوش والی نازک سی رپورٹر ہاتھ میں اپنے ٹی وی چینل کا مائیک تھامے کھڑی مسکرا رہی تھی-- مجھے بے اختیار لگا کہ اس کی صورت اور نقش خواجہ فریدؒ کی محبوبہ سے بہت ملتے تھے--!

"--سر، میں آپ کا انٹرویو قلعہ دراوڑ کے جشن کے حوالے سے کرنا چاہتی ہوں--اگر آپ کو مائک اور کیمرے کے سامنے بولنا پسند ہو تو--؟"

"--جی ضرور--مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے مجھے منتخب کیا ہے--"

میرا یہ کہنا تھا کہ رپورٹر وسیب ٹی وی کے تنے ہوئے نازک خطوط چہرے پر اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی--اس سے پہلے کہ وہ میرا انٹرویو شروع کرتی، اس کے اندر کی خاتون نے بڑی بے تکلفی سے انگڑائی لی اور بے اختیار اپنی پریشانی کا اظہار کر دیا۔

"--سر، شکر ہے کہ آپ نے ناں نہیں کی--کوئی بات کرنے کو ہی تیار نہیں یہاں پر--جس جوڑی سے کہتی ہوں کہ ریکارڈنگ کرا دو--کہتا ہے، نہیں اور منہ پھیر کر چل دیتا ہے--جس پڑھے لکھے بندے سے درخواست کرتی ہوں، وہ کہتا ہے، مجھے تو معاف ہی کر دو، ٹی وی پر بولتے مجھے شرم آتی ہے--سمجھ نہیں آتا کہ آخر بات کیا ہے، لوگ تو ٹی وی پر بات کرنے کو ترستے ہیں--آخر ان کو کیا پرابلم ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا--" وہ اپنی بات کہتے کہتے روہانسی سی ہو گئی۔

میں بے اختیار ہنس پڑا۔

بولی "--سر، آپ ہنستے کیوں ہیں، کیا آپ کو بھی میری بات جوک لگ رہی ہے--؟؟؟"

"--ارے نہیں--قصہ صاف صاف یہ ہے کہ اتفاق سے آپ جس سیاح جوڑے سے انٹرویو کے لیے رجوع کرتی ہیں، وہ نہیں چاہتا کہ ان کے گھر والے یا عزیز و اقارب یا محلے والے، ان کو یہاں دیکھ لیں اور اس راز سے پردہ اٹھ جائے کہ لڑکی یا لڑکا اپنے کالج یا دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ مری نہیں گئے تھے بلکہ قلعہ دراوڑ کے زیر سایہ لیلیٰ اپنے مجنوں کے ساتھ تھی اور رانجھا اپنی ہیر کے ساتھ صحراؤں میں مُرلی بجا رہا تھا--!!!"

رپورٹر وسیب ٹی وی نے ایک زبردست کھنکھناتا نقرئی قہقہہ لگایا، کیمرہ مین بھی زور سے ہنسا اور ہیلپر تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ سا ہونے لگا--

رپورٹر نے ایک جھٹکے سے اپنے بالوں کی لٹ، چہرے سے پلٹائی اور بے ساختہ پوچھا۔

"--سر، آپ کے ساتھ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے ناں کہ گھر پہنچتے ہی آنٹی آپ کو دھر لیں--؟"

"--ارے نہیں، بالکل نہیں--تمہاری آنٹی بڑی خوبصورت اور دل والی خاتون ہیں، مجھے یقین ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ ٹی وی پر دیکھ کر دل و جان سے خوش ہوں گی--"

"--سر، ایک بات پوچھوں--وہ میرے ساتھ آپ کو دیکھ کر کیوں خوش ہوں گی--؟"

اس نے حیرت سے بے ساختہ سوال کر دیا۔

"--یہ راز کی بات ہے جو میں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا اور اگر میں نے تمہیں بتادی تو مجھے یقین ہے کہ تم میرا انٹرویو یقیناً کینسل کر دو گی--پلیز، ٹاک شروع کریں، قلعہ دراوڑ میری بیک گراؤنڈ میں رکھنا پلیز--" میں نے شفقت سے درخواست کی۔

"--یس سر، شروع کرتے ہیں--"

اس نے ٹشو نکال کر اپنے چہرے کو پھر سے تر و تازہ کیا، ہیلپر نے مس جی کو لپ اسٹک نکال کر دی اور شیشہ آگے کر دیا--اُدھر میں نے بھی اپنے گلے میں پڑے صافے پرُ نے سے اپنے منہ پر چڑھی مٹی کی تہہ کو اتارنے کی ناکام کوشش کر کے اپنا میک اپ تیزی سے مکمل کیا۔ سر پر رکھے ہیٹ کو ذرا سا ترچھا کیا اور انٹرویو شروع ہو گیا۔

"--میرا نام آغا سلمان باقر ہے، میں لاہور سے ہوں اور ایک رائٹر ہوں، قلعہ دراوڑ کا خواب دیکھتے دیکھتے یہاں پہنچ گیا ہوں اور----!!!"

دس منٹ کا انٹرویو اختتام کو پہنچا تو میں نے پوچھ ہی لیا--

"--آج قلعے میں ہم اتنی دور سے آئے سیاحوں کا داخلہ کیوں بند ہے--؟"

"--او ہ سر، اصل میں بات یہ ہے کہ آج کا سارا انتظام ضلعی انتظامیہ بہاولپور اور فوج کے تعاون سے ہے--رات میں آتش بازی کا زبردست مظاہرہ، لائیو کنسرٹ کے ساتھ ساتھ ہو گا--قلعہ اس لیے عوام کے لیے بند ہے کہ اس کی چاروں دیواروں اور دیواروں کے ساتھ اونچے صحنوں میں آتش بازی کی چیزیں اور سامان ترتیب سے سجا دیا گیا ہے--آپ ضرور دیکھنے آیئے گا رات کو--آتش بازی کا سامان حساس ہوتا ہے، رات کو جب وہ سب استعمال ہو جائے گا تو صبح صبح سب صاف کر کے قلعہ کو عوام کے لیے خوش دلی کے ساتھ کھول دیا جائے گا--!"

"--سر آپ کا انٹرویو دینے کا بہت شکریہ، روہی کے ٹی وی چینل و یب کی طرف سے--"

میں پھر سے قلعے کی بیرونی فصیل کی محرابی، گولائی دار دیواروں کو دیکھنے میں محو ہو گیا--

میرے سامنے پوری جنوبی فصیل کھڑی تھی۔

ہر قائمہ کونے پر جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا "ن" کی شکل کی گول دیوار تھی--ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس میں نو گول نصف دائرے کی فلک بوس گولائی دار دیواریں تھیں۔ اگر آپ نے قلعہ دراوڑ کی کوئی تصویر

دیکھی ہے تو آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں ان دیواروں کا لفظوں میں نقشہ کھینچنے میں یقیناً ناکام ہو گیا ہوں--اس لیے کہ ان دیواروں کی گول گولائیوں کو لفظوں میں بیان کرنے کے لیے میرے پاس یقیناً مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں--!

قلعے کی چاروں سمتوں میں نو گول نصف دائرہ دیواریں تھیں--یونہی مغرب اور شمال میں بھی تھا--صاف لگتا تھا کہ قلعہ نوے درجے کے زاویے پر گنیے میں تعمیر کیا گیا--دیواروں کی سب سے بڑی خوبی، سگھڑی اور نفاست تعمیر یہ تھی کہ ہر دیوار میں اینٹوں کے رکھ رکھاؤ سے ایک سے ایک مختلف ڈیزائن بڑی مہارت اور خوبصورت ترتیب سے لگائے گئے تھے--کسی ایک دیوار میں جو کنگریاں، اینٹوں کے ہنسی جھروکے، گرانک ترتیبیں، گرانک قسم کے مربع، مستطیل اور تکونے نقش تھے، وہ دوسری گولائی اور سپاٹ دیوار سے حیرت انگیز طور پر مختلف تھے--اس اعتبار سے چاروں جانب کی بیرونی فصیل کو کل ۸۰ گول اور سپاٹ معاون دیواریں ملا کر تعمیر کیا گیا تھا--ہر دیوار میں اینٹوں کی ترتیب سے نیا تعمیراتی دیوار کا نقشہ وجود میں آیا تھا اور دل چسپ اور اہم ترین بات یہ تھی کہ تمام کے تمام ایک دوسرے سے جداگانہ اور بناوٹ میں یگانہ روزگار تھے--جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قلعہ دراوڑ کے آرکیٹکٹ، تعمیر کرنے والے مستری اور اس قلعے کو اپنے خوابوں میں دیکھ کر تعبیر دینے والا یعنی مالک قلعہ خوش ذوقی اور حسن طبع میں ایک منفرد اور آرٹسٹک سوچ کا مالک تھا--گویا دیواریں سلف پرنٹ خشت نقش نگاری کا نمونہ تھیں--!

آپ اگر میری باتوں اور تنقیدی نظر، جس سے یہ سب نظر آ رہا تھا کو خود دیکھنے کے آرزومند ہیں تو قلعہ دراوڑ کی کسی بھی فصیل سے کوئی پچاس گز ہٹ کر کھڑے ہو جائیں، اور دیوار فصیل کو دیکھیں تو یہ طلسماتی انداز تعمیر بلا غور و فکر آپ کی نظروں میں آ جائے گا--اگر اس بات کی تصدیق چاہتے ہیں کہ دیوار فصیل کی تمام تر خوبصورتیوں کو نگہ عشق میں لانا چاہیں تو جس دیوار کی چاہے تصویر بنا لیں؛ جب آپ تصویر کو ایک نظر میں دیکھیں گے تو یقیناً فصیل قلعہ دراوڑ کے حسن و جمال تعمیر کے خود بخود عاشق ہو جائیں گے--!

یہ ایسی دیواریں، فصیلوں کی ہیں کہ ان سب میں اینٹوں کی چنائی سے جو خوبصورتی کی دیدہ زیب قیامت ڈھائی گئی ہے، وہ یقیناً نایاب ترین ہے--!

میں نے اپنے پاکستان میں بے شمار قلعوں کی بیرونی فصیلیں دیکھی ہیں--سب قلعوں کی بیرونی فصیل کی دیواروں میں اینٹوں کی چنائی سے ایسا ''حسنِ تغزل خشت نگاری'' کہیں نہیں ملے گا اور نہ ہی نظر آیا ہے؛ جو دراوڑ کی

طرح سلف پرنٹ اینٹ کاری کا جیتا جاگتا شاہکار ہو--!

یہ قلعہ دراوڑ اپنی بیرونی فصیلوں میں بے مثال اور نادر و نایاب ہے--

قلعہ دراوڑ کی بیرونی فصیل کو ہی اگر "قومی ورثہ" قرار دے کر احترام کے ساتھ محفوظ کرلیا جائے تو سمجھیے کہ ہمارے آثار قدیمہ والوں نے عظیم الشان، کارنمایاں انجام دے دیا-- میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ایسے آثار قدیمہ ہیں جو ملک کو اربوں ڈالر سالانہ دلوا سکتے ہیں--!!!

مگر لگتا ہے کہ نہ کوئی ایسا سوچ رہا ہے اور نہ ہی محفوظ کر رہا ہے-- میں دیکھ رہا تھا کہ قلعہ دراوڑ کی یہ خوبصورت، نقشین خشت دیواریں کچھ زمانے کی دست برد سے، کچھ اوپر قلعے میں بارش کے پانی کا نکاس نہ ہونے سے اور کچھ چاروں طرف کے مقامی لوگوں کی نظرِ عنایت سے زمین بوس ہو جائیں گی--

اگر یہ زمین بوس ہو گئیں تو قلعے کی اس چار دیواری کے اندر جو مٹی کی بھرائی کر کے اوپر اور اندر قلعے کا میدان بنا ہوا ہے! سب کا سب ٹوٹ ٹوٹ کر، بہہ بہہ کر اور کچھ خود بخود کھسک کھسک کر ملیامیٹ ہو جائے گا-- اس سے پہلے کہ یہ قلعہ مٹی میں مٹی ہو کر نیست و نابود ہو جائے، اس کو سنبھال لینا چاہیے اور سنبھالنے کا سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ مقامی لوگوں کی رسائی اس کی فصیل کی دیواروں تک قطعی اور سختی کے ساتھ ناممکن بنادی جائے--!

میں کہتا ہوں، اے پاکستان کے آثار قدیمہ کا تحفظ کرنے والو، یہ سب جلدی کرلو-- پھر جب سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا--!

ابھی میں فصیلِ قلعہ دراوڑ کی بربادی پر دل ہی دل میں آہ و زاری کر رہا تھا کہ پھر ایک ٹیلی ویژن چینل "کیپیٹل ٹی وی" کے نمائندے اور کیمرہ مین نے گھیر لیا--

میں نے موقع کو غنیمت جانا، جو صدمہ اور دکھ مجھے بے حال کر رہا تھا، سارے کا سارا اس کے کیمرے میں ریکارڈ کرا کے اپنے دل پر گذرنے والے صدمے اور بوجھ کو ہلکا کیا--!

❦

باب ۲۴

فصیل کی اینٹوں سے گھر بنتے ہیں
ہم لوگ قلعہ دراوڑ کو، گرا کے دم لیں گے--!

صدیوں کی تاریخ کے ابواب بوسیدگی میں اَٹ کر اپنی ساخت اور ہیئت، ویرانی میں بدل چکے تھے--!

قلعہ دراوڑ کی پچھلی مغربی دیواریں ایسے نیچے گری نظر آتی تھیں کہ جیسے بھُر بھُرے پہاڑوں میں زلزلے آنے اور بجلی گرنے کے بعد تباہ کن لینڈ سلائیڈنگ کے بعد کا ہولناک منظر دکھائی دیتا ہے۔

بعض فصیل کی دیواروں کے تو خستی نام و نشان بھی مٹ چکے تھے، صرف مٹی کی فصیلیں استادہ تھیں-- نیچے صرف ٹوٹی اینٹوں کے ملبے کے ڈھیر تھے۔ ان ٹوٹی اینٹوں میں ثابت اینٹوں کے دریافت کرنے والے کے لیے گر انعام و اکرام کا اعلان کر دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ انعام کی کل رقم بچ کر داخل دفتر خزانہ ہو جائے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مٹی، بھربھری ریتلی زمین پر فصیل کی اینٹیں گریں، یقیناً کچھ ٹوٹ گئیں، کچھ گرنے سے ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں گی، مگر کچھ سالم بھی بچی ہوں-- آخر یہاں سالم اینٹ کیوں نظر نہیں آتی، فقط ٹوٹی کیوں نظر آتی ہیں--؟

سب لوگ بکھرے گئے تھے مگر نگاہ بھر کے دیکھو تو دور دور تصویریں بنوانے میں مصروف تھے-- ہر کوئی

چاہتا تھا کہ اس کی کوئی ایسی خوبصورت تصویر بن جائے کہ جس کے پس منظر میں قلعہ دراوڑ کے فصیلی آثار قدیمہ بھرپور انداز میں نظر آئیں اور وہ خود اتنا جاذب نظر، دلکش اور پرکشش پوز میں نظر آئے کہ اس تصویر کو دیکھنے والا تعریفوں کے پل باندھے کہ اس تعریف کے نشے میں رات کو نیند نہ آئے--!

سچی بات یہ ہے کہ ایسی معصومانہ خواہشات کم وبیش ہر انسان میں پائی جاتی ہیں۔ وجہ اس کی عمومی طور پر یہ ہے کہ خود پسندی اور نرگسیت جوش جو مار رہی ہوتی ہے--!

وجدان، عمر فرحان اور حیدر اپنی عکس بندی کی بجائے اردگرد کے اجڑے ماحول اور جو کچھ دستیاب تھا، اس کو بڑی انہماک سے فلمارہے تھے-- جب کہ اکثریت قلعے کی اجڑی فصیلوں کے ساتھ چپک چپک کر تصویریں بنوانے میں مگن تھی-- ان کا معصومانہ خیال یہ تھا کہ دیوار کے ساتھ چپک کر جو تصویر بنائی جاتی ہے، وہ آثار قدیمہ کو اپنے میں آسانی سے سمو لیتی ہے-- حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا-- جو تصویریں دور ہٹ کر بنائی جاتی ہیں، صرف وہی ماحول اور منظر اور پس منظر کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس اصول کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں-- بلکہ صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو باقاعدہ فوٹوگرافی کا ذوق وشوق رکھتے ہیں۔ آج کل کیمرہ بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ موبائل کیمرے سے ہی تصویریں بنا کر اپنے شوق اور خواہش کی تسکین کر لیتے ہیں-- اس میں شک نہیں کہ آج کے دور میں ایسے ایسے جدید موبائل فون کیمراز آ گئے ہیں، کہ یقیناً کیمرے سے عمدہ تصویر بنا لینے پر قادر ہیں اور ایسی حسین تصویریں موبائل سے بنی ملتی ہیں کہ بندہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے-- مگر ان کی ریزولیشن اس قدر کم ہوتی ہے کہ اس مقابلے میں بُرے سے بُرا ڈیجیٹل کیمرہ بھی جیت جاتا ہے-- میں سمجھتا ہوں کہ کیمرہ تصویر نہیں بناتا بلکہ اس کیمرے کے پیچھے جو آنکھ، تجربہ اور دماغ کارفرما ہوتا ہے، وہ تصویر بناتا ہے-- آج کل لوگوں کے پاس شو آف کے لیے پیسہ بہت ہے-- اعلیٰ ترین کیمرہ تو پکڑے ہوتے ہیں مگر تصویر کھینچنے کے بنیادی قواعد سے سراسر محروم ہوتے ہیں-- سو نتیجہ یہ ہے کہ ان قیمتی کیمروں کے مقابلے پر موبائل کی تصویریں اچھی آ جاتی ہیں--!

یہاں بھی بلکہ ہر جگہ ہم نے دیکھا کہ فوٹوگرافی میں موبائل کیمرہ پیش پیش ہوتا ہے مگر اس سے کھینچی تصویریں بھی ناقابل برداشت ہوتی ہیں، کیونکہ اس کے پیچھے جو آنکھ اور سوچ ہوتی ہے، وہ اس عکس سے مبرا ہوتی ہے--!

قلعے کی مغربی سمت کی دیوار سب سے خستہ حالت میں تھی۔ دیکھ کر دکھ ہوا-- مجھے حسب معمول وجہ دریافت کرنے کی جستجو ہوئی-- اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک ملبے کی ڈھیری پر بیٹھا نوجوان مل گیا-- وہ بیٹھا ایک بجول

کے گھنے سائے میں کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔۔سلام علیک خوامخواہ ہوئی۔۔پوچھا کیا کرتے ہو۔۔بولا بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کا طالب علم ہوں۔۔گھر میں بچوں کا شور ہوتا ہے تو یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہوں تا کہ سکون سے پڑھ لکھ سکوں۔تمہارا گھر کہاں ہے۔۔اس نے دور کسی نظر نہ آنے والی بستی کی طرف اشارہ کر کے بتایا، وہاں ہے۔۔گھر میں بچے کیوں زیادہ ہیں۔۔کہنے لگا جوائنٹ فیملی جو ہے، ہر کسی چاچے، تائے کے پانچ سات بلونگڑے ہیں۔۔گذارہ کیسے ہوتا ہے۔۔سب شہروں میں کام کرتے ہیں، دو، چار، چھ مہینے بعد آتے ہیں اور اپنی اپنی بیویوں کے خالی پیٹ بھر کے پھر مہینوں کے لیے کام پر چلے جاتے ہیں۔۔اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

تم کام کیوں نہیں کرتے اور اپنی فیملی کی روایت کے خلاف پڑھتے جا رہے ہو۔۔سر، اس لیے کہ میں پروفیسر بننا چاہتا ہوں، میرے گھرانے میں میرے پڑھنے پر سخت فساد ہے۔۔ہر کوئی نکما ہونے کے طعنے دیتا ہے۔۔بس ایک دو سال کی بات رہ گئی ہے، ملتان میں، میں ٹیوشن پڑھا کر گزارہ کرتا ہوں، گھر سے ایک پیسہ حرام ہے جو مانگتا ہوں۔ان کے پاس پیسہ ہے بھی نہیں کہ میرے اس فضول شوق پر لگائیں۔۔میرے گھرانے میں سولہ بچوں میں سے تین بچے ایسے ہیں جو پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں، میں ذرا اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں، تو ان کو خود پڑھاؤں گا۔۔دو بچے چوری چکاری کا شوق رکھتے ہیں، ماؤں کے لاڈلے ہیں، وہ تو گئے سر۔۔اس نے فکرمندی سے کہا۔۔ایک دس سال کی بھتیجی ایسی ہے جس کو اس عمر میں بننے سنورنے سے ہی فرصت نہیں ہے، وہ لازماً بڑی ہو کر ٹی وی اینکر بنے گی۔۔اس عمر میں ایسے خبریں پڑھتی ہے کہ لگتا ہے پیدائشی نیوز ریڈر ہے۔۔ایک بچہ پولیو کا مریض ہے، حالانکہ اس کو پولیو کے پورے قطرے پلوائے تھے۔۔اس نے حیرت سے کہا۔۔میرے ابا جی کو گندی گندی گالیاں دینے سے کوئی نہیں روک سکا۔۔نماز پڑھنے مسجد بھی جائیں تو گالی دے کر جاتے ہیں اور واپس آتے ہی گالیاں دینے لگتے ہیں۔۔!

"۔۔تم مجھے اپنے گھرانے کی اتنی پرسنل باتیں بلا پوچھے کیوں بتائے چلے جا رہے ہو۔۔؟"

"۔۔سچ کہوں سر۔۔؟"

"۔۔ہاں کہو۔۔"

"۔۔اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ پھر زندگی میں میری آپ کی دوبارہ ملاقات نہیں ہونی ہے، انجانی غیر آدمی سے، جو ہو بھی سوجھ بوجھ رکھنے والا، اس سے اپنے دکھ کھل کر شیئر کر لو، تو نقصان بھی کوئی نہیں ہوتا اور دل کے زخموں کا گند بھی چھڑ جاتا ہے، اس لیے سب کچھ آپ سے صاف صاف کہہ دیا ہے۔۔"

"--اچھا، چلو--یہ تو اچھا ہی ہو گیا--اب یہ بتاؤ کہ تمہیں کچھ پتہ ہے کہ قلعے کی مغربی سمت جو ہمارے سامنے ہے اس کی فلک بوس اور مضبوط دیواریں کیسے گر گئیں--کیا قلعہ بنانے والوں نے ان پچھلی دیواروں کی تعمیر میں دورانِ تعمیر اینٹوں کو جوڑنے والا مصالحہ ٹھیکے داروں کی طرح ناقص لگایا تھا، یا پھر اُن اطراف کی دیواروں میں کمیشن کھا گئے تھے یا کوئی اور بے ایمانی کی تھی--"میں نے از راہ تفنن طبع پوچھا۔

نوجوان بہت زور سے ہنسا--سر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا--بلکہ وہ ہوا اور ہو رہا ہے کہ جو آپ سوچ بھی نہیں سکتے--میرے چاچے، مامے، تائے سب راج مستری ہیں--جو انہوں نے ان دیواروں کے ساتھ راتوں میں کیا ہے، وہی کام اردگرد کے گاؤں والوں نے بھی اس قلعے کی فصیلوں کے ساتھ کیا ہے کہ جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا--"!

یہ سن کر میرے اندر تجسس کی لہریں طوفانی صورت اختیار کر گئیں--

"--میرے پیارے نوجوان، مجھے صاف صاف بتا دو--دیکھو میں تو انجان، غیر آدمی ہوں اور اب ہماری ملاقات تو زندگی بھر ہونا نہیں ہے، ایسے میں بتا دینے میں ہرج ہی کیا ہے--؟"

پھر اس نوجوان نے قلعہ دراوڑ کی پچھلی دیواروں، فصیلوں کے ساتھ زنا بالجبر کی جو داستان سنائی، واقعی وہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"--قلعہ کی بیرونی فصیل کی یہ سو سوفٹ کی اونچی دیواریں، چھوٹی اینٹوں سے بنی ہیں--جو عام اینٹ کے نصف سے بھی کم ہیں--میرے والد کی جوانی تک تقریباً سارے قلعے کی فصیل سلامت تھی۔ یہ انھوں نے بتایا--بربادی کا دور اس کے بعد شروع ہوا اور اب یہ اس وقت ہی ختم ہو گا کہ جب پورے قلعے کی چار دیواری فصیل زمین بوس ہو جائے گی--اب اس کے زمین بوس ہونے میں کچھ زیادہ وقت نہیں رہ گیا--قلعے کی فرنٹ کی دیوار اور جنوبی دیوار اس لیے سلامت رہ گئی ہے کہ ادھر سے واردات کرتے ہوئے پکڑے جانے کا ڈر ہے مگر مغربی اور شمالی دیوار واردات کے لیے محفوظ علاقہ ہے--!"

قصہ یہ ہے کہ جب یہاں نوابوں کی حکومت ختم ہوئی اور انھوں نے قلعہ دراوڑ میں اپنی باقاعدہ رہائش تقریباً ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ ختم کر کے شہروں کا رخ کیا تو بربادی کا دور بڑے ٹھاٹھ اور اطمینان سے شروع ہوا۔ اردگرد کے گاؤں والوں کو جب بھی اپنے مکان بنانے ہوتے، ان میں کوئی نئی تعمیر کرنی ہوتی تو وہ قلعے کی فصیل کی اینٹوں پر دھاوا بول دیتے--

مثلاً کسی کے گھر میں باورچی خانہ، بیٹھک یا نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے کمرہ بنانا ہوتا تو اس گھر کے مرد کسی اندھیری اور خاموش رات میں کسّی، چھینی، ہتھوڑوں سے مسلح ہو کر کسی دیوار کے نیچے آ جاتے کہ جس کا انتخاب انھوں نے دن کی روشنی میں کیا ہوتا تھا -- ایک آدمی قلعے کی فصیل سے ذرا دور دور رہ کر یہ اندازہ کرتا کہ پہرے دار جاگتے ہیں یا سو گئے ہیں یا کسی حجرے میں بیٹھ کر تاش کھیلتے ہیں یا کسی عورت کے ساتھ مصروف ہیں -- حالات عموماً ہی سازگار ہوا کرتے تھے اور اگر اینٹوں کی چوری ہوتے کبھی پکڑی جاتی تو پہرے دار سو پچاس کی رشوت، دو سگریٹ اور گھڑی، چپل، پرنا ہتھیا کر یہ کام کرنے کی اجازت دے دیتا تھا -- عقل مند لوگ وہ تھے جو رات کے پہرے داروں کو پہلے ہی سارا معاملہ بتا کر ان کی مرضی کے مطابق نواز دیتے تھے -- پھر تو وارے کے نیارے ہو جاتے تھے، جتنی مرضی بیل گاڑیاں زیر فصیل لے آؤ اور جتنی مرضی اینٹیں لے جاؤ -- تب تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا تھا اور ہوتا ہے -- اب ذرا سختی ہے کہ جب سے فوج نے اِدھر ڈیرے لگائے ہیں۔

طریقہ واردات کچھ ایسے ہوتا تھا کہ رات میں اینٹوں کے چور، دن میں منتخب کی ہوئی دیوار کے زیر سایہ آتے -- ان میں سیانا چور اینٹوں کی دیوار کو جگہ جگہ سے بجا بجا کر دیکھتا -- جن اینٹوں کو بجانے سے ٹن ٹن کی آواز آتی، اس کو وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے -- اس پختہ آواز کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اینٹوں کا درمیانی مصالحہ اب بھی جاندار ہے اور نہیں ٹوٹے گا -- ہاں، جن اینٹوں کو کھڑکانے اور بجانے سے ڈم ڈم کی آواز آتی تو سمجھ جاتے کہ یہی دیوار کا حصہ گوہر مقصود ہے -- صاف پتہ چل جاتا کہ اینٹوں کا درمیانی جوڑنے والا مصالحہ اپنا دم خم چھوڑ چکا ہے۔ اس کے علاوہ اینٹوں کی دیوار کے پیچھے جو پختہ مٹی بھرائی اور دیوار کے ٹھہراؤ کے لیے بھری ہوئی ہے، کسی وجہ سے یا تو اندر ہی اندر، وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ بیٹھ گئی ہے اور اینٹوں کی دیوار سے اپنا ناطہ چھوڑ چکی ہے، جس سے دیوار میں کمزوری اور کھوکھلا پن پیدا ہو چکا ہے -- یہ حصہ دیوار، اینٹیں اکھاڑنے کے لیے بہترین قرار پاتا تھا۔

اس دیوار کی چوڑائی اور آثار تقریباً تین فٹ ہیں، پیچھے مٹی کی بھرائی اور اوپر قلعے میں لگے درختوں پودوں کی جڑوں کے پھیلاؤ کی پکڑ اور مضبوطی ہے۔

سب اینٹ چوروں کو فقط ایک ہی خوف ہوتا تھا کہ اینٹیں اکھاڑتے ہوئے، کہیں اوپر کی فصیل کی پوری دیوار ہی اینٹ چوروں کے سر پر نہ آن گرے۔ مگر اینٹ چوروں نے اس کا بھی حل شریف نکال لیا تھا۔

وہ دیوار میں چھید نہیں کرتے تھے بلکہ پہلی چار سے پانچ تہیں کھینچ تان کر اکھاڑ نکالتے باقی پچھلی تہیں چھوڑ دیتے -- اس سے دو فائدے ہوتے -- اول یہ فائدہ ہوتا کہ ارد گرد کی ایک دوسرے میں پھنسی اینٹوں کی بڑی

تعداد خود بخود باہر نکلتی چلی آتی، بعض مرتبہ اتنی اینٹیں باہر نکل آتیں کہ ریڑھے گاڑیاں کم پڑ جاتیں -- اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ اوپر کی اٹھی دیوار چند، دنوں، ہفتوں یا مہینوں میں اپنے بوجھ سے خود بخود کمزور پڑتی چلی جاتی اور کسی نیک ساعت میں کہ جب اس پر بُرے وقت کے ستارے گردش کرتے اور اینٹ چور خاندانوں پر اچھا وقت ہوتا، دیوار کھسک کھسک کر گرنا شروع ہو جاتی -- اور یوں ان ثابت اینٹوں کو اٹھانے کی زحمت رہ جاتی -- پھر کئی گھرانوں کے گھروں کی چھتیں، کمرے، فرش اور بیرونی دیواریں اللہ کی رحمت سے بن جاتیں --!

میں یہ حیران کن انکشافات بڑی توجہ سے سنتا جاتا تھا -- کبھی منہ پھاڑے اس انگریزی ادب میں ایم اے کرنے والے نوجوان کا منہ دیکھتا اور کبھی قلعے کی مغربی فصیل کی کھوکھلی، گری ہوئی ہزار سال پرانی دیواروں کو دیکھتا -- پھر کیکر اور ببول کے چھدرے جنگلوں کے پیچھے بنے ان گھروں کو دیکھنے کی کوشش کرتا جو جال جنڈ کی کانٹے دار جھاڑیوں کی اُوٹ میں کہیں پوشیدہ تھے --!

جناب، اہل علاقہ گزشتہ پچاس سال سے قلعے کی دیواریں گرا گرا کر اپنے مکان پکے بنا رہے ہیں -- مگر ان پچاس سالوں میں صرف چند دیواریں ہی زخمی ہوئی ہیں اور کچھ گری ہیں -- زیادہ تر سلامت ہیں -- بھیڑیے آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کا بیمار ساتھی کب مرتا ہے اور وہ اس کی تکا بوٹی کر کے اپنے بھوکے پیٹ بھرتے ہیں -- یہ سر انگریزی ادب کی مشہور ضرب المثل ہے --!

میں دیکھ رہا تھا، ٹوٹی اینٹوں کا ملبہ جو فصیلوں کے نیچے ریت اور مٹی میں ملا پڑا تھا -- گری دیواریں کہ جن کے پیچھے سے مٹی کی دیواریں پوری فصیل کے برابر ابھی تک سلامت کھڑی تھیں -- بس، مٹی جھڑنے اور بارش کے پانی بہنے سے ان پر لمبائی کے رخ عجیب عجیب سانپ نقشے سے بن گئے تھے۔ مگر مٹی تھی کہ اس ستم کے باوجود بھی، ابھی تک رسم وفا نبھا رہی تھی -- کہ حفاظتی پکی دیواریں گر جانے کے باوجود کچی مٹی اپنی ہزار سالہ وفاؤں کو ایمانداری سے سنبھالا دے رہی تھی --!

مجھے لگا کہ جب تک مٹی اپنی وفا نبھائے گی قلعہ دراوڑ کھڑا رہے گا --!

جس دن بھی مٹی تھک گئی، اپنی صدیوں پرانی محبت کی لوچ کھو بیٹھی -- ہاتھ میں ڈالا ہاتھ، تھکن یا بڑھاپے میں چھوڑ بیٹھی، بس اسی دن دراوڑ کے کھڑے برج ایک ایک کر کے گرنے لگیں گے --!

پھر تاریخ میں لکھا جائے گا کہ جس جگہ چولستان میں کچی مٹی کے ڈھیر فلک بوس کھڑے ہیں، وہاں کبھی ایک قلعہ خشت پختہ سے بنا ہوا کرتا تھا، جو زمانے کے ہاتھوں اپنی موت آپ مر گیا، گر گیا -- بڑے بڑے نام ور

محکموں نے اسے بچانے کی بڑی کوشش کی، مگر وہ اپنی عمر پوری کر کے موت سے ہمکنار ہو گیا-- پھر آخر میں اس تاریخی تختی پر یہ بھی لکھا ہو گا کہ دنیا میں ہر شے کو فنا ہے، سوائے نام خدا کے، جو برحق اور حی یا قیوم ہے--!

مگر یہ نہ لکھا ہو گا، اس لوح تاریخی پر کہ اپنی پیدائش کے پہلے ہزار گیارہ سو سال وہ ٹھیک ٹھاک، ہر سمت سے سلامت تھا-- اس دوران بے شمار جنگیں اور حملے اس قلعے پر ہوئے-- پر اس کا کچھ بھی نہ بگڑا اور اگر کچھ بگڑا تو فوراً سنوار دیا گیا-- مگر کہتے ہیں کہ جب سائنسی تاریخ اپنے عروج پر تھی، بس ان ہی آخری ساٹھ ستر سالوں میں انسانوں میں ہوس عروج پر تھی-- مذہبی رجحانات کا بول بالا تھا-- نیکی اور پارسائی کے دعووں پر قتل عام ہو جاتا تھا-- تب رشوت اور جھوٹ کے بازار گرم تھے: رات میں ڈاکہ زنی ہوتی تھی اور دن میں سچائی کی قسمیں کھائی جاتی تھیں-- ان ہی ستر سالوں میں سب کچھ لٹ گیا-- کچھ بھی سلامت نہ رہا-- اگر ایسے میں دین مذہب کی دیوار کے پیچھے چھپنے والوں نے اسلاف کو برباد کیا تو کیا برا کیا--!

بس وہی اس پیلو کے درخت کی زندگی کا بھی آخری دن ہو گا کہ جب کچھ لوگ اسے بھی کاٹ کر چولہے میں جلا دیں گے اور اس پر چائے بنا کر پی لی جائے گی--!

ختم

باب ۲۵

قلعے میں سلنڈر پہ جگہ جگہ لکھا ہے
"سب کافر ہیں، ہمارے سوا" --!!!

وقت رفتہ رفتہ گزر رہا ہے مگر لگتا نہیں ہے کہ بہت تیزی سے گزر رہا ہے --!

فاصلے تیزی سے بڑھتے جاتے ہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے سب وہیں ٹھہرا ہوا ہے -- کچھ بھی ٹھہرا ہوا نہیں ہے، پر بہت تیز چل رہا ہے --!

زمانے بدلتے جاتے ہیں مگر فطرت اور جبلت ہے کہ اسی پہلے دن والی جگہ ساکت کھڑی ہے، اس کا اپنے اصل پر اوّل وآخر قائم رہنا ہی قدرت کی طاقت کی دلیل ہے --!

میں نے فطرت کے ایک مظاہرے کو ایک کانٹے دار جھاڑی کی اوٹ میں پہلی بار بہت قریب سے دیکھا؛ اس سے پہلے میں نے فقط سنا ہی تھا --!

پہلی نظر پڑی تو دیکھا وہ ریت پر ایسے تڑپ رہی تھی، جیسے اپنی زندگی کی آخری سانس بڑی مشکل سے لے رہی ہو۔ اس کا پیٹ مشک کی طرح پھولا ہوا تھا -- اس نے ایک لمحہ رک کر مجھے محسوس کیا اور پھر ریت کے بستر پر مرغ بسمل کی طرح اُلٹ پلٹ کر تڑپنے لگی --!

پہلی نظر میں مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ نر ہے یا مادہ -- مگر جب اس کے پھولے پیٹ میں ایک ننھا سا سوراخ ظاہر ہوا -- پھر ایک ننھے معصوم بچے نے باہر کی دنیا میں اپنا سر نکالا، پھر مزید جدوجہد کر کے اپنا جسم بھی باہر نکال لیا اور ریت پر آن پڑا -- اسی پیٹ کے پھاڑے سوراخ سے دوسرے، پھر تیسرے، پھر چوتھے، بچے نے سر نکالا اور وہ سب بچے ریت پر آ گرے -- ماں تڑپتی رہی، سسکتی رہی -- اندر کے بچوں نے ماں کا پیٹ کاٹ کر پورا چاک کر ڈالا اور ٹہلتے ہوئے بچھوؤں کی طرح باہر آتے چلے گئے۔ وہ تعداد میں درجن بھر سے زیادہ تھے -- جب ان کے جسموں کو ہوا لگتی تو چلنے کے لائق ہو جاتے -- بچھونی لمحہ بہ لمحہ نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے لمبے دُم دار ڈنگ سے سیاہ مادہ خود بخود خارج ہو رہا تھا -- اس نے نقاہت کے عالم میں اپنے پاس پڑے نوزائدہ بچے کو نگل لیا -- وہ منہ سے حلق میں گیا اور حلق سے پیٹ میں پہنچا اور پھٹے پیٹ کے سوراخ سے زندہ سلامت ٹہلتا ہوا پھر باہر نکل آیا -- اور ریت میں چھپ گیا -- بچھونی نے آخری سانس لیا اور مر گئی --!

یہ بڑا عبرت ناک منظر تھا -- میں سوچ رہا تھا کہ بچھو اپنی ماں کو بھی نہیں بخشتا اور وہ مرتے مرتے چندرہ بچھوؤں کو اور جنم دے گئی --!

میں نے ایک لمبی سانس لی اور پلٹ کر دیکھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ حیدر اور عمر فرحان قلعے کی فصیل کے نیچے پڑے ملبے کے ڈھیر کے پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں -- میں جہاں تھا، دم بخود کھڑا رہ گیا۔

وہ دونوں ٹوٹی فصیل کو الانگتے پھلانگتے نصف فصیل کی اونچائی چڑھ گئے -- پھر اور اوپر چڑھے اور بائیں طرف کی فصیل کی دیوار کے آثار پر دلیری اور ہمت کے ساتھ چلنے لگے -- دور سے ایسے لگ رہا تھا کہ دو بڑے رنگین لباس گرگٹ فصیل قلعہ سے چپکے چپکے کھسک کر عین درمیان میں آ رہے ہیں -- ان سے اوپر فصیل قلعہ کی دیوار زمین بوس ہو چکی تھی، فقط مٹی کی آسیب زدہ سی دیوار ان کی کمر اور پشت سے اوپر اپنی آخری حد تک جا کر آسمان کی بلندیوں میں کہیں گم ہو جاتی تھی --!

وہ چلتے ہوئے دلیری سے آئے اور کچی فصیل کے آثار پر کھڑے ہو کر فاتحانہ نعرے لگانے لگے --

رضوان ملک بے ساختہ چلایا --

"-- اوئے اُو پاگلو -- واپس آ جاؤ، مٹی کا تُودہ تم پر آن پڑا تو یہاں فسٹ ایڈ کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے --"

پٹھان ارشاد عالم بے ساختہ بولا"--اللہ خیر کرے--حیدر دھیان سے--مٹی کی دیواروں میں خطرناک جانور بھی ہوتے ہیں--جلدی واپس آ جاؤ--"

وہ کسی کی نہیں سن رہے تھے، بس اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔

میں اور وجدان دھڑا دھڑ اس منظر اور ہمت کی تصویریں بنا رہے تھے--!

ہم سب کی چیخ و پکار نے انھیں کچھ خوف اور غلطی کا احساس دلایا--وہ احتیاط سے نیچے اترنے لگے اور خیریت سے نیچے اتر آئے تو سب کی جان میں جان آئی--!

"--سر، آپ کے بچوں کے خیریت سے نیچے آ جانے کی خوشی میں ایک تصویر ہو جائے--"

ارشاد عالم خان نے بڑی محبت سے درخواست کی۔

"--لو، بنا لو تصویر--" میں پوز مار کر کھڑا ہو گیا۔

"--نہیں، سر، یہاں نہیں--اس ملبے کے ٹیلے پر، جو فصیل قلعہ کے نیچے ڈھیر پڑا ہے، اس پر کھڑے ہوں آپ--"

عالم خان نے بڑی محبت سے میرا کیمرہ مجھ سے لے لیا اور مجھے اونچے ٹیلے پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ان کی محبت دیکھ کر میں ان کی بتائی اونچی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا--

"--نہیں سر، ایسے نہیں بنانی--آپ ذرا شاہد آفریدی کا پوز مار کر کھڑے ہوں، جیسے وہ چھکا مارنے یا آؤٹ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ فضا میں کھڑے کر کے، انگشت شہادت سیدھی کھڑی کر کے اور دونوں پاؤں فاتحانہ انداز میں کھول کر کھڑا ہوتا ہے--" رضوان ملک نے پوری پوری ہدایات سے آگاہ کیا۔

"--اوہ، اچھا--اس طرح کھڑا ہو جاتا ہوں میں--"

وہ تصویریں بنا رہے تھے--بعد میں جب میں نے اپنی وہ تصویر دیکھی تو یوں لگا کہ میں ہی وہ خوش نصیب ہوں کہ جس نے قلعہ دراوڑ فتح کرنے کے بعد غرور فتح کے نشے میں سرشار ہو کر پہلی اور آخری تصویر بنوائی تھی--

قلعہ دراوڑ کی مغربی سمت کی فصیل نے کم از کم مجھے تو بہت دل برداشتہ کیا تھا--مغربی فصیل تمام ہوئی اور ہم زاویہ قائمہ عبور کر کے عین شمالی فصیل کے نیچے آ گئے--شمالی فصیل کے عین نیچے دو بوسیدہ مکان، جن کی اوپر کی منزلیں زمیں بوس ہو چکی تھیں، ایک دوسرے کے مقابل موجود تھے--ان کے اندر جھانکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا--بس، دو ہی حصے، ان عمارتوں کے کسی قدر قابل شناخت تھے--ایک بوسیدہ ڈوم چھتیں، جن میں ملبہ ہی

ملبہ بھرا تھا اور دوسری بیرونی دیواریں بڑی تختی کے برابر دیئے جلانے کے سپاٹ جھروکے ۔۔اس سب کو دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ دونوں آمنے سامنے بنی تباہ حال عمارتیں ، اصل میں کیا تھیں ۔۔؟ مگر اللہ بھلا کرے ان مذہبی جنونیوں کا کہ جن کی وجہ سے ہم سب کو یہ معلوم ہو سکا کہ ان میں ایک مندر تھا ، اور دوسرا گردوارہ تھا ۔۔!

چراغ جلانے والے جھروکوں میں کسی ہمدرد نے سیاہ سلنڈر کے کلر پیرے سے بھونڈی لکھائی میں لکھا تھا۔

"۔۔مندر۔۔کفر گاہ ہے یہ۔۔"

دوسرے پر لکھا تھا۔

"۔۔کافر کا فرسکھ کا فر کا گردوارہ۔۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ انتہا پسند اپنے جذبات کے اظہار میں مندر اور گردوارے کی نشاندہی نہ کرتے تو ہمیں پتہ ہی نہ چلتا کہ یہ کون سی جگہ اور عمارات ہیں ۔۔! مجھے قرآن پاک میں لکھا ہوا ایک ارشاد باری تعالیٰ یاد آیا کہ تم ان کے جھوٹے خداؤں کو کچھ نہ کہو کہ جواب میں وہ تمہارے سچے رب کی شان میں گستاخیاں کرنے لگیں ۔۔!!!

قلعے کی شمالی فصیلیں اور ان کی نصف دائرے میں بنی دیواریں یہاں بہت اونچی محسوس ہوئیں ، وجہ یہ تھی کہ ان دیواروں کے نیچے ملبے کے ڈھیر نہیں تھے ۔۔یہ پورا زمینی حصہ سائے میں تھا ، کیونکہ سورج جنوب مغرب میں آگ برسا رہا تھا ۔۔قلعے کی دیوار سے کافی دور ہٹ کے تباہ حال بستیوں کے نشانات و آثار تھے مگر سب ملبے کا ڈھیر تھیں ۔۔لگتا تھا کہ زمانہ قدیم میں قلعے کے چاروں طرف ، حفاظتی دیوار کے اندر وہ رعایا بستی تھی جو قلعے کے نوابوں اور شاہوں سے کوئی نہ کوئی ریاستی امور میں تعلق رکھتی تھی ۔۔یہ تباہ حال بستیوں کی بستیاں باعث عبرت تھیں ۔۔کبھی یہاں رونقیں ہوا کرتی ہوں گی ۔۔۔پھر وقت اور زمانے کے بے رحم ہاتھ نے سب بساطیں لپیٹ کر رکھ دیں ۔۔قہقہے لگانے والے اور خوبصورت پانی بھرنے والی پنہاریں اپنی اپنی عمر پوری کر کے زمین میں ایسے دفن ہو گئیں کہ ہڈیوں کے نام و نشان بھی باقی نہ رہے ۔۔جیتے بستے مکان ویران اور ہولناک کھنڈروں میں بدل کر قیامت تک کے لیے ساکت و جامد ہو گئے ۔۔پھر ہم نئے لوگ آ گئے اور ان تباہ حال کھنڈرات کو عبرت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں ۔۔کوئی کوئی ہے جو اس افسانے کو دیکھ کر عبرت پکڑتا ہے اور زیادہ وہ ہیں جو منہ پھیر کر کہتے ہیں۔

"۔۔اونہہ ۔۔یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے ، سوائے ملبے اور حشرات الارض کے ۔۔آؤ ، کہیں آگے چلتے ہیں ۔۔بڑی ڈراؤنی جگہ ہے یہ ۔۔"!!!

شمالی دیوار اپنے اختتام کو پہنچی ۔۔اس کونے پر جنگلی خودرو جھاڑیوں اور کانٹے دار چھوٹے گنجان

درختوں نے زمین پر ہجوم کر لیا--- ہم ایک تنگ پگڈنڈی پر ایک قطار میں ہو لیے---!

سر اٹھا کے قلعے کے "ن" نما برج کی طرف دیکھا--- ایک سر بہ فلک مکان کا ڈھانچہ نظر آیا--- ایسا لگتا تھا کہ یہ مکان قلعے کے حکمرانوں نے ہوا کے رخ پر اونچا بنایا تھا--- اس مکان کے طلسمات جب ہی کھلیں گے، جب ہم خود اسے وہاں جا کر دیکھیں گے---!

ہمارے بائیں طرف کائی زدہ پانی کا بہت بڑا اور وسیع و عریض تالاب تھا۔

یہ وہ تالاب تھا کہ جس میں کبھی دریائے ہاکڑہ سے براہ راست پانی بھرا جایا کرتا تھا--- مگر، جب اللہ کی قدرت سے دریائے ہاکڑہ رواں دواں اور سانس لیتا زندہ بہا کرتا تھا---!

مگر آج اور اب، اس تالاب میں صدیوں سے کھڑا پانی بدبو چھوڑ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں اس پانی کی وجہ سے یہاں بہت تھیں۔ پگڈنڈی فصیلِ قلعہ سے بہت دور تھی۔ اور تالاب کے کنارے پر تھی کہ اس کچی، ریتلی پگڈنڈی پر آدمی فقط قطار میں ہی چل سکتا تھا--- مگر ایسے بھی عقل کے اندھے اور خود غرضی کے دھنی تھے کہ جو موٹر سائیکلوں پر سامنے سے پیدل چلنے والوں پر بے دردی سے چڑھے چلے آتے تھے، اور ہم پیدل قطار میں چلنے والے اُن سے بچنے کے لیے کانٹے دار جھاڑیوں میں اپنی جان بچانے کو ہٹ ہٹ کر پناہ مانگتے تھے مگر ان موٹر سائیکل سواروں پر جنون سوار تھا، ان کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اُن کی ان بہیمانہ حرکتوں سے کتنے لوگوں کو کانٹے چبھے اور زخمی ہوئے---!

دائیں طرف قلعے کی فصیل کے عین نیچے ایک چھت دار پرشکوہ حجرے اور محرابی برآمدے بنے دور سے نظر آتے تھے--- کسی نے بتایا کہ یہ اُن صحابہ کرام کی قبور مبارکہ ہیں کہ جو یہاں روزِ قیامت تک دائمی آرام فرماتے ہیں۔

میں نے وہیں سے کھڑے کھڑے ان ہستیوں کو سلام عرض کیا اور فاتحہ پڑھی کہ وہاں تک جانے میں بے پناہ کانٹے دار جھاڑیاں حائل تھیں اور کوئی پگڈنڈی ادھر جاتی نظر نہ آتی تھی۔

مشرق کی طرف بائیں سمت وہ عظیم مسجد نظر آتی تھی کہ جس کے پچھواڑے سے ہم قلعے کے حصاری دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے--- چونکہ ہم مسجد سے کافی اونچائی پر تھے اس لئے مسجد کا وسیع و عریض صحن بھی صاف دکھائی دے رہا تھا--- مسجد کے پچھواڑے ایک اور صحن تھا، اردگرد کچھ مکان بھی تھے اور کائی زدہ سبز تالاب ایک جانب سے مسجد کی دیوار سے جڑا صاف نظر آتا تھا---!

کانٹے دار جھاڑیوں اور ببول کے درختوں کی شاخوں میں سے تنگ راستہ، بل کھاتا ہوا نکلا اور ہم یکا یک

پیلو کے اسی یگانۂ روزگار درخت کے پہلو میں آ کر کھڑے ہو گئے--- مجھے لگا کہ قلعہ دراوڑ کا ہر راستہ، ہر پھر کر اسی پیلو کے درخت کے سائے میں ہی آ کر ٹھہرتا ہے---!

مجھے بے اختیار یاد آیا۔

چھتیس راگنیوں میں ایک راگنی پیلو کہلاتی ہے کہ جس کے سُر مدہوش کر دیتے ہیں اور مدہوشی کے سارے راستے یہیں آ کر نکلتے ہیں---!

ختم

باب ۲۶

کشمیر کے بچھڑے سیاح دوست چولستان میں ملتے ہیں

دراوڑ کی شاہی مسجد کی زیرِ سایہ

ارے، میری تو حیرت و حیرانگی سے چیخ نکل گئی--!

ایسے اتفاق کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا--!

بستی دراوڑ کی عظیم الشان ریپلیکا شاہی جامع مسجد کے سامنے بھٹی کریانہ اسٹور کے چھپڑ برآمدے کے سائے میں، میں اور وجدان ٹھنڈے پانی کی بوتل سے اپنی پیاس گھونٹ گھونٹ کر کے کھڑے بجھا رہے تھے--حیدر اور اس کا دوست عمر فرحان بندر والے کے پاس کھڑے، بندر کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بندر اس وقت یہ تماشا کر رہا تھا کہ بقول مداری، بندر کی زوجہ، بندر سے ناراض ہو کر بغیر بتائے اپنے میکے روٹھ کر چلی آئی تھی۔ بندر لاٹھی لے کر غصے کے عالم میں اپنے سسرال پہنچتا ہے، مگر بندریا کو کیلا کھاتا دیکھ کر (جو کسی تماشبین نے عین اسی وقت بندریا کو تھما دیا تھا) لٹھیا پھینک باقی بچے ہوئے کیلے پر جھپٹ پڑتا ہے--بندریا بھی سیانی ہوتی ہے، اپنے شوہر بندر کو کیلے پر جھپٹتا دیکھ کر پورا کیلا ایک نوالے میں نگل جاتی ہے--اب بندر بیچ بندریا کو پیٹنے لگتا ہے، بندر والا مداری، کھیل تماشہ چھوڑ کر دونوں گتھم گتھا بندروں کو چھڑانے میں لگ جاتا ہے--موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک لفنگا سا نکا دھڑنگ بچہ، بندر

والے کا تھیلا اٹھا کر بھاگ جاتا ہے--!

کھیل ابھی لائیو جاری تھا--حیدر اور فرحان مسجد کو اندر سے دیکھنے کے لیے اس کی سیڑھیاں چڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

میں نے ابھی پانی کا اگلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ میری نظر اُن پر پڑی--میں حیرت زدہ رہ گیا اور خوشی سے مسرور بھی ہوا--!

میرے سامنے، بالکل سامنے مبشر صادق کھڑے تھے--!

گلے ملتے ہی مبشر صادق بولے۔

"--آغا صاحب--میں کافی دیر سے آپ کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہوں--یہ میرے ساتھ میرے دوست عمران ارشد ہیں--میں ان کو کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو--یہ صاحب جو آگے آگے تیز تیز چلے جاتے ہیں اور ہیٹ پہنے ہوئے ہیں۔وہ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آغا صاحب ہی ہیں--یہ جینز، گلے میں صافہ، رنگین چیک دار شرٹ اور سر پر ہیٹ بتاتا ہے کہ یہی آغا صاحب ہیں--پھر آپ ہی نکلے--دل خوش ہو گیا ہے میرا--"

مبشر صادق نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبا کر کہا--

"--جب آپ کے ساتھ وجدان پر نظر پڑی تو سو فیصد یقین ہو گیا--"

پھر مبشر صادق اپنے دوست عمران ارشد کی طرف بڑے فخر اور خوشی سے پلٹے--

"--دیکھا میں نے ٹھیک کہا تھا ناں--؟"

"--اصل میں بات یہ ہے کہ آپ بھی سیاح ہیں اور ہم بھی سیاح ہیں--سیاحوں کی ملاقاتیں، سیاحتی مقامات پر ہی ہوا کرتی ہیں--آپ لوگ ضرور چولستان کار ریلی میں آئے ہوں گے--؟" میں نے پوچھا۔

"--جی ہاں--بالکل ایسا ہی ہے--" مبشر صادق بولے۔

"--وہ پراچہ صاحب اور عثمان شیخ صاحب بھی کیا اس وقت آپ کے ساتھ ہیں--؟"

"--نہیں، عثمان اس وقت کویت میں ہے اور اویس پراچہ بزنس ٹور پر کسی ملک میں ہیں--" مبشر صادق نے تفصیل سے بتایا۔

"--آپ نے اپنے دوست عمران ارشد کا تعارف نہیں کرایا--" میں نے مبشر صادق سے کہا۔

"--ہاں--آپ سے یوں اس صحرائے چولستان کے قلعہ دراوڑ کے سائے میں ملنے کی خوشی میں بالکل

یاد نہیں رہا--عمران ارشد، بنک آف پنجاب، ملتان کے یونٹ ہیڈ ہیں اور آغا صاحب پاکستان کے معروف لکھاری اور کشمیر میں اڑنگ کیل کے ہمارے دوست ہیں--"

مبشر صادق، اویس پراچہ اور عثمان شیخ سے ہماری ملاقات کشمیر کے گزشتہ برس کے سفر کے دوران کیل میں زرد پرندہ دیسی کیبن کار کے ٹرمینل پر ہوئی تھی--بس، پھر وہیں گاڑھی دوستی بھی ہوگئی--کل ہم کشمیر کے فردوس بریں پہاڑوں میں اور اڑنگ کیل کے حسین مرغزاروں میں پھرتے تھے اور آج قسمت کا انوکھا اتفاق دیکھئے کہ چولستان کی مٹی اڑاتے صحرا میں دھول سے اٹے ملاقات ہو جاتی ہے--میں نے مبشر صادق کو بتایا کہ کشمیر کا وہ سفرنامہ آج کل چھپنے کے ابتدائی مراحل میں ہے اور "کشمیر، فردوس بریں" کے نام سے شائع ہونے والا ہے--اس میں آپ تینوں دوستوں کا پورا پورا ذکر ہے۔

"--آیئے، کہیں بیٹھتے ہیں، یہاں صرف مرغ بھی ہی کھانے کی بہترین چیز ہے، وہی میں آپ کو کھلاتا ہوں--" میں نے چند لمحے اور ساتھ گزارنے اور یادیں تازہ کرنے کی خاطر پیش کش کی۔

"--نہیں--پھر کسی صحرا یا پہاڑ پر ملاقات ہوگی تو ضرور کھائیں گے، ابھی شام تک ہمیں ملتان پہنچنا ہے--آج ہم ابھی کار ریلی سے آ رہے ہیں--بس ابتدائی ریسیں لگ رہی تھیں، مگر جو کل کار ریلی کا دھماکہ خیز میلہ لگے گا، وہ آپ ضرور دیکھئے گا--اور ہاں آپ یہاں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں--" مبشر صادق نے اچنبھے سے پوچھا۔

"--کہیں--دور صحرائے چولستان میں رنگین تمبو لگائے پڑے ہیں--" میں نے ازراہ حسنِ گفتگو کہا۔

"--اگر آج یہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا تو ہم بھی آپ کے ساتھ صحرا میں اور تمبو میں رات گزارنے کا شرف حاصل کرتے، مگر یہاں سے سیدھے ملتان پہنچنا اشد ضروری ہے--"

اور پھر خدا حافظ ہوا--مبشر صادق سے اس صحرا میں ملاقات کر کے واقعی دل خوش ہوا--سیر و سیاحت کے شوقینوں کی ملاقات یقیناً سیاحتی مقامات پر ہی ہوا کرتی ہے۔ آج پورا پورا یقین آ گیا--!

صحرائے چولستان میں یہ مسجد جو میرے سامنے ہے، ایک تاریخی مسجد ہے۔ اس سے بڑی مسجد صحرائے چولستان میں اور کوئی نہیں ہے۔

موجودہ وسیع و عریض اور اونچی کرسی پر قائم یہ مسجد ۷۰ سال پہلے اس موجودہ شکل میں تعمیر کی گئی۔ یوں تو اس مقام پر ایک چھوٹی سی مسجد اس زمانے سے موجود تھی کہ جب صحابہ کرامؓ یہاں تشریف لائے تھے--مگر اس میں

جدید توسیع کہ جس میں یہ اس وقت نظر آتی ہے، امیر محمد بہاول خان ثالث (۱۸۲۵ء-۱۸۵۲ء) نے کی، جو نواب صادق کے تایا دادا تھے۔

یہ مسجد دس سال میں تکمیل کو پہنچی -- جو سرخ پتھر اس مسجد میں لگایا گیا، اسے جیسلمیر سے منگوایا گیا -- جیسل میر کا قدرتی سرخ پتھر پورے برصغیر میں نایاب اور اپنی سرخ مائل خوبصورتی میں بے مثال اور منفرد مانا جاتا ہے۔ سفید سنگ مرمر اس مسجد کے لیے، روایت ہے کہ مکران اور ایران کے ساحلی شہر چہار باغ کے درمیانی پہاڑوں سے کٹوا کر منگوایا گیا۔

دراوڑ بستی میں یہ مسجد، قلعہ دراوڑ کی حفاظتی دیوار کے مرکزی دروازے کے عین سامنے اور باہر واقع ہے -- اس کا توسیعی نقشہ امیر محمد بہاول خان اور بقول کے دہلی کی مغلیہ جامع مسجد کا ہو بہو لائے تھے -- ان کی خواہش تھی کہ وہ جامع مسجد دہلی کا ریپلیکا اپنے دراوڑ میں بنوائیں --!

طے یہ پایا کہ پرانی مسجد میں ہی توسیع کی جائے گی -- مگر مشکل یہ آن پڑی کہ حضرت محبت شاہ بخاریؒ کی قبر عین مسجد کے جدید ہال اور تینوں گنبدوں کے وسط میں آتی تھی۔ کہتے ہیں کہ نواب صاحب خود محبت شاہ بخاریؒ کی قبر پر آئے، فاتحہ پڑھی اور شاہ صاحب کی قبر کے سرہانے بیٹھ گئے اور درخواست کی کہ جناب میں اس جگہ مسجد بنانا چاہتا ہوں، آپ یہاں موجود ہیں، دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ مسجد کے لیے آپ جگہ عنایت فرما دیں تو مسجد بن جائے گی -- یہ کہہ کر نواب صاحب، خاموشی سے پیدل قلعہ دراوڑ چلے گئے -- صبح آ کر جو دیکھا تو محبت شاہ کا مزار آگے چلا گیا تھا اور مسجد کے لیے جگہ صاف موجود تھی -- بس وہیں جدید تعمیر مسجد شروع کرا دی گئی۔

عجیب بات میں نے خود جا کر دیکھی کہ مسجد کا مرکزی مغربی ہال، اس کا فرش اور ماحول باہر کی نسبت بھرپور ٹھنڈا تھا اور مسجد کے ہال کے بیرونی جھروکوں اور برآمدوں سے جو ہوا اندر آتی تھی، خوشگوار ٹھنڈی تھی -- جب کہ باہر صحن میں ایسی گرم لُو چل رہی تھی کہ لگتا تھا کہ جھلسا کر رکھ دے گی -- یہ کیا عمدہ جاگتا معجزہ تھا کہ میں حیران رہ گیا --!

اسی لیے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس ہال میں آرام کر رہی تھی، کوئی نمازیں پڑھ رہا تھا اور ننھے بچے مسجد کے یخ فرش پر کلکاریاں مارتے خوش ہوتے تھے --!

امام صاحب والی جگہ جھروکے دار تھی اور وہ اونچا اور وسیع خوبصورت نقشین جھروکہ ٹھیک قلعہ دراوڑ کی حصاری دیوار کے وسیع خوبصورت دروازے کے عین سامنے مگر مسجد کی کرسی کی بلندی پر بنا تھا۔ اس میں تین اعلیٰ پائے کی اونچی محرابیں تھیں اور محرابوں کے نیچے فرش سرخ، سیاہ اور سفید سنگ مرمر سے بنا تھا -- جھروکوں میں سنگ مرمر کی

جالی کے تین حفاظتی حاشیے ایک فٹ بلند بطور خوبصورتی اور حد بندی کے لگے تھے، جس میں سے ایک کو کسی ظالم نے اپنی ناجائز زور آوری کے ساتھ بے دردی سے توڑ دیا تھا--

میرے دل سے بے اختیار نکلا--ظالم، تو بنا نہیں سکتا تو، تو نے توڑا کیوں--"؟؟؟

مسجد کے صحن سے جب ان گنبدوں کے نیچے بنے ہال میں داخل ہوتے ہیں تو درمیانی محراب کے دائیں طرف ایک سنگ مرمر کی تختی پر یہ تاریخی اشعار فارسی میں کندہ ہیں--!

میں ان اشعار کو یہاں خاص طور پر اس لیے نقل کرتا ہوں کہ یہ اشعار تاریخ میں زندہ رہ جائیں--کوئی پتہ نہیں کہ کب کوئی سر پھرا زور آور آئے اور آ کر اس تاریخی نقش کو اکھاڑ پھینکے، توڑ دے یا برباد کر دے کہ پڑھنے کے لائق نہ رہیں--میں جگہ جگہ دیکھ رہا ہوں کہ ہر تاریخی سند کو خواہ وہ نقش ہے یا پچی کاری، تحریر ہے یا کوئی تاریخ، اسے کسی نہ کسی انداز میں منتقم مزاجوں اور بے خبروں نے طرح طرح سے برباد کر کے رکھ دیا ہے--اللہ جانے کب کوئی منتقم مزاج آئے اور اسے بھی نابود کر دے--!

خدا چوں فضل خود بر خان ما کرد	سرِ سروری او عطاء کرد
بہاول خان عباسی عطا کیش	کہ دہر از جود و رنگین تبا کرد
صبح صادق بخت آفتاب است	کہ فیضِ اُو جہاں را پر ضیاء کرد
جہاں داد گرامی حامیٔ دیں	بنا ہائے مساجد جا بجا کرد
ولے در شہر ڈیراور او بہ تجدید	عجائب مسجد جامع بنا کرد
مبارک مسجد ولے از سنگ ابیض	مبنائے طرفہ در راہِ خدا کرد
بخادم ہاتف از سال بنا گفت	بہاول خان حریمے دیں بپا کرد

(آغاز مسجد ۱۲۵۶ھ-تکمیل ۱۲۶۵ھ)

مسجد کا دایاں حصہ بھی ہال، گنبدوں اور میناروں پر مشتمل تھا--اللہ جانے اسے کسی مرمت یا بوسیدگی کی وجہ سے بند کر رکھا تھا--بس یوں سمجھ لیجئے کہ دائیں طرف قدیم ترین مسجد تھی اور بائیں طرف جدید مسجد تھی مگر دونوں کا صحن اور دروازہ داخلہ ایک ہی تھا--!

مجھے خیال آیا کہ کیوں ناں احاطہ مسجد سے باہر نکل کر قدیمی دائیں مسجد کو بیرونی سمت سے ایک نظر ہی دیکھ لیا جائے--!

سیڑھیاں اتر کر دائیں طرف کے پچھواڑے کے نکڑ پر پہنچا تو وہی منحوس صورت سیاہ بھینس، سانڈے کا تیل بیچنے والی ابھی تک بیٹھی تھی--شائد اس نے مجھے میرے ہیٹ کی نشانی سے پہچان لیا تھا--مجھے دیکھتے ہی مسکرائی، ذرا سی پیٹ سے قمیض اٹھا کر اور منہ سے زرد دانت نکال کر بولی۔

"--باؤجی آجاؤ--آجاؤ--ایسا سانڈے کا تیل بنا کر دوں گی کہ لنگائی کی کمر میں تین دن درد نہ رہے تو میرا نام شیداں نہیں--"

یہ سنا تھا کہ میں جھپٹ کر واپس پلٹا--آگے جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، وہ بھی نوکیلے اور بڑے بڑے کانٹوں والی--کچھ بھی نہیں تھا اُدھر، میں تیزی سے واپس اپنی عزت بچا کر پلٹا تو اس نے پھر جملہ کسا--!

"--باؤجی--اُدھر تو پرانا ٹاپو ہے اور جنگل ہے، کہو تو میں لے چلوں جنگل میں--مجھے رستہ بھی آتا ہے اور خرچہ بھی کم لوں گی--"

"--اے بھاگ بابے بھاگ--بھاگ اِدھر سے--"

مسجد کی سیڑھیوں کے آگے وجدان اور خرم شکیب کھڑے تھے--

"--کیا ارادے ہیں بھئی--بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے لوگو--" میں بولا۔

"--آپ آغا صاحب بالکل فکر نہ کریں--اُدھر صحرا میں ایک ہموار ریتیلا میدان ڈھونڈ کر لڑکوں کو تمبو لگانے کو چھوڑ آیا ہوں--اور آپ لوگوں کے لیے کمال کی خوش خبری یہ ہے کہ آپ لوگ وہاں اونٹوں پر بیٹھ کر جائیں گے--جو لوگ اونٹ کے صحرائی سفر سے خوف کھاتے ہیں یا چلتے اونٹ کے ہچکولوں سے ڈرتے ہیں، وہ کوچ میں بیٹھ کر جا سکتے ہیں--" خرم شکیب نے میرا دل پسند اعلان کیا۔

"--بھئی یہ اونٹ سفاری کا انتظام کر کے آپ نے چولستان کو کم از کم میری زندگی میں توامر کر دیا ہے--یہ بتائیے یہ سفر کتنی دیر کا ہے--؟"

میں نے فقط اس لیے پوچھا کہ میں اس سفر سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہتا تھا--!

"--کافی دیر لگے گی مگر ایک گھنٹے سے کم--ہمیں صحرا میں بہت اندر جا کر جگہ مل سکی ہے، کیونکہ کار ریلی کی وجہ سے آج یہاں کافی سے زیادہ رش ہو گیا ہے--کل کار ریلی چولستان کا سب سے ہاٹ ایونٹ ڈے ہے ناں--" خرم شکیب نے بتایا۔

"--ان سے ملیے، یہ ہیں ہمارے چولستان میں اونٹوں کے اسپانسر--عبدالرحمن صاحب اور یہ ان کا بیٹا

عمران ہے۔۔"

ایک دبلا پتلا سیاہ بھت پگڑی والا میری طرف بڑی محبت سے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔۔ میں نے ہاتھ ملایا۔۔ پھر دس بارہ برس کے ایک بچے نے بھی شیک ہینڈ کیا۔

مجھے دل ہی دل میں بڑی شرمندگی ہوئی۔ بات کہنے کی تو نہیں ہے مگر سچ کہنے اور سچے محسوسات بیان کر دینے کو میں دنیا کی سب سے بڑی سچائی سمجھتا ہوں۔۔ اس تعارف سے پہلے میں یہ سمجھا تھا کہ خرم شکیب فقیروں میں گھرا ہوا ہے اور اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔۔!

بعد میں غور کیا تو اپنی بدحواسی کی اصل وجہ سمجھ آئی۔۔ وہ مکروہ جملہ ابھی تک میرا پیچھا کر رہا تھا۔

"۔۔ہاؤ جی۔۔ اُدھر تو پرانا ٹاپو اور جنگل ہے، کہو تو میں لے چلوں جنگل میں، مجھے رستہ بھی آتا ہے اور خرچہ بھی کم لوں گی۔۔"

بدبخت۔۔سور کی بچی۔۔ یہ سوچ کر میرے کانوں سے دھواں نکلنے لگا اور چہرے پر وحشت سی آ گئی۔۔!

باب ۲۷

چولستان کا گم شدہ دریائے ہاکڑہ
جو آج بھی رُوہی میں زیرِ زمین بہتا ہے--!

میں نے بے اختیار عبدالرحمٰن ساربان سے پوچھا۔

"--عبدالرحمٰن، یہاں کوئی پرانا ٹاپو بھی ہے کیا--؟"

"--جی ہاں--جناب، یہ سامنے نیچے اتر کر پرانے دریا کا ٹاپو ہے--جدھر اپنے اونٹ آپ لوگوں کے انتظار میں کھڑے ہیں اور جہاں گاڑیوں کی پارکنگ ہے، وہی پرانا اور سوکھا ہوا دریائے ہاکڑہ ہے--پرانے دریا کے دونوں کنارے ٹاپو ہی ہیں جناب--"

میرا حیرت سے منہ کھلا رہ گیا--؟

چولستان کا صدیوں سے گم شدہ دریا قدرت نے کتنی آسانی سے میرے علم میں لا کر دے دیا۔

"--یہ واقعی پرانے دریا کی سوکھی تہہ ہے--؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"--جی جناب--آپ دیکھ سکتے ہیں، وہ اصل سڑک سے کتنا نیچے واقع ہوا ہے، اس کی تہہ کی مٹی اور ریت اب بھی خالص اور بھل سے نرم ہے--آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ جگہ جگہ آج بھی نیچے کا صدیوں سے دبا پانی

گاڑیوں کے متواتر بوجھ پڑنے سے خود بخود ابل ابل کر، جگہ جگہ سے باہر نکل آیا ہے اور یہ جو گہری پارکنگ میں آپ کو پانی کے اُتھلے ٹوبے نظر آ رہے ہیں، یہ دریا کی زمین خود بخود خارج کرتی رہتی ہے۔ مگر اس وقت یہ پانی زمین پر بوجھ پڑنے سے نکلا ہے-- ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ اس سوکھے دریائی رستے کے نیچے، بہت نیچے اب بھی دریائے ہاکڑہ، انسانوں کی نظروں سے اوجھل، کہیں زمین کے اندر بہہ رہا ہے-- بس نظر نہیں آتا، پر کبھی کبھی اپنے ہونے کی نشانیاں ضرور دیتا ہے--"

حیرت و استعجاب سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا--

مجھے یاد آیا کہ میرے بڑے پیارے دوست سید شعیب جعفری ہیں، جو ادب پروری میں لاجواب ہیں اور پاکستان پوسٹ میں ایڈیشنل پوسٹ ماسٹر جنرل ہیں-- انھوں نے مجھے فون کیا اور کہا، سنا ہے کہ آپ چولستان جا رہے ہیں اور وہ بھی قلعہ دراوڑ کے آس پاس۔ میں نے کہا جی ہاں-- کہنے لگے کہ میں بھی کچھ سال پہلے وہاں گیا تھا-- قلعہ دراوڑ کے پاس ایک ریتلے میدان میں چلا جاتا تھا کہ مجھے زمین پر پڑا ایک سیپ ملا-- میں سمجھا کہ کسی چولستانی خاتون کے لباس میں ٹنکا ہوگا، وہ گر گیا ہوگا؛ کیونکہ وہاں کی خواتین اپنے لباس کی آرائش سیپ اور سیپیوں سے بھی کرتی ہیں-- پھر سید شعیب جعفری بتاتے ہیں کہ ذرا اور آگے چلا تو جگہ جگہ ریت میں دبی سیپیاں ملنے لگیں-- میں اس اسرار کو بالکل نہ سمجھ سکا-- آپ کی ذات سے مجھے امید ہے کہ آپ چولستان کی ریت میں موجود ان چھوٹی چھوٹی سیپیوں کے راز کو ضرور دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے--"

میں بھائی شعیب جعفری کو یہ خوش خبری دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی لگن سچی اور سوال کھرا تھا-- یہ راز خود بخود کھلنا شروع ہو گیا ہے--!

دریائے ہاکڑہ کی پوری داستان اپنی تاریخ سمیت میرے سامنے آ گئی ہے-- جو میں آپ یعنی سید شعیب جعفری کے نام معنون کرتا ہوں--!

صدیوں سے سوکھا دریائے ہاکڑہ مقامی لوگوں کے مطابق ضرور کسی انسانی گناہ سے ناراض ہو کر زمین کی گہری تہوں میں پردہ کر گیا ہے-- مگر کبھی کبھی اپنا نیچے بہتا پانی سطح زمین پر چند ٹوبوں کی شکل میں اس نشانی کے طور پر اوپر اچھال دیتا ہے کہ میں ہوں، مگر تمھیں قدرت نے مجھ سے محروم کر دیا ہے-- اسی پانی کے ساتھ سیپیاں بھی اوپر سطح زمین پر آ جاتی ہیں-- قدرت اپنی صاف نشانی دیتی ہے-- چولستان کے بزرگوں کو امید ہے کہ کبھی نہ کبھی زمین کی تہوں میں دفن دریائے ہاکڑہ واپس اوپر آ کر اپنی قدیمی گزرگاہ میں پھر سے بہنے لگے گا--!

اور یہ چولستان کا ویران، ریتیلا اور سنگلاخ خطہ پھر سے اسی طرح ہرا بھرا اور زرخیز ہو جائے گا جیسا کبھی، کسی زمانے میں شاداب ہوا کرتا تھا---!

کہتے ہیں چولستان کے واحد دریائے ہاکڑہ کی کہانی بڑی پرانی ہے--- ہمالیہ کے پہاڑ سے دو بڑے دریا نکل کر ہندوستان کو سیراب کرتے ہیں--- ایک گنگا اور دوسرا جمنا--- جمنا سے پھر سات ذیلی دریا اور نکلتے ہیں--- جن میں سے ایک دریائے ہاکڑہ تھا۔ آریہ لوگ انہی سات دریاؤں کے گرد آ کر پہلے پہل آباد ہوئے تھے--- کوئی کہتا ہے کہ یہ وہ دریا ہے جو بیکانیر کی جھیل تکواڑ سے نکل کر چولستان آتا تھا اور کسی کا کہنا ہے کہ پٹیالے کے پاس سے جو دریائے سرسوتی آتا ہے، دریائے ہاکڑہ نے اسی سے ذیلی دریا کی صورت میں جنم لیا تھا۔ کسی سیانے عاقل کا دعویٰ ہے کہ رگ وید میں، جس صحرا میں بہنے والے دریا کا ذکر ملتا ہے، وہ یہی چولستان کا دریائے ہاکڑہ ہی ہے---!

غرض جتنے منہ ہیں، اتنی ہی باتیں ہیں--- مگر یہ بات مصدقہ ہے کہ دریائے ہاکڑہ نہ جانے کب سے اس خطے میں بہتا تھا--- یاد رکھئے کہ دریاؤں کی تاریخ کبھی ڈھونڈے سے نہیں ملا کرتی، سو اس کی کیسے ملنے کا امکان ہے--- ہاں یہ بات بالکل درست ہے کہ جب اس خطے میں یہ لہراتا بل کھاتا دریا بہا کرتا تھا تو یہ تمام تیرہ ہزار مربع میل کا علاقہ زرخیز اور شاداب ہوتا تھا۔ پھر اٹھارویں صدی میں نہ جانے کیا ہوا، کسی کی بددعا لگ گئی یا قدرت نے اپنے کرم اور مہربانی کو اس علاقے پر سے کیوں اٹھا لیا کہ پورا کا پورا دریا دیکھتے ہی دیکھتے، زیرِ زمین جا کر خود بخود دفن ہو گیا---!

میں نے قلعہ دراوڑ کے سامنے مسجد کے بالکل نیچے اس کے قدیم آثار کو محسوس کیا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مقام پر دریائے ہاکڑہ کی چوڑائی کم از کم ایک میل کے لگ بھگ تھا۔ دریا زمین کی عمومی سطح سے پندرہ بیس فٹ نیچے بہتا تھا---!

دریائے ہاکڑہ کے زمین میں غائب ہونے کے بعد اس پورے خطے پر ایک طرح کا قہر ہی نازل ہو گیا--- آبادیاں ختم ہو گئیں، چراگاہیں خشک سالی سے نابود ہو گئیں، کھیت کھلیانوں کی ہریالی ناپید ہو گئی--- ریت اور مٹی نے مردہ زمین سے سر ابھار لیا اور اس ویرانی اور پانی کی عدم دستیابی سے صحرائے چولستان وجود میں آ گیا۔

ان زمانوں میں قلعے، مسجدیں اور آبادیاں عموماً دریاؤں کے اونچے اور محفوظ کناروں پر ہی ہوا کرتی تھیں--- خود بستی اور قلعہ دراوڑ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے--- اتنا قدیم دریا ہو گا تو گھونگے اور سیپ بھی ملیں گے--- جس جگہ قلعہ دراوڑ کے جشن میں آنے والوں کے لیے پارکنگ بنائی گئی ہے، وہ دریائے ہاکڑہ کی گذرگاہ ہی تو ہے---

آج بھی یہاں کی ریت میں سے چھوٹے چھوٹے سیپ گھونگھے پاؤں کی ٹھوکر سے اتفاقاً نکل آتے ہیں-- اس پورے خشک دریا کے تلے میں ایک قطرہ پانی کا سوال پیدا نہیں ہوتا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ جہاں دس بارہ بڑی بڑی بھاری گاڑیاں، بسیں پارک ہوئی ہیں، گزشتہ روز اس کی مٹی خشک تھی اور آج زمین سے خود بخود پانی باہر نکل آیا ہے اور یوں دل دلی کیچڑ بن گیا ہے کہ جانو لاکھوں لٹر پانی زمین پر بہا دیا گیا ہو--!

عبدالرحمٰن ساربان جو ہمارے اونٹوں کے قافلے کا سالار تھا، اس سے میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے-- ابھی دیکھ لیں، جہاں، جس میدان میں ہمارے اونٹ کھڑے ہیں، یہاں کی ریتلی زمین میں آپ کو کہیں بھی ایک قطرہ پانی کا نظر آتا ہے--؟

میں نے کہا "-- نہیں -- صرف خشک اڑتی ریت ہے جو ناک منہ میں گھستی ہے--"

کہنے لگا --"صاحب، اس زیر زمین پانی کو، زمین رات کے وقت باہر نکالتی ہے-- آج رات جب آپ قلعہ دراوڑ پر چراغاں اور آتش بازی دیکھنے آئیں گے تو بس ذرا سی نظر دریا کی اس خشک ترائی میں بھی ڈال لیجئے گا-- آپ کو سب معجزے نظر آ جائیں گے--"

پھر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے پوچھا -- عبدالرحمٰن کیا سوچ رہے ہو--" تو اس نے بڑی عجیب بات بتائی۔ کہنے لگا۔

"-- جیتا جاگتا معجزہ بڑا حیران کن ہوتا ہے-- آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ سچ ہے، کوئی کہانی وہانی نہیں ہے-- ابھی کوئی باون ترپن سال پرانی بات ہے-- ۱۹۶۴ء تھا اس وقت -- اسی سال میں پیدا ہوا تھا کہ دراوڑ بستی کے لوگ صبح اٹھے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دریائے ہاکڑہ زمین سے پورا کا پورا باہر نکل آیا تھا-- میرے والد بتاتے ہیں کہ اس علاقے میں دریا کو رواں دواں دیکھ کر صحرا کے لوگ دریا کے کناروں پر جمع ہو گئے-- اللہ کی ذات کا شکر ادا کرنے لگے کہ اب یہ صحرائی علاقہ پھر سے بہار دینے لگے گا-- میرا باپ بتاتا ہے کہ میں تجھے (عبدالرحمٰن ساربان کو) گود میں اٹھا کر وہاں کنارے پر کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ شاید میری پیدائش کی برکت ہے کہ کل یہ جگہ سوکھی تھی اور رات بھر میں موجیں مارتا دریا بن گئی-- لوگوں نے تعاقب کیا کہ دریا کدھر تک جاتا ہے-- پتہ چلا کہ ۲۸ میل دور جا کر دریائے بیاس میں شامل ہو گیا ہے-- پھر پتہ نہیں کیا ہوا-- سال چھ ماہ اپنی پوری آب و تاب سے بہتا رہا اور پھر چند ہفتوں میں، جس طرح ظاہر ہوا تھا، اسی طرح زمین میں خود بخود غائب ہو گیا--"

عبدالرحمٰن ساربان کے چہرے پر اداسی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے--!

اس کے ہاتھ میں اپنے بجے سنورے اونٹ کی مہار اتنی ڈھیلی پڑ گئی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب ہاتھ سے چھوٹ کر سوکھے دریائے ہاکڑہ کی ریت پر گر گئی۔

وہ چاروں طرف اتنی اداس اور بے نور آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ جیسے اسے بھی یقین ہے کہ کسی بھی سہانی اور جاگتی صبح میں دریائے ہاکڑہ پھر سے اسی سوکھی گذرگاہ میں اپنی پوری شان سے بہنے لگے گا -- یہ امید اس لیے قوی اور پر یقین تھی کہ جس سال وہ پیدا ہوا تھا، اس سال بھی ایسا ہی ہوا تھا --!

مگر دریا کو نہ کوئی دوبارہ خشک ہو کر زمین میں غائب ہونے سے روک سکا اور نہ ہی اس کے رات بھر میں ظاہر ہونے کو کوئی اپنی آنکھ سے دیکھ سکا --!

آج چولستان ایک خشک صحرا ہے -- کانٹے دار جھاڑیوں اور ریت کے ٹیلوں اور ہوا میں اڑتے بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے -- مگر لوگ پھر بھی وہاں رہے جا رہے ہیں -- بارش کی دعائیں مانگتے ہیں، پانی کو ترستے ہیں، لیکن اپنی ماں جائی دھرتی کو چھوڑتے نہیں ہیں --!

باب ۲۸

وہ بیویوں سے زیادہ اُونٹنیوں سے پیار کرتے ہیں، صحرا میں ہمارا اونٹوں پر یہ سفر یادگار رہتا ہے --!

میں نے سنا تھا کہ --!

وہ اپنی عورتوں سے زیادہ اپنی اونٹنیوں سے پیار کرتے ہیں --!

جس طرح اور جس محبت سے وہ صحرائی، اپنی اونٹنیوں کو سجاتے، بناتے اور سنوارتے ہیں، اس طرح سے تو وہ اپنی چہیتی بیویوں کو بھی بننے سنورنے کو نہیں کہتے --!

اس لیے مشہور ہے کہ روہی میں وہی عاشق نامراد و بے مراد ہے جو اونٹنی کی بجائے کسی صحرائی دوشیزہ پر عاشق ہو جائے --!

اور عاشق بامراد وہی شیر جوان ہوتا ہے جو اپنی اونٹنی پر مرتا ہے، جان چھڑکتا ہے، اس کے ناز نخرے اٹھاتا ہے --!

ورنہ تو صحراؤں میں جو اہمیت اونٹ اور اونٹنی کی ہے، وہ کسی بے مثال حسینہ کی بھی نہیں ہے --!

ایسے عشاق بھی ہیں کہ اگر بہ یک وقت معشوقہ اور اونٹنی بیمار ہو جائے تو صحرائی مرد، اونٹنی کی مزاج پرسی،

دوا دارو اور دیکھ بھال کو ترجیح دیتا ہے--!

یہاں دوسری بیوی مل جانا بہت آسان ہے، نئی اونٹنی ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے--!

میں نے ٹھیک سنا تھا اور آج دیکھ بھی رہا ہوں کہ جتنی بنی سجی اونٹنیاں ہیں، اتنا کسی کالی کلوٹی، سوکھی ماری لڑکی کو بھی سجا دیا جائے تو ہزار من چلے، پل بھر میں اس کے عاشق بن جائیں--!

وہاں سامنے، دریائے ہاکڑہ کی خشک ریتلی بنجر تہہ کی زمین کے وسط میں تیرہ اونٹ اور اونٹنیاں بھی کھڑی تھیں--عبدالرحمٰن ساربان، اونٹ بانوں کو ہدایات دے رہا تھا--ایک ساتھ، ایک جگہ کھڑے ان بنے سنورے اونٹوں کے گلّے کو چاروں طرف کھڑے لوگ بڑی دلچسپی اور دل جمعی سے دیکھ رہے تھے--اِن ڈھیر سارے اونٹوں نے اس وسیع و عریض میدان میں موجود لوگوں کی خاص توجہ حاصل کر لی تھی، جس کی سب سے اہم اور خاص وجہ ان کی سجاوٹیں اور بناؤ سنگھار تھے--!

میدان میں اکا دکا اور بھی اونٹ تھے مگر عبدالرحمٰن ساربان جس طرح ان کو خاص طور پر سجا بنا کے لایا تھا، اس سجاوٹ کی کشش نے یہاں کا ماحول ہی بدل دیا تھا--!

میں نے بے اختیار اونٹوں کی صحت اور خوبصورتی کی عبدالرحمٰن ساربان سے تعریف کی اور پوچھا یہ سجاوٹی سامان کہاں سے لیا--؟

کہنے لگا--"صاحب--صرف گلے کی گھنٹیاں اور پیروں کے گھنگرو ہی بازار سے خریدے ہیں، باقی سارے زیور گھر والیوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے پہنائے ہیں--"

"--ارے، واہ--اس کا مطلب یہ کہ مرد ہی نہیں، صحرائی گھریلو عورتیں بھی ان اونٹوں سے مردوں کی طرح پیار کرتی ہیں--ہم تو اب تک یہی سمجھتے تھے کہ روہی مرد ہی اونٹوں کے ناز نخرے اٹھاتے اور پیار کرتے ہیں--" میں نے حیرت سے کہا

"--نہیں صاحب نہیں--یہ بہت سمجھ دار جانور ہیں، ایسے نہیں نبی پاکؐ ان سے پیار کرتے تھے--ادھر یہ بھی بہت محبت کرتے ہیں، اپنے مالکوں سے بلکہ ہر ہر گھر والے سے--" عبدالرحمٰن ساربان بڑی محبت سے اپنے اونٹ کی گردن پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا اور کہے جاتا تھا--!

"--صاحب--یہ میرا اونٹ ہے، اس کا نام رلیجہ ہے، اس کی رانی (اونٹنی) وہ سامنے میرے بیٹے ذیشان کے ساتھ کھڑی ہے۔ وہی ذیشان جس سے آپ نے ابھی مسجد کے سامنے ہاتھ ملایا تھا--میں آپ کو بتاؤں

کہ میرا راجہ، میرے سے زیادہ میری گھر والی سے ہلا ہوا ہے۔ ابھی یہ چار سال کا ہے۔ جب یہ دو سال کا تھا تو میری گھر والی روٹھ کر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ جب وہ جانے لگی تو مجھے بھی غصہ آ گیا، میں نے کہہ دیا -- جا، دفع ہو جا -- اب ناں آنا میرے دروازے پے -- رولوں گا میں تیرے بغیر -- اس کے ماں باپ کا گھر اسی روہی میں کوئی دو کوس پر تھا، سمجھو کہ سات میل -- لوجی، شام سورج ڈھلے میں نے راجے کو دانہ پانی ڈالا، اس نے کھانے سے انکار کر دیا -- بڑا پیار کیا، تھپکی مالش کی مگر مجال ہے جو راجے نے بھوسی دانے کو منہ بھی لگایا ہو -- منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا -- میں تو جی پریشان ہی ہو گیا کہ کہیں بیمار شیمار ہو گیا ہے -- اسی حیص بیص میں نیند آ گئی -- رات کو جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ راجہ ملکانی کی چارپائی پر سرڈالے سو رہا تھا -- اُف، مجھے یاد آیا کہ شام کا چارہ تو راجے کو ملکانی کھلایا کرتی تھی اور اس سے اونچی اونچی باتیں بھی کیا کرتی تھی -- اس پہلی جدائی کی شام ہی جانور نے اس کی کمی محسوس کر لی تھی اور میں، میں تو جانور سے بھی زیادہ گر گیا تھا -- پھر مجھے نیند نہ آئی -- صبح، تڑکے اٹھ کھڑا ہوا اور بلا کچھ کھائے پئے راجے کو لے کر ملکانی کی طرف چل دیا -- پہلے تو یہ چلنے سے انکاری سا ہوا مگر پھر چل پڑا۔ پتہ نہیں اسے ملکانی کی خوشبو آ گئی تھی -- صبح سویرے اس کے دروازے پر پہنچا تو مجھے اور راجے کو دیکھ کر ملکانی بڑی ادا سے مسکرائی۔ پھر اسے تو وہ پیار کرنے لگی اور مجھ سے لڑنے لگی کہ بس تو ایک رات بھی میرے بنا نہ رہ سکا -- میں چپ سنتا رہا -- پھر بولا -- مجھے تو تُو جو مرضی کہہ لے، روٹی پانی کو پوچھ نہ پوچھ، پر تیرے اس عاشق نے تیری جدائی میں رات سے نہ پانی پیا ہے اور ناں بھوسی دانہ کھایا ہے -- بس صاحب جی اس نے لڑائی طعنے وہیں دھرے رکھے، سب سے پہلے راجے کی خدمت میں لگ گئی -- میں نے کہا -- سن ملکانی -- میں تیری محبت میں تیرے دروازے پر نہیں آیا -- راجے کی تیرے سے محبت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے، ورنہ کبھی نہ آتا -- ملکانی نے رک کر ایک محبت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی -- جا دفع ہو جا -- تو اگر آج نہ آتا تو میں اپنے راجے کی محبت میں خود آ جاتی -- چل ہٹ، لسی روٹی کھا، پھر اپنے گھر چلتے ہیں --!!!

یہ داستانِ محبت سن کر میں دم بخود رہ گیا --!

"-- یہ جو زیور گہنا آپ اونٹوں کی مہاروں میں، ان کی نکیلوں میں، ان کی گردنوں میں رنگین ہاروں اور موتیوں کی لڑیوں میں پہنا دیکھ رہے ہیں، یہ سب گھر والیوں نے خود تیار کیا ہے، اور اپنے ہاتھوں سے پہنایا ہے -- ہمارے ہاں تو یہ بھی رواج ہے کہ کوئی خوشی کا موقع ہو، کسی سے ناراضگی کو دور کرنا ہو یا اظہارِ دوستی کرنا ہو تو ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے جو بھی لائیں، اس گھر کے اونٹ کے لیے کوئی نہ کوئی گہنا ضرور بنا کے لے جاتے ہیں --"

معلوم ہوا کہ ان تیرہ اونٹوں میں تین اونٹ عبدالرحمٰن کی ملکیت تھے۔ باقی اس کے قریبی رشتے داروں کے تھے--اس نے ارجنٹ کال پر سب کو بلایا تھا اور اونٹ سفاری کا خصوصی انتظام کیا تھا--ہر اونٹ کے ساتھ اس کا الگ الگ ساربان تھا تا کہ رفتار، سمت اور چلائی کو گرفت میں رکھا جائے--تا کہ کوئی اونٹ اجنبی سواری کے بے مقصد اشارے سے بھڑک نہ جائے اور صحرا میں کسی نامعلوم سمت میں بھاگ نہ جائے--!

"--صاحب جی--مجھے خرم صاحب کا حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو اپنے اونٹ پر سوار کرا کے چلوں--"

عبدالرحمٰن سالار ساربان نے مجھے مطلع کیا۔ حیدر کا دوست عمر فرحان بھی میرا ہم راہی ہو گیا۔ کیونکہ ہر اونٹ پر دو دو لوگوں نے بیٹھنا تھا۔ وجدان اور حیدر ایک اونٹ پر الگ سوار ہوئے۔ اس حکمت عملی کی بنیادی وجہ فوٹو گرافی تھی۔ اگر میں اور وجدان ایک ہی اونٹ پر سوار ہو جاتے تو فوٹو گرافی کا پھیلاؤ محدود ہو جاتا۔

اونٹوں کی گردنوں پر مالکوں کے نام لکھے تھے! بڑے بھونڈے انداز میں سوائے عبدالرحمٰن کے جانوروں کو چھوڑ کر--ذیشان، عبدالرحمٰن، اکرم خان امجد، محمد چولستانی، شہزاد، اکبر--دلچسپ بات یہ تھی کہ اونٹ کے مالک کا نام زیادہ تر، اونٹ کی گردن کے بائیں طرف لکھنے کی روایت تھی۔ دائیں طرف شاذ و نادر ہی کسی نے نام لکھا، سوائے ایک مریل سے اونٹ کے--!

جو صحرائی جہاز میرے حصے میں آیا، اس کی گردن پر کوئی نام نہیں لکھا تھا، بس دو سیاہ نشان بڑے مقررہ فاصلے پر نفاست کی گولائی میں لگائے گئے تھے اور اس اونٹ کا پیار کا نام راجہ تھا--وہی راجہ، جس کی محبت ملکانی سے پیدا ہوئی تھی، جس کی کہانی میں بیان کر چکا ہوں--عبدالرحمٰن کی دوسری اونٹنی پر رضوان ملک اور محمود احمد سوار تھے۔ اس کی سجاوٹ بھی قابل دید تھی--پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ ایک بہت خوبصورت سنہری اونٹنی تھی؛ سنہری رنگ، سیاہ آنکھیں۔ بروکیٹ کی سنہری لش پش چادر اس کے کوہان، کمر اور پیٹ پر ڈلی تھی۔ کوہان کی کرسی پر الگ سے سرخ چیک دار صاف ستھرا کھیس، بروکیٹ کی چادر کی حفاظت کی خاطر کس کے چڑھایا گیا تھا۔ اس نے روایتی رنگین زیور بھی بہت سا پہن رکھا تھا، جیسے ابھی بیاہ کے پیا گھر سدھاری ہو--!

فاطمہ اور تعبیر کا اونٹ سجاوٹ بناوٹ میں ننگا بُچا تھا--نہ گلے میں ہار گھنٹی، نہ پیروں میں گھنگرو جھانجھریں--بس ایک رسی کی نکیل اور پالان پر بدرنگ سی پرانی چادر--سچ کہوں کہ اس اونٹ کی سجاوٹوں کی کمی کو دونوں لڑکیوں کے رنگین لباسوں نے پورا کر دیا تھا--!

وجدان اور حیدر کے اونٹ کی گردن پر کوئی نام نہ لکھا تھا، ہاں البتہ اس کے بائیں سنہری کو لہے پر پانچ

ستارے بنے تھے--سجاوٹ میں وجدان کا صحرائی جہاز بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ گلے میں صدائے جرس بلند کرتے والی پیتل کی چمکتی گھنٹی، گلے میں پورا پورا رنگین زیور، پالان پر خوبصورت "رلی"! کوہان پر ڈلے پالان پر چڑھا صاف ستھرا کھیس اور کوہان کے کجاوے پر کڑھائی دار چادر--اونٹ خود تو جوان اور خوبصورت تھا ہی، اس کی سجاوٹ نے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے تھے--!

میرے اونٹ "راجہ" کی سجاوٹ" بناوٹ اور جوانی کی اٹھان بھی کم نہ تھی--گلے میں پڑی پیتل کی تین گھنٹیاں، دائیں بائیں چھوٹی گھنٹی اور درمیان میں بڑی--جب وہ اپنی گردن یا جسم ہلاتا تو تینوں گھنٹیاں ذرا ذرا مختلف آواز میں گھنٹیاں بجاتیں تو صحرائی موسیقی کا اَن ہونا سا لطف آ جاتا، میں دل، دل میں ہی کہتا، میاں گردن ہلائے جاؤ گھنٹیاں بجائے جاؤ--چاروں پاؤں میں گھنگروں کی پائیل، جو پاؤں کی حرکت کے ساتھ چھن چھناتی بھلی لگتی تھیں--گلے میں چار مالائیں، سب سے اوپر نیلے موتیوں کی، جس میں ہر نیلے موتی کے بعد سنہری چھپے گالے تھے۔ نیلی مالا کے نیچے آسمانی چھوٹے بڑے دانوں کی مالا تھی، اس کے نیچے سفید سنہری کوڑیوں کی اور سب سے نیچے والی مالا، انسانی نازک ہاتھوں کی ہنر مندی کا نمونہ تھی۔ وہ زرد اور تیز گلابی ڈوریوں کو لپیٹ کر بنائی گئی مالا تھی--سُوت کی رنگین موٹی لچھیوں اور بٹی ہوئی رسیوں سے سہ تارہ جال تھا، جس میں رنگین رسیوں کے پھندنوں کو کھلا چھوڑ کر پھول سے بنائے گئے تھے۔ ان پھولوں کے رنگ کھلتے ہوئے زرد، گلابی اور سبز تھے، جب کہ بٹی ہوئی رسیاں نیلے، گلابی سبز اور سنہری رنگوں سے آراستہ تھیں--

راجہ خود بھی نرالی خوبصورتی رکھتا تھا--اب آپ کہیں گے کہ سلمان صاحب نے اپنے اونٹ کی خوبصورتی بیان کرنے میں مبالغے سے اس حد تک کام لیا ہے کہ حد ہی کر دی ہے--مگر نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے، کوئی مبالغہ آرائی نہیں کر رہا، فقط جو جس طرح دیکھا ہے، اس کو اسی طرح سے بیان کر رہا ہوں کہ جیسا تھا--یہی تو کہنا اور بتانا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ اپنے اونٹوں کو اسی طرح سے بناتے اور سنوارتے ہیں--!

اس کا چہرہ چونکہ میرے بالکل سامنے، ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا، اس لیے سب صاف نظر آتا تھا--راجہ کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ غزال تھیں، پلکیں حیرت انگیز طور پر بہت بڑی اور بال بال الگ الگ دھوپ میں اپنی خوبصورتی کے ساتھ چمکتا تھا--دونوں کان اتفاقاً بالکل سیاہ تھے کہ سنہرے سفید چہرے پر اپنی فطری خوبصورتی کے ساتھ الگ سے دل کش نظر آتے تھے--سر کی گدی کے عین پیچھے سیاہ گھنگریالے بالوں کی تکونی باڑ تھی، بالکل اسی طرح کہ جیسے میرا پورا سر تو بے بال کا ہے مگر چاروں طرف گھنگریالے بالوں کی گھنی ہریالی ہے--!

مجھے لگا کہ راجہ اونٹ نے میرے ہیئر سٹائل کو کافی حد تک فالو کر رکھا ہے، جس کی مجھے بے حد خوشی ہوئی--!!!

اس کی نکیل نیلی ہاتھ کی بٹی اور گھر کی رنگی رسی سے بنی تھی، جس میں مختلف رنگوں کے کھلے دھاگوں سے پھول بھی بنا کر سجاوٹ میں اضافہ کر دیا گیا تھا--!

اونٹوں کا قافلہ صحرا کی طرف چلنے کو تیار کھڑا تھا--!

میں سوچ رہا تھا کہ صحرا میں اونٹوں کا یہ سفر یقیناً ایک یادگار اور ناقابل فراموش سفر ہوگا جو ہماری زندگی کی تاریخ میں یادوں کے سنہرے اور درخشاں باب کی حیثیت سے لکھا جائے گا--!

پھر ایک ایک کر کے اونٹ صحرا کی طرف چلنے کو قطار بندی کر کے کھڑے ہو گئے--!

ایک خوبصورت منظر نے جنم لیا--!

اردگرد کھڑے بے شمار لوگوں کی توجہ کا مرکز یہی قافلہ تھا--سیاحوں کے رنگین لباسوں اور سوار لڑکیوں کی ہلکی ہلکی چیخوں نے ماحول میں خواہ مخواہ رنگ بھر دیا تھا--!

نوجوانوں میں خوشی اور مسرتوں کی ترنگ ان کے چہروں کی شادمانی اور بے لاگ اور معصوم مسکراہٹوں سے دکھائی دیتی تھی--!

قافلہ ایک قطار میں چلا، صدائے جرس نے اڑتی بگولہ ریت میں صحرا کے ہونے کا اور اونٹوں کی کوہانوں پر بیٹھ کر ہچکولے لینے سے ایک نئے لطف بھرے احساس میں لطافت بھرنا شروع کی--!

اتنے سارے اونٹ جب صحرا کی طرف سو گز لمبی قطار میں چلے تو ماحول نے انگڑائی لی۔

سوکھے دریائے ہاکڑہ کی سطح کی مردہ پچھی زمین تمام ہوئی۔

گویا سطح بے آب و گیاہ سے نکلے اور کیکر کے گھنے درختوں کے درمیان سے جو رستہ نکلتا تھا، اس پر خراماں خراماں چل دیئے--اس ویرانے میں اگلے اونٹوں کے پیروں سے جو باریک ریت گرد بن کر اڑتی تھی، مجھے اس کے بادل بہت بھلے لگے--اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آوازیں، اس ویرانے میں کسی ایسے من موجی قسم کے سُر اور سنگیت کو جگا تیں تھیں کہ روح میں نشہ سا گھلتا تھا--جھاڑ کانٹوں دار ختم ہوئے۔ کیکر اور ببول کے درخت بھی پیچھے ہٹ گئے، ریتلا میدان تھا اور ایک لمبی قطار صحرا میں ایک آن، بان، شان سے داخل ہو رہی تھی--دائیں طرف، ذرا دور ہٹ کے، گنبدوں سے آراستہ کسی طویل عمارت پر نگاہ پڑی--ارے واہ--یہ تو قلعہ دراوڑ کے

عباسیوں اور صادقوں کی مدفن گاہ یعنی قبرستان تھا کہ مینار کوئی نہ تھا، بس گنبد ہی گنبد تھے، چھوٹے بڑے، طرح طرح کے گنبد اور ہر گنبد کے نیچے بڑے نواب روز قیامت تک محو خواب تھے۔ گویا یہ دراوڑ کے شاہ نشینوں کی آخری آرام گاہیں تھیں--گنبدوں کی خوبصورتی، ان پر نقش کاری، پچی کاری اور گل کاری اعلیٰ فن کاروں کی عرق ریزی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی-- یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا اور لازوال فن تعمیر کا شاہکار قبرستان تھا--اگر باہر سے اتنا لاجواب ہے تو اندر سے کس قدر شاہکار ہوگا--مگر اس وقت اُسے اندر سے دیکھنا ممکن نہیں تھا، سو اس کے جائزے کو کسی آنے والے وقت کے لیے اٹھا کر رکھ دیا--!

صحرا کا ایک حصہ ختم ہوا--اب کار ریلی والوں کی خیمہ بستیاں آ گئیں--لوگوں نے غالباً ایسا قافلہ ایسے اہتمام سے صحرائے چولستان میں غالباً نہیں دیکھا تھا۔ اسی لئے چاروں طرف ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگنے لگے-- جو لوگ اپنے خیموں میں تھے یا کاموں میں مگن تھے، سب چھوڑ چھاڑ کر باہر نکل کر کھڑے ہو گئے--کوئی تصویریں بنانے لگا اور کوئی ویڈیوز اور کچھ لوگ یونہی اپنے قریب سے گزرتا دیکھ کر ستائشی تالیاں بے اختیار بجانے لگے--!

ہمارے اونٹ ایک مستانی اور گلی بندھی درمیانی رفتار سے ایک طویل قطار میں ہمک ہمک کر چلے جاتے تھے--ہمیں ستائش بھری نگاہوں سے دیکھنے والوں کے اظہار محبت کے انداز سے ہمارے اونٹ سواروں میں زندگی کی موج مستی کے رنگ لپک لپک کر سر اٹھاتے تھے--کوئی جوان دونوں بازو سیدھے کر کے، انگشت شہادت رقص کے انداز میں اٹھا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا اور کوئی والہانہ انداز میں اپنے جسم اور کمر کو یوں حرکت دیتا کہ اس کو اگر اونٹ سے گرنے کا خوف نہ ہوتا تو کجاوے پر بے خودی کے عالم میں کھڑا ہو کر رقص مستانہ، دیوانہ وار کرنے لگتا--!

اگر آپ کجاوے پر بیٹھ کر اپنے جسم کو خوف سے اکڑا لیں تو جب نیچے اترتے ہیں، تو جسم کی ہڈی ہڈی اور جوڑ جوڑ درد کے مارے بلبلا کر رکھ دیتا ہے۔ جن لوگوں نے ایسا کیا وہ رات بھر درد کی دوائیں کھاتے اور کراہتے رہے--قاعدہ یہ ہے کہ جب آپ اونٹ کے کجاوے یا عماری پر سفر کریں تو اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں--اونٹ جب چلتے ہوئے اپنے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہے تو ایک جھولا آگے کو آتا ہے اور دوسرا جھولا پیچھے کو جاتا ہے--گویا سوار کا جسم اس کے چلنے کے دوران ایک عجیب مشقت کے عالم میں ہوتا ہے--اگر آپ اپنے جسم اور اعصاب کو اونٹ کی چلتی اڑان کے سپرد کر دیں تو بڑا نشیلا قسم کا سرور ملنے لگتا ہے--!

میں اس وقت اسی سرور کے عالم میں تھا--میرے خیال میں اونٹ پر سفر کرنا، ایک رقص جسمانی کا عمل ہے۔ اس میں سنا ہے کہ موٹا آدمی یا عورت سب سے زیادہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ موٹا آدمی

صحرا میں گرتا پڑتا پیدل چل لے مگر اونٹ پر سفر نہ کرے۔ دانا لوگ اس کی ترکیب اور حل یہ بتاتے ہیں کہ موٹے آدمی یا عورت کو اونٹ کے کجاوے پر رسیوں سے کس کر باندھ دو، جب منزل پر پہنچو تو کھول دو۔ اس طرح وہ بہت کم تکلیف اٹھائے گا -- گو، جب بندھا ہوگا تو بددعائیں بھی دے گا اور اپنے موٹاپے کو بھی کوسے گا --!

مجھے لگا کہ میرے کجاوے میں کوئی کھٹمل پسو ہے جو کولہے پر کاٹتا ہے کہ بے چینی ہوتی ہے۔ میں بہت تلملایا مگر کسی کل چین نہیں آتا تھا -- پھر خیال آیا کہ وہ ضرور پالان کی گدی میں ہوگا اور اب کسی رستے سے پتلون میں گھس گیا ہے -- میں سچ کہوں کہ میں دنیا میں اگر کسی کیڑے سے خوف کھاتا ہوں تو وہ کھٹمل ہی ہے اور دوسری چیز لال بیگ ہے -- مگر اس حالت میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا -- پھر اچانک خیال آیا کہ یہ فقط ایک جگہ ہی کیوں کاٹ رہا ہے، متواتر حرکت سے متاثر ہو کر اپنی جگہ کیوں نہیں بدلتا -- اوہ، تب جا کر اندازہ ہوا کہ کھٹمل وٹمل کوئی نہیں ہے، کجاوے میں کوئی باریک سا کیل نکلا ہوا ہے، جو چبھے چلا جا رہا ہے -- اس احساس سے دل کو بہت سکون ہوا کہ منحوس مارا کھٹمل نہیں ہے --!

یہ سفر کم وبیش پچاس منٹ پر مشتمل تھا -- پچاس منٹ کیل میرے کولہے کو بے دردی سے چھیدتا رہا -- اور لطیفہ یہ کہ جب سفر تمام ہوا، اور میں نے نیچے اتر کر کجاوے اور پالان کا ٹٹول ٹٹول کر معائنہ کیا تو پالان کی گدی سے کشیدہ کاری کی سوئی دھاگے سمیت برآمد ہوئی -- میں کسی لاپرواہ خاتون کی لاپرواہی کا شکار ہوا تھا -- میں نے سوئی، دھاگے سمیت برآمد کر کے عبدالرحمٰن کے حوالے کی تو بولا --

"-- اوئے ہوئے، صاحب جی آپ کو چبھی تو نہیں، میری سالی کی ہے، جب میں گھر سے نکلا تو وہی اپنے شوہر کے تکیے کا غلاف کاڑھ رہی تھی --"!

باب ۲۹

میں چولستانی اونٹ پر صحرا میں جاتا ہوں، ایک ہم سفر دراوڑ میں گم ہو جاتا ہے۔۔!

منظر تیزی سے بدلیں یا آہستگی کے ساتھ، بس یہی زندگی کی علامت ہیں۔۔!

منظر اگر منجمد ہو جائیں تو طبیعت بے چین اور دل اُوب جاتا، بھر جاتا ہے۔۔!

سفر میں مناظر بہت تیزی سے بدلتے ہیں، ان کا یکے بعد دیگرے بدلنا اور پھر بدلنا، ہی سفر کی علامت اور روح ہے۔۔!

یہاں بھی سب کچھ لحہ بہ لحہ تیزی سے بدلتا جا تا ہے، ایک منظر ابھی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا اسے "اُوورلیپ" کر رہا ہوتا ہے۔۔ایک واقعہ تکمیل کو پہنچتا ہے کہ دوسرا واقعہ، منظر نامے میں اپنے انوکھے رنگ بھرنے لگتا ہے۔۔یہی وہ رنگ در رنگ، منظر در منظر اور واقعات در واقعہ ہیں کہ اپنی معصومانہ قدرتی کشش میں انسانوں کے خیالات اور احساسات کو لپیٹتے اور سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔۔تب خیال وسعت پاتے ہیں، تجربے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور ایک یادوں کا سرمایہ ڈھیر بن کر محفوظ ہو جاتا ہے جو بعض اجنبی وقتوں میں کام آتا ہے۔۔!

منظر یہاں بھی بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔۔!

سورج نیچے اترتے اترتے ہماری پشت کے وسط پر آ چکا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے ہر اونٹ کا سایہ مغرب سے مشرق کی صحرائی سپاٹ زمین پر گزوں لمبا بن رہا ہے -- ایک رخ تو ایسا آیا کہ اونٹوں کا قافلہ نظروں سے منہا ہو گیا، فقط قطار اندر قطار لمبے، چپٹے اونٹوں کے سائے ہی صحرائی سپاٹ زمین پر نگاہوں کا مرکز بن گئے -- لگتا تھا کہ سائے تو ہیں مگر سائے بنانے والے معلوم نہیں کون ہیں، کہاں ہیں -- !

ہر منظر ذرا سا رخ بدلنے پر اپنا انداز بدل لیتا تھا -- !

پھر یکایک ایک سڑک زمین پر ظاہر ہوئی، معلوم نہیں کدھر سے آتی تھی اور کدھر کو جاتی تھی -- وہ کوئی باقاعدہ سڑک نہ تھی، بس ایک سیدھا نشان تھا کہ سڑک کہلاتا تھا۔ بہت بڑی تعداد میں ہر قسم کی گاڑیاں اس پر ایک طویل قافلے کی صورت کسی سمت کو ایک دوسرے کی دم سے اپنا منہ جوڑے چلی جاتی تھیں -- سڑک ناپختہ مٹی کی ایک لکیر ہی تھی اور فرش صحرا کہ جس پر کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے بچاتے یہ شتر اپنی مہارت اور تجربے سے تیز تیز بڑھے جاتے تھے -- صاف لگتا تھا کہ ہمارے شتر قافلے نے کسی بھی مقام سے اس سڑک کو یکایک پار کرنا ہے -- یہ منظر اس وقت بہت دلچسپ لگا کہ گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں نے گرد کے اڑتے بے مہار طوفان کو نظر انداز کر کے اپنی اپنی کھڑکیاں کھول لیں اور دلچسپی اور حیرت کے ساتھ ہمارے قافلے کو دیکھنے اور تصویریں بنانے لگے -- !

ہمیں واقعی اس رواں دواں سڑک کو پار کرنا تھا -- پہلا اونٹ سڑک پر چڑھا تو ٹریفک خود بخود رُک گیا -- میں ایک ہاتھ سے کجاوہ اور دوسرے ہاتھ سے کیمرہ پکڑے بیٹھا ویڈیو بنا رہا تھا -- جب میرے اونٹ نے فرشِ زمین سے کوئی آٹھ دس فٹ اونچی سڑک کی ڈھلوان پر مٹک مٹک کر چڑھنا شروع کیا تو مجھے لگا کہ میں توازن کھو کر شاید گر ہی جاؤں گا، مگر شکر ہے کہ میرے راجہ کی چال مستانی اور متوازن تھی -- !

جب میرا اونٹ سڑک کے عین درمیان میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ صحرا کی مانگ نما لہراتی سڑک پر طرح طرح کی جیپوں، کاروں اور بسوں کے کھڑے ہونے کے منظر نے ایک بڑے احساساتی اور جذباتی نظارے کے تحیّر کو جنم دیا تھا -- جب تک ہمارا قافلہ سڑک پار کرتا رہا سب کچھ ساکت ہو گیا، بس ہم متحرک تھے۔ خوبصورت لمحہ جس میں وقار اور زندگی تھی -- !

ایک نئی وسعتِ صحرا نے سڑک سے اترنے کے بعد استقبال کیا -- کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری سفید کو سٹر ذرا فاصلے پر سڑک چھوڑ کر اتری اور اونٹوں کے قافلے کے متوازی چلنے لگی --

ہم صحرا میں اپنی کیمپنگ کی طرف جا رہے تھے -- !

کوسٹر ذرا پیچھے ہٹ گئی --- صحرا میں جو راستہ ساربانوں کو پتہ تھا، وہ بھلا ہمیں یا کوسٹر ڈرائیور خرم شہزاد کو کیوں کر معلوم ہو سکتا تھا۔

پھر ایک نئے صحرائی خطے میں قدم رکھا --- دور دور تک لق و دق صحرائے چولستان ہمیں دیکھ رہا تھا --!

یکا یک لگا کہ پھر منظر بدل رہا ہے --!

ایک سیاہ پراڈو دھول کے دبیز بادل اڑاتی، جھاڑیوں کی رکاوٹوں میں لہردار کٹ پر کٹ مارتی ہماری طرف بڑھی -- پاس آئی، خاتون ڈرائیور نے شیشہ نیچے کیا اور پراڈو سے کئی چہرے حیرت سے جھانکنے لگے اور تصویریں بننے لگیں --!

دیکھتے ہی دیکھتے چاروں اَن دیکھی اطراف سے کاریں، جیپیں اس رنگین اونٹوں کے قافلے کے گرد منڈلانے لگیں، حیرت سے دیکھتے لوگ، کبھی مسرت سے ہاتھ ہلاتے اور کبھی داد و تحسین میں تالیاں بجاتے --!

ایسی پذیرائی کی ہم میں سے کسی کو توقع نہیں تھی -- ان کی ستائش سے دل پُر مسرت ہوتا تھا -- سفر کی کلفتیں ہوا ہو گئی تھیں --!

لیجئے -- چولستان کے صحرا میں ہمارا کیمپنگ آ گیا تھا --!

کچھ رنگین خیمے ایستادہ ہو چکے تھے، کچھ ابھی زمین پر نڈھال کھلے پڑے تھے۔ آسمان پر موٹر سائیکل گلائیڈر پروازیں کر رہا تھا -- کرامت علی اور دوسرے لڑکے نیلا کچن ٹینٹ کھڑا کرنے میں مصروف تھے -- خواتین کے پُر زور مطالبے پر یحییٰ قیصر باتھ روم کم واش روم ٹینٹ، اپنے زیرِ تعمیر تمبو محلے سے ذرا باہر کو لگانے چل دیا۔ شور مچا کہ ابھی کھانا دو، وہی کھانا جو دوپہر دو بجے ملنا تھا -- تم لوگ یہ کس واہیات کام میں پڑ گئے، جس کو شوشو زور کا آ رہا ہے، وہ مہربانی کر کے روک لے -- پہلے کھانا لگے گا، پھر غسل خانہ لگے گا -- پھر باقی سب ہو گا -- مگر یحییٰ اور کرامت بھی تیز تھے، انھوں نے پہلے وہی تمبو لگایا کہ جس کی اشد ضرورت تھی --!

یحییٰ نے بیچ صحرا، سلنڈر گیس جلا، مرغ قورما پہلے تیار کر رکھا تھا -- فوراً صاف سی ریت پر چادریں بچھیں اور کھانا لگ گیا --

اُدھر آسمان پر، ہمارے سروں پر موٹر سائیکل گلائیڈر پروازیں بھر رہا تھا -- وجدان اور حیدر تو پورے پورے بے قرار ہو گئے -- کہنے لگے بس کھانا کھا کے چلتے ہیں وہاں، جہاں یہ اترتا ہے، ان سے کہتے ہیں، پیسے لو، آسمان سے چولستان کی سیر کرا دو --!

جونہی کھانا تمام ہوا، وجدان کی پشت پر لگی جال جنڈ کے کانٹے دار جھاڑیوں کی اوٹ میں بہت دیر سے بیٹھے چار چھوٹے بچے سامنے، ذرا ہٹ کر، آ کر کھڑے ہو گئے -- ایک بچے نے ہمت کی، میں پیپر پلیٹس سمیٹ رہا تھا -- وہ بچہ، جس کی عمر آٹھ دس برس ہو گی گھٹنوں کے بل اُکڑوں میرے پاس بیٹھ گیا اور آہستگی سے ڈرتے ڈرتے بولا --

"-- چاچا جی، جو کھانا بچ گیا ہے، ہم کھا لیں، بہت بھوک لگی ہے --"

اس کی آنکھوں میں التجا تھی اور ہونٹوں کے کناروں پر خوف یا بھوک کی کپکپاہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔

سب نے اس کی بات سن لی تھی -- سب بہ یک زبان بولے --" -- کیوں نہیں --"

محمود نے دستر خوان سے اور نان نکالے، رضوان نے کوکا کولا کی بوتل، وجدان نے اپنی پلیٹ میں رکھی بوٹیاں سب اُن بچوں کو دے دیں -- حیدر، عمر فرحان بھی کسی سے پیچھے نہ تھے جو سلاد رائتہ ان کے سامنے رکھا تھا، انھوں نے بچوں کو دے دیا -- بچے وہیں جال جنڈ کی جھاڑی کے پہلو میں بیٹھ گئے اور اس طرح کھایا کہ بھوک کا حق ادا کر دیا -- !

یکا یک خرم شکیب گھبرائے ہوئے آئے، سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور سوال کیا۔

"-- کیا آپ سب کو لگتا نہیں کہ ہماری ٹیم کا ایک ممبر گم شدہ اور لاپتہ ہے --"؟؟؟

"-- کون -- کون ہو سکتا ہے وہ --"؟؟؟

"-- وہی صاحب جو اونچے لمبے تھے، جنہوں نے سر پر استرا کرا رکھا تھا اور نیلی پی کیپ پہنی ہوئی تھی -- عمر سعید ان کا نام ہے، اسلام آباد کے ہیں وہ -- کسی کو یاد آیا --؟"

"-- اوہ، ہاں، مگر وہ تو نہ ہی اونٹوں کے قافلے میں ہمراہ تھے اور نہ ہی کوچ میں آئے --" میں نے فکر مندی سے کہا --" اب کیا ہو گا، کہاں ڈھونڈیں گے ہم ان کو -- اللہ کرے خیر خیریت سے ہوں --"

"-- میں کوچ لے کر جاتا ہوں، اندھیرا چھانے سے پہلے پہلے ان کو تلاش کرنا ضروری ہے، ورنہ بڑی مشکل ہو جائے گی --" خرم شکیب پریشان تھے اور ہم سب لوگ بھی یہ سن کر دم بخود رہ گئے۔

"-- جلدی جائیں آپ لوگ -- ساڑھے پانچ تک اندھیرا ہو جائے گا --" میں نے کہا" -- کہیں، تو ہم بھی چلیں آپ کے ساتھ --؟"

"-- فون کر لیں ناں --" کسی نے مشورہ دیا۔

"-- ان کے پاس وہ نیٹ ورک نہیں ہے جو یہاں کہیں کہیں چلتا ہے-- میں خود جا کر تلاش کرتا ہوں--"

کوچ اسٹارٹ ہوئی اور وہ عمر سعید کی تلاش میں قلعہ دراوڑ کی طرف نکل گئے۔

مستی اور خرمستیوں کا ایک نیا دور جاری تھا-- وجدان، حیدر اور فرحان اس سمت کو چل دیئے کہ جس سمت اور جگہ پر انھوں نے موٹر سائیکل گلائیڈرز زمین پر اترتے دیکھا تھا-- یہ مقام سیدھے صحرا میں کوئی ایک آدھ میل ہی دور تھا--

کھلے صحرا کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہاں کسی مقام تک جانے کے لیے سڑک کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، بس جہاں پہنچنا مقصود ہو، اس سمت میں چل دیجئے-- انھوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا-- اور بھی لڑکے جو گلائیڈر میں بیٹھ کر آسمان کی بلندیوں سے صحرائے چولستان دیکھنا چاہتے تھے، ان کے ساتھ ہو لیے۔

مجھے اپنے کیمپنگ کے صحرائی اطراف سے زیادہ دلچسپی تھی، سو میں وہیں رک گیا-- کوسٹر عمر سعید کی تلاش میں جانے سے پہلے اپنی سامان سے لبالب چھت سے سارا سامان اتار گئی تھی۔ پہلی دعا یہی تھی کہ مالک پاک اسے ملا دینا۔ وہ تو پچھلے تین چار گھنٹوں سے بہت پریشان حال ہوگا--

یہاں سے صحرائی وسعتیں بالکل سمندر کی طرح دور دور تک نظر آتی تھیں-- کہیں کہیں، دور دور کانٹے دار جھاڑیوں کے گھنے جھرمٹ بھی تھے-- جوں جوں دن ڈھل رہا تھا، لدی پھندی گاڑیوں کے ساتھ بے شمار موٹر سائیکل سوار بھی نظر آنے لگے تھے، کچھ کیمپنگ کے سامان سے لدے پھندے اور کچھ یونہی سیر سپاٹا کرتے ہوئے-- بڑی بڑی کیبن جیپوں میں من چلیوں کی ٹولیاں بھی تھیں کہ جوانی اور دیوانگی کے نشے میں سرشار تھیں؛ ہر کسی پر آوازیں کستی تھیں اور جنگل اُجاڑ کو انھوں نے اپنے حسنِ طرح دار سے منگل بنا رکھا تھا-- دور دور، ارد گرد بڑے بڑے شاہانہ ٹینٹ بھی لگ چکے تھے کہ ان میں بڑے بڑے ڈیک لگے تھے اور موسیقی کی آوازیں، کہ جب ہوا کا رخ ہماری سمت ہوتا، ہوا کے دوش پر لہریں لے کر آتیں تو بڑی عجیب سی لگتی تھیں-- بہت سی ایسی کاریں اور جیپیں بھی دیکھیں کہ جن میں لاجواب جوڑے، عافیت کے گوشے تلاش کرتے پھر رہے تھے-- میں ان کو اور ان کی بے قراریوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ یہ تو پاگل ہیں، ابھی کچھ ہی دیر میں جب صحرائے چولستان میں گھپ اندھیرا اتر آئے گا تو ہر ویرانہ گوشۂ عافیت بن جائے گا اور یہ تمام کاریں "ڈانسنگ کاروں" میں بدل جائیں گی--!

سورج کی تھالی، عین ہمارے مغرب میں آہستہ آہستہ زمین کی افقی سپاٹ حد کے برابر اترتی چلی آ رہی

تھی -- جوں جوں سورج سطح زمین کے قریب آتا جاتا تھا، اس کی تمازت کے کس بل ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے --
ایک قرمزی سرخ تھال زمین سے دو گز اوپر اپنی خوبصورتی کا نیا روپ اُجال رہا تھا -- اس صحرا میں اس کی قرمزی گلابی روشنی، شام کے ملگجے سایوں سے مل کر صحرا کے ماحول میں نامعلوم رومانس بکھیرنے لگی تھی -- !

وجدان پارٹی بھی گلائیڈر والوں سے ملاقات کر کے واپس آ گئی -- پوچھا، کچھ بتاؤ تم لوگوں کا، آسمان سے چولستان دیکھنے کی خواہش کا --؟

جواب میں جو کہانی بچوں نے سنائی، وہ کچھ یوں تھی -- ایک پانچ ہزار کی فلائیٹ صرف پانچ منٹ کے لیے ہے -- کوئی باپ بیٹا یہ گلائیڈر ٹرک پر لاد کر لائے ہیں، دوسرے ٹرک پر گھر کا سارا ساز و سامان بھی ہمراہ ہے۔ پیٹرول بھی کین کے کین ساتھ ہیں -- سب ایڈوانس بکنگ میں چل رہا ہے -- ایک لڑکا میز کرسی لگائے ایک تمبو میں پردھان منتری بنا بیٹھا ہے، جب کہ ہے وہ منشی -- پانچ ہزار لے کر ایک ٹکٹ دیتا ہے، جس پر پرواز کی تاریخ اور وقت لکھ دیتا ہے اور ساتھ میں اپنے رجسٹر میں بھی درج کر لیتا ہے -- سینکڑوں لوگ بکنگ کرانے کو اس کے سامنے قطار بنائے کھڑے ہیں -- پتہ چلا کہ اس وقت کل دوپہر کی بکنگ جاری ہے۔ اب سے کل دوپہر تک سب وقت بک ہو چکے ہیں -- ایک وقت میں ایک ڈرائیور اور ایک فضا میں اڑنے کا متوالا اس میں بیٹھ سکتے ہیں -- آپ نے تو اس کی تصاویر بھی بنائی ہیں --" وجدان بتا رہا تھا۔

"-- میں نے اس لئے تصویریں بنائیں کہ ہو سکتا ہے کہ عین اس وقت تم ہی اس گلائیڈر میں میرے سر کے آسمان میں سفر کر رہے ہو --" میں نے کہا۔

"-- نہیں ہم لوگ تو واپس آ گئے -- ہم سات لوگ تھے، کل پینتیس ہزار مانگ رہے تھے وہ --"

"-- یہ موٹر سائیکل کو گلائیڈر کیسے بنایا انہوں نے --" میں نے پوچھا۔

"-- وہ اس طرح کہ موٹر سائیکل سے سب آلتو فالتو چیزیں اتار کر تین پہیے لگا دیے ہیں، پشت پر ایک بہت بڑا پنکھا لوہے کے جال میں ہوا پیچھے پھینکنے کو لگایا ہے اور ڈوریوں کی مدد سے اعلیٰ قسم کی گلائیڈر چھتری لگائی ہے کہ جب موٹر سائیکل زمین پر دوڑتا ہے تو پیچھے والا پنکھا اس کی رفتار کو اور بھی تیز کر دیتا ہے اور ٹیک آف کے وقت اوپر فضا میں اٹھنے پر مدد کرتا ہے، بس اسی اثناء میں گلائیڈر چھتری فضا میں کھل کر اپنے اندر ہوا بھر لیتی ہے اور ڈوریوں سے اشارہ دینے پر فضا میں سب کچھ اڑاتی چلی جاتی ہے -- بس یہی اس کا فارمولا ہے --"

"-- تمہارا آسمان سے صحرائے چولستان دیکھنے کا خواب تو چکنا چور ہو گیا --" میں نے کہا۔

"-- ہاں، مگر اچھا ہوا -- بڑا مہنگا رسک ہے یہ اور بُرے وقت کا کس کو پتہ ہوتا ہے --" وجدان نے اعتماد سے کہا۔

"-- آئیں آغا صاحب --- سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں -- آئیں چلیں --"

"-- کہاں --؟" میں نے پوچھا۔

"-- قطار بن گئی ہے، آپ آئیں اور ہمارے درمیان میں کھڑے ہوں، ہم سب بہ یک وقت ہوا میں اچھلیں گے، جب ہم سب کے پاؤں فضا میں معلق ہوں گے تو وجدان لوگ تصویریں بنائیں گے، یہ ایک یادگار تصویر ہوگی -- کیا آپ اس کھیل میں ہمارا ساتھ دیں گے --"؟

"-- جی ضرور -- مگر آج تک میں نے نہ ایسی چھلانگ لگائی ہے اور نہ ایسی تصویر بنوائی ہے --" میں نے کہا۔

"-- تو آج تو ہو ہی جائے آغا صاحب -- آپ تو جوان جہان ہیں --" کوئی حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"-- نہیں -- نہیں -- میں ساٹھ کا پورا ہوں --" میں نے سچ کہہ دیا۔

"-- تو، پھر کیا ہوا -- آ جائیں -- ہو جائے اِن ایئر پکچر --!!!"

اور میں آ کر قطار کے عین درمیان میں احترام سے کھڑا کر دیا گیا -- سچ پوچھیے میں اس وقت دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرے دل کے اردگرد کوئی کلاٹ کسی جگہ موجود ہوا اور جھٹکے سے اچھل کر دل کے کسی نہاں خانے میں جا اترا تو سمجھو کہ آپ کا تو کھڑے کھڑے "تو لورام" ہو جائے گا -- مگر اس ڈرے دل کو دماغ نے کہا، حضرت صاحب آپ کے دل کا پچھلا ریکارڈ ابھی تک تو اے ون ہے، اللہ کا نام لیں اور لگائیں دو چار اونچی اونچی چھلانگیں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہی رہے گا --

دل کو جونہی عقل نے سمجھایا، وہ تیر کی طرح سیدھا ہو گیا --!

میں نے تین چار نہیں پوری، نو چھلانگیں لگائیں --- سب ٹھیک رہا -- یہ تصویریں میری زندگی کی ساٹھویں سال کی سب سے یادگار تصویریں ہیں --!

دور صحرا میں سفید کوسٹر، شام کے نارنجی سایوں میں دھول کے گول گول بادل سے اڑاتی ہماری طرف تیزی سے آ رہی تھی --

وہ آئی اور خیموں کی پشت پر اپنے پارکنگ ایریا میں ٹھہر گئی--!

عمر سعید سب سے پہلے کوچ سے نیچے اترے-- اس کے ہاتھ میں کنوؤں کا ایک بڑا سا تھیلہ تھا۔

"--سیلیبریشن--" سب جمع ہو کر خوشی سے چلائے۔

سب نے تالیاں بجا کر گم شدہ سیاح کا استقبال کیا اور گم شدہ سیاح نے جو جملہ کہا وہ سب سے پُر لطف تھا۔ میں سمجھتا ہوں اس سفر کا حاصل تھا۔

"-- مجھے تو چار گھنٹے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں گم ہو گیا ہوں یا میرے ساتھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے ہیں--"!!!

"-- میں نے آخری بار دوپہر کو آپ لوگوں کو مسجد کے سامنے اکٹھے دیکھا-- پھر یکا یک آپ سب لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے-- میں وہاں مسجد کے سامنے ہی تھا اور اپنے اردگرد کے رنگا رنگ کلچر میں ایسا کھویا کہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں دراوڑ کے قلعے کے آس پاس گم ہو چکا ہوں-- مجھے وقت گذرنے کا بھی احساس نہ ہوا-- اردگرد ایسے ایسے تماشے، طرح طرح کے لوگ اور بھانت بھانت کا ماحول ایک فلم کی طرح سین بدل بدل کر چل رہا تھا کہ میری محویت نے مجھے ایک انوکھی دنیا کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا-- پھر مجھے بھوک لگی؛ میں نے دوپہر کے کھانے کے لئے چولستانی تجی بنوائی-- خوب پیٹ بھر کے کھائی، مزے کی تھی وہ-- جب خوب کھا پی چکا تو کچھ تجی بچ گئی، اتنے میں دو لوگ آئے، کہنے لگے، یہ ہمیں دے دو، ہم نے کبھی یہ چیز نہیں کھائی، میں نے اور نان لیے اور وہ کھانا ان کو پیش کر دیا-- پھر وہیں گھومتا پھرتا رہا-- مجھے پھر بھی احساس نہ ہوا کہ میں گم شدہ ہوں-- پھر میرا دل چاہا کہ بہت سارے کینو کھاؤں-- ابھی میں چارپائی پر بیٹھا مزے لے لے کر کینو کھا رہا تھا کہ یہ لوگ آ گئے-- مجھے دیکھتے ہی چلائے-- وہ رہا عمر سعید-- مل گیا، مل گیا-- مجھے تب بھی نہ پتہ چلا کہ میں گم شدہ ہوں اور انہوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے-- مجھے تو آپ لوگوں کی پریشانی دیکھ کر معلوم ہوا ہے کہ میں گم ہو گیا تھا--"

باب ۳۰

راج ہنس کوسٹر کی چھت پر چونچیں لڑاتے ہیں،
ویران ریتیلے رستے، تاریک کھنڈر اور جگمگاتا قلعہ دراوڑ

راج ہنسوں کا جوڑا کوسٹر کی چھت پر چونچیں لڑا رہا تھا---!

ڈوبتے سورج کی نرم وملائم کرنیں سرخی مائل روشنی بکھیر رہی تھیں---!

رنگ برنگی خیمے، پہلو بہ پہلو کھڑے ہو چکے تھے۔ ان کے چمکتے رنگوں پر پڑتی شام کی ڈھلتی گلابی روشنی رومان انگیز تھی---!

صحرا کی وسعتوں میں دور دور اور فاصلے فاصلے سے لگے، کیمپوں میں کہیں کہیں روشنیوں کی رنگین لڑیاں آہستہ آہستہ، یکے بعد دیگرے روشن ہوتی چلی جا رہی تھیں---!

جوں جوں اندھیرا زمین سے آسمان کی طرف پھیل رہا تھا، توں توں آسمان کی بجائے صحرائے چولستان کے اس حد نگاہ علاقے میں چلتی بے لگام اور مادر پدر آزاد ٹریفک کی ہیڈ لائٹس جگنو بن کر چمکتی تھیں اور پھر کسی دور افتادہ سمت میں غائب ہو جاتیں یا ابھر آتی تھیں---یہ آنکھ مچولی اندھیرا ہوتے صحرا میں ایک انوکھا اور دلکش رنگ بھر رہی تھی---!

پھر اتنا اندھیرا چھا گیا کہ جو دُھندلے دُھندلے ہوئے نقوش اور انسانی سائے، افق کے اُس پار یونہی نظر آتے تھے، چولستانی صحرائی اندھیرے کی سیاہ چادر میں مستور ہو گئے--!

ہنسوں کا جوڑا، جو کوسٹر کی چھت پر دل کی باتوں میں سرِ شام سے بے خبر مصروف تھا، اندھیرے کی وجہ سے سیاہ آسمان کے پس منظر میں ایسے تحلیل ہو گیا کہ جیسے شب وصال میں سانس میں سانس اور بدن میں بدن جذب ہو جاتا ہے--اس منظر کو دیکھنے والوں کا قوی خیال تھا کہ طلوعِ سحر سے پہلے جب بادِ صبا خراماں خراماں چلے گی تو انجذاب کا عمل مکمل ہو جائے گا--!

ادھر جوں ہی رات کا گھنگھور اندھیرا چولستان کے صحرا کے آسمان پر اپنے پورے پَر پھیلا کے ہر سمت کو چڑھا، مغرب کی طرف آسمان پر مہتابیاں بلند ہوتی نظر آنے لگیں--جو اس بات کی علامت تھی کہ جشنِ دراوڑ اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ شروع ہوا چاہتا ہے--

یہاں سے قلعہ دراوڑ کا نام ونشان بھی نظر نہیں آتا تھا مگر سیاہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں، رنگین شعلے، ستارے بناتی مہتابیاں اور آسمان کو درخشاں کرتی آتش بازی صاف نظر آتی تھی--!

ادھر ہماری کیمپنگ میں اپنا اپنا سامان، اپنے منتخب پسندیدہ تمبوؤں میں رکھا جا رہا تھا--جنریٹر بھی لگ گیا تھا اور ایک دس فٹ کا بانس زمین میں گاڑ کر اس پر ایک سفید روشنی کا بلب جلا دیا گیا تھا، جس کی روشنی میں چاروں طرف گول دائرے میں ایستادہ کیمپنگ ہٹس عجیب بہار دینے لگے تھے--بلب کے عین نیچے تکے کبابوں کی انگیٹھی میں کوئلے سلگائے جا رہے تھے--مصالحہ لگی مرغی کے گوشت کے پتیلے، سلادیں اور دوسرے لوازمات یحییٰ، چینگ اور کرامت علی ایسے سلیقے قرینے سے سجا رہے تھے کہ خواہ مخواہ ابھی سے رال ٹپکتی تھی--!

شام کے سات بجنے کو ہو رہے تھے--اندھیرا ایسا تھا کہ اگر بلب روشن نہ ہوتا تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا--مگر اللہ بھلا کرے انتظامات ایسے تھے کہ جنگل میں منگل کا سماں دل مسرور کرتا تھا--!

طے یہ پایا کہ پہلے قلعہ دراوڑ چلتے ہیں اور چل کر جشنِ قلعہ دراوڑ کو دیکھتے ہیں، آتش بازی کے وہ مظاہرے دیکھتے ہیں جو قلعہ دراوڑ کی فلک بوس فصیلوں سے فضائے بسیط میں کئے جا رہے ہیں--پھر دس گیارہ بجے رات واپس آ کر چکن تکوں سے پیٹ کی پوجا کے ساتھ ساتھ خیموں کے وسط میں بُون فائر روشن کر کے رات کے دوسرے پہر تک ہم اپنا جشنِ شب چولستان مناتے ہیں--!

کسی نے کہا کہ بھائیو، جلدی چلو، صبح مجھے ایک فوجی جوان نے بتایا تھا کہ آتش بازی کا مظاہرہ آٹھ بجے

شروع ہو کر ساڑھے نو بجے رات ختم ہو جائے گا--کسی دوسرے نے اپنی معلومات اس بارے میں کچھ یوں بیان کی کہ دراوڑ موسیقی فیسٹول کے اختتام پر رات نو بجے آتش بازی شروع ہوگی جو رات گیارہ تک جاری رہے گی--مگر میرا خیال یہ تھا کہ میوزک فیسٹول اور آتش بازی ایک ساتھ ہی شروع ہوں گے اور ایک ساتھ ہی اختتام کو پہنچیں گے--!

مجھے اور وجدان کو فقط ایک فکر تھی--کہ ہم رات کے عالم میں قلعہ دراوڑ کے در و دیوار کی ایسی روشن اور نایاب تصویریں بنانے میں کامیاب ہو جائیں کہ جو اپنی خوبصورتی میں لاجواب ہوں---ہمارا یہ بھی خواب تھا کہ ہم بروقت کسی ایسے ٹیلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں کہ جہاں سے رات میں قلعہ دراوڑ کی سرخ اور زردی مائل نارنجی فصیلیں دورنگی سن گنز کی زرد رُو روشنیوں سے روشن ہوں--!

چولستان کے اس سفر میں شاید ہمارے خواب اور خواہشیں عام سیاحوں اور سیر کرنے والے لوگوں سے قطعی مختلف تھیں--ہم نایاب تصویروں کی تلاش میں بھی یہاں آئے تھے:نور محل میں دن اور رات کی تصویریں،قلعہ دراوڑ کی فصیلوں کی تصویریں،کار ریلی میں دوڑتی اور اپنے پہیوں سے اندھا دھند دُھول اڑاتی جیپوں کاروں کی تصویریں،صحرا میں ڈوبتے سورج کے قرمزی گیند کو ہاتھوں پر اٹھا کر تصویریں--اور رات کے پچھلے پہر چولستان کے آسمان میں ملکی ویز کی نایاب تصویریں--میں جانتا تھا کہ ان میں سے کچھ خواب پورے ہو جائیں گے اور کچھ ادھورے رہ جائیں گے--کون سے خواب پورے ہونے ہیں اور کون سے والے خواب،خواب ہی رہ جانے ہیں،یہ سوائے قدرت کے،کسی کو معلوم نہیں تھا--!

ایک اژدہام بے پناہ سڑک پر موجزن تھا--دوسرے سڑک نام کی کوئی شے نہیں تھی۔بس ایک بھربھری مٹی کی لکیر زمین پر تھی کہ اسی پر ٹریفک چلا جاتا تھا--اتنا رش تھا کہ گاڑیوں کا کھوے سے کھوا چھلتا تھا--جگہ جگہ پولیس کے ٹریفک ناکے تھے۔انھوں نے ٹریفک کے رخ اپنے پلان کے مطابق بنا رکھے تھے--ہم بھی اس گاڑیوں کے سیلاب میں منہ اٹھائے بہے جاتے تھے--دھول اس قدر اڑتی تھی کہ کوسٹر کی ہیڈ لائٹس اس ڈھول کی دبیز تہہ کو پھاڑنے میں ناکام نظر آتی تھی--ٹریفک والوں نے ہمیں کہیں دائیں طرف کی پگڈنڈی پر ڈال دیا تھا--قلعہ دراوڑ اب ہمارے بائیں طرف کسی جگہ تھا--اندھیرے اور دھول کے بادلوں میں کچھ بھائی نہ دیتا تھا--ہاں جب بھی قلعہ دراوڑ کی اونچی فصیلوں پر آتش بازی کا مظاہرہ زور پکڑتا تو احساس ہوتا کہ ہم کہیں بہت دور اس کی شمالی سمت سے گذر رہے ہیں--رفتار اس قدر کم اور مری مری تھی کہ لگتا نہیں تھا کہ ہم بروقت قلعے کے مرکزی دروازے تک پہنچ

پائیں گے--گاڑیاں چلانے والوں کا یہ حال تھا کہ جہاں سینگ سماتے تھے، اپنی گاڑی گھسا دیتے تھے۔اُن کو اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ اُن کی اس غیر فطری حرکت سے ٹریفک بُری طرح جام ہو جائے گا--ہماری گاڑی سمیت ہر گاڑی چیونٹی کی رفتار میں چلتی تھی--وقت تیزی سے گذرتا جا رہا تھا--پولیس اور فوجی جوان ڈرائیوروں کی بے ترتیبی روکنے میں قطعی بے بس ہو گئے تھے--ہر ڈرائیور یہ چاہتا تھا کہ وہ نکل جائے، باقی دوسروں کے پھنس جانے سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، حالانکہ وہ خود اور پھنس جاتا تھا--یہاں تک کہ ٹریفک سو فیصد جام ہو کر کھڑا ہو گیا--لوگوں نے اپنی گاڑیوں کو اس بے بسی کے عالم میں انجن آف کر کے جہاں تھیں، وہیں کھڑا کر دیا--اس لیے کہ پہلا پیٹرول اسٹیشن ۳۸ کلومیٹر دور احمد پور شرقیہ میں تھا--!

صاف لگتا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو ہم لوگ صدیوں میں بھی قلعہ دراوڑ کے پہلو میں نہ پہنچ پائیں گے--اس وقت ہم اندازاً قلعہ دراوڑ کے شمال مغرب میں کہیں میلوں دور گذرتی سڑک پر تھے اور ہمیں قلعے کی جنوب مشرق دیوار کے سنگم پر، جنوب کے نامعلوم راستے سے ہو کر پہنچنا تھا--اس مایوس کن صورت حال کو دیکھ کر باہمی فیصلہ یہ ہوا کہ کوچ کو دونوں خرموں (خرم شکیب اور خرم شہزاد) کے حوالے کر کے اور ان خواتین کو بھی کوچ میں چھوڑ کر پیدل نکلا جائے، جو طویل ٹریکنگ سے قطعی ناآشنا ہیں--

بہ ظاہر یہ فیصلہ خاصہ مشکل اور ہمت طلب تھا، مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ بروقت اور بالکل درست تھا--باہمت نوجوانوں نے میرے سمیت اپنی اپنی پانی کی بوتلیں ساتھ لیں اور پیدل چل نکلے--وجدان نے اپنے بھاری کیمرے کو گلے میں ڈالا اور ٹرائی پوڈ کو کندھے پر لادا؛ سب نے نیچے اتر کر ایک طویل قطار ترتیب دی اور طے کر لیا کہ یہ بارہ تیرہ مَن چلے اپنی قطار کو فالو کریں گے، کیونکہ اس وقت یہاں کوئی کھو گیا تو سمجھو پھر کھو ہی گیا--!

پہلے سڑک کے درمیان کھڑی اور ابھی گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتے چلتے رہے--پھر ایک فوجی سپاہی سے رہنمائی لی تو اس نے مشورہ دیا کہ نیچے جنگل میں اتر جاؤ، شارٹ کٹ تو ہے مگر کانٹے دار جھاڑیاں بہت ہیں، بچ کے چلنا ادھر سانپ بچھو بھی ہوتے ہیں--!

ٹیم نے فیصلہ یہی کیا کہ جنگل کے رستے چلتے ہیں، سانپ بچھوؤں کو تو نبٹ لیں گے مگر اندھیرے گھپ میں کانٹوں سے بچ کر چلنا ہے--!

تقریباً سب نے اپنے اپنے موبائل فونز کی ٹارچوں کے جگنو روشن کر دیے--نامعلوم راستے کے دونوں طرف کیکر، ببول اور جال جنڈ کی طرح بے طرح پھیلی ہوئی جھاڑیاں، دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔سانپ جھاڑیوں

کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم لوگ تیز تیز چلے جاتے تھے-- جال جنڈ کے زہریلے کانٹے ایک سے دو انچ تک لمبے اور نوک دار تھے۔ اس کی شاخوں کے جنجال ہر لمحہ چہرے اور جسم کا راستہ روکتے تھے--خوف یہی تھا کہ کانٹے دار شاخ چہرے یا آنکھوں کو نقصان نہ پہنچا دے، ہر شخص نے اپنے چہروں پر ہاتھوں بازوؤں کی چھایا سے اسے محفوظ کر رکھا تھا مگر ہم جواں مردی کے ساتھ اس جھاڑ جھنکار کو عبور کرتے چلے جاتے تھے۔

مجھے لگا کہ میرے جوتے کے سول میں کوئی کانٹا پھنس گیا ہے جو ڈگر جوتے کا ایک انچ موٹا سول پھاڑ کر تلوے سے چوما چاٹی کرنا چاہتا ہے--میں وہیں رک گیا، جوتا اتارا، حیدر نے روشنی ڈالی اور ڈیڑھ انچ کا کانٹا بڑی مشکل سے کھینچ کر نکالا تو پاؤں کو سکون ملا--تقریباً سب کے ساتھ یہ حال تھا، مگر ہمتیں جوان، ارادہ پختہ تھا، سو بہت تیزی سے بڑھتے جاتے تھے--سڑک کہیں دور جگمگا رہی تھی--دراوڑ کی بُرجیاں کبھی کبھی جھلک دکھاتی تھیں، جب قلعے کی فصیلوں سے آتش بازی فضا میں چھوڑی جاتی تو سمت کا اندازہ ہوتا تھا--لگتا تھا کہ چھ سات کلومیٹر کا فاصلہ منزل تک لازمی ہے۔

جنگل کے ایک نامعلوم کنارے پر آئے تو دور بہت دور قلعہ دراوڑ کی روشنیوں سے نہائی چمکتی فصیل کے دور افتادہ آثار نظر آنے سے لگے--قافلے نے اپنا رخ بدلا اور قلعے کی فصیل کی سمت کو کر دیا--

کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ہم لوگ مغربی فصیل کی طرف بڑھ رہے ہیں یا جنوبی فصیل کی طرف۔ بنیادی طور پر ہمیں جنوبی فصیل تک آنا تھا--راستے میں نئی تبدیلیاں آنے لگی تھیں--کانٹے دار جھاڑیاں تو کم ہو گئی تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ ہم قدیم، تباہ حال عمارتوں کے کھنڈرات میں سے یا ان کے اوپر سے گذر رہے ہیں--جب آنکھیں کچھ دیکھنے، عقل کچھ سمجھنے کے لائق ہوئی تو اندازہ درست ثابت ہوا--یہ قلعہ دراوڑ کا موجوداڑو تھا--قلعہ کے گرد کی یہ بستیاں مکانات جو صدیوں پہلے کھنڈر بن کر زمین بوس ہو چکے تھے--کبھی ان بستیوں میں مکین بستے ہوں گے، گلیاں اور آباد مکان محلے ہوں گے--آج سب کچھ ملبے کا ڈھیر تھا--ہم ان ملبہ مکانوں کی چھتوں کو الانگتے پھلانگتے قلعے کی روشن دیوار کی طرف بڑھ رہے تھے--ملبہ ہی ملبہ بکھرا ہونے کے سبب کوئی راستہ نہیں تھا، صرف ایک اندازہ تھا اور شہر خاموشاں کا سناٹا اور خوف تھا--کسی کسی جگہ پر ہمارے قدموں کی دھمک یا آہٹ سے ڈر کر کوئی بلی یا نامعلوم جانور اپنی کمین گاہ سے گھبرا کے نکل بھاگتا تو آسیب کی موجودگی کا خواہ مخواہ گمان ہوتا تھا--!

کوئی بولا"--یہ کالی بلیاں ہمارے راستے کیوں کاٹتی ہیں--؟"

"--چپ کرو بچے، یہ بلائیں ہیں، بلیاں نہیں--چپ کر کے تیز چلو--"

"--یار مجھے تو ڈر لگ رہا ہے--" کوئی منمناتی خوف زدہ سی آواز آئی۔

"--ڈرتا کیوں ہے یار، حوصلہ کر حوصلہ--"

"--ابے تو وہی ہے ناں جو یونیورسٹی میں موٹی کالی بلی پر عاشق تھا، اس سے تو تجھے کوئی ڈر ور نہیں لگا تھا--"

"--ابے، چپ کر، پرانے بھانڈے کیوں پھوڑتا ہے--زیادہ چڑ چڑ کی تو میں بھی بلو رانی کی سٹوری سنا دوں گا--"

دھمکی کارگر رہی اور خاموشی چھا گئی۔

اونچے نیچے راستے تھے، کبھی گہرائی کبھی چڑھائی، کہیں جھاڑیاں کہیں کانٹے--سامنے قلعے کی فصیل بڑی بڑی سن گنوں سے جگمگا رہی تھی--فصیل سے کوئی پچاس گز میدانی ملبے پر مخصوص فاصلوں پر بڑی بڑی ہیوی لائٹس لگائی گئی تھیں، جن کی روشنی میں فصیلِ قلعہ دراوڑ سر سے پیر تک روشن تھی--ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم لوگ عین قلعے کی دیوار کے نیچے جڑ میں مشرق کی طرف بڑھیں گے۔ یہ درست تھا کہ یہ سارا راستہ بھی ملبے سے بھرا ہوا تھا مگر موجودہ حالات میں بڑی تکلیف کے مقابلے میں چھوٹی تکلیف بہتر تھی--

یاد رہے کہ ہماری ٹیم مغربی دیوار کے وسط میں آ کر زیرِ فصیل آئی تھی--ابھی بہت چلنا تھا--ملبے کی وجہ سے جو فصیل کی دیواروں سے ٹوٹ اور جھڑ کر نیچے گرا تھا، جس کو ہم دوپہر میں دیکھ چکے تھے--اس پر پیدل چلنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ مقامی موٹر سائیکل سوار ایک نہیں تین تین لوگ بٹھائے اس ناہموار ملبے پر گرتے پڑتے اپنی موٹر سائیکلیں بلاوجہ دوڑائے جاتے تھے--!

مجھے لگا کہ یہ سب یقینی طور پر ذہنی مریض ہیں--مجھے اپنی رائے پر کوئی شک نہیں تھا۔

وجدان کی رائے تھی کہ یہ سب سائیکو مالیخولیا کے مریض ہیں۔

چینگ کا خیال تھا کہ یہ سب ذہنی معذوری کا شکار ہیں۔

ارشد عالم خان کے مطابق ان کی نفسیاتی ذہنی حالت نازک تھی اور وہ عقلاً پاگل تھے--!

جاذب بابر نے ان کو اچھائی برائی کی تمیز سے عاری نفسیاتی مریض قرار دیا تھا--!

بالکل ایسے لگتا تھا کہ یہ دیوانے شترِ بے مہار ہو کر کسی پاگل خانے کی دیوار ٹوٹ کر گر جانے سے آزاد ہو گئے ہیں اور اخلاقی طور پر پسماندگی کی انتہا پر ہیں کہ ان کو اچھے بُرے اور زندگی موت کی تمیز کا بھی احساس نہیں

ہے-- نہ ان کو کوئی پوچھنے والا تھا اور نہ کسی کی وہ سننے والے تھے-- جن لوگوں کی نظر میں اپنی زندگی سے پیار کا احساس نہیں پایا جاتا، اُن سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی کو بچائیں گے--!

رات کی تاریکی، روشنیوں کے پس منظر میں، بڑی خاموش اور بھیانک نظر آتی تھی۔

ہمارا قافلہ آخر کار مشرقی دیوار کے سرے پر آ گیا-- وہاں روشنیوں کا شہر جگ مگ جگمگ کر رہا تھا-- سامنے قلعہ دراوڑ کے وسیع وعریض دروازے کے عین آگے، بہت اونچا اسٹیج اپنی بہار کے جوبن پر تھا--- وہاں لوک رقص سرائیکی موسیقی کے پس منظر میں جاری تھا۔ ہمیں کنسرٹ فیسٹیول میں نہیں جانا تھا-- ہم نے اتفاق رائے سے پھر اپنا رستہ بدلا اور جنوب کی سمت کھنڈرات کی گہرائیاں اور اونچی رکاوٹیں عبور کرتے مٹی کے قدرتی اونچے ٹیلوں پر ٹامک ٹوئیاں مارتے، رستہ بناتے، اونچے نیچے قدم اٹھاتے کسی اونچے ٹیلے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے-- اور آخر ایک سب سے اونچے ٹیلے پر جا کر سب رک گئے-- وجدان نے رک کر اپنے کندھے سے کیمرے کا اسٹینڈ نکالا، بڑی مشکل سے ایک محفوظ مقام پر اسے لگا کر اپنا کیمرہ فٹ کر دیا--!

وہاں اتنی جگہ تھی کہ ہماری تمام ٹیم کے ممبرز وجدان کو گھیرے میں لے کر کھڑے ہو گئے، کیونکہ جب دیوانوں نے ہمیں وہاں موجود پایا تو اسی ٹیلے کا رخ کرنا شروع کر دیا مگر ہم لوگوں کی تعداد اور جوانوں کے مضبوط ڈولے دیکھ کر خاموشی سے کھسک لئے--!

بس یہ آخری مناظر قلعہ دراوڑ فیسٹیول کے چل رہے تھے-- وہیب ٹی وی کی بھونڈی سی میک اپ زدہ لڑکی سرائیکی میں کچھ ایسے لب لہجے میں جیو ٹی وی کے لیے کمپیئرنگ کر رہی تھی کہ اس کی مکروہ آواز سن کر خوامخواہ متلی سی ہوتی تھی--

آسمان پر بے شمار ٹی وی چینلز کے ڈرون محو پرواز تھے۔ ان کی پُر سکون مختلف سمتوں میں پروازیں سیاہ تاریک آسمان کو خوبصورت بنا رہی تھیں-- شمالی دیوار فصیل کی پشت سے آسمان پر سفید روشنی نور کی طرح اپنی ملکوتی سفیدی آسمان پر دھیرے دھیرے اُبھار رہی تھی، لگتا تھا کہ فصیل کے پیچھے چاند ہے کہ ابھی چند منٹ میں اپنا سراپا نکال لے گا۔ قلعے کے اوپر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آتش بازی کا آخری راؤنڈ چلا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اُدھر اس کے ساتھ ہی دراوڑ میوزک فیسٹیول بھی اپنے اختتام کو پہنچا-- ہزاروں کرسیاں منٹوں میں خالی ہو گئیں--

لیجئے صاحب دراوڑ میوزک فیسٹیول ہمارے پہنچتے ہی اختتام کو پہنچ گیا۔

اُدھر اس ٹیلے پر کہ جہاں وجدان تصویریں بنا رہا تھا، سردی کے مارے کھڑا ہونا بھی محال ہوتا جا رہا

تھا -- مگر ہم کھڑے تھے -- اس لیے کہ مسٹر چینگ اور پٹھان ارشاد عالم ہمیں رکنے کا کہہ کر کسی اور گم شدہ کی تلاش میں نکل گئے تھے --!

میں کھڑے ہو ہو کر اتنا تھک گیا تھا کہ سردی اور سرد ہوا کے تھپیڑے بدن توڑے دے رہے تھے۔ جاذب بابر اور صبا اشرف ایک مٹی کی تنگ سی اونچی ٹی پر بیٹھے تھے، اللہ اُن کا بھلا کرے کہ انھوں نے میری بے چینی کو بھانپ کر تھوڑی سی جگہ میرے بیٹھنے کو نکالی تو کچھ سکون کا احساس جسم کو ہوا --!

صبا اشرف فقط ایک لڑکی تھی کہ اس مہم میں جاذب بابر کے ساتھ شامل ہوئی تھی --!

خدا خدا کر کے پٹھان بچہ اور چینگ کسی پچھلی سمت سے اوپر پہنچے -- وہ یہ خبر تلاش کر کے لائے تھے کہ ہماری کوسٹر ابھی تک ٹریفک کے اژدہام میں پھنسی ہوئی میلوں دور کہیں چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہے -- اور حل اس معاملے کا یہ نکالا گیا ہے کہ سب لوگ چل کر مسجد کے سامنے کسی چائے خانے کے تھڑے پر بیٹھتے ہیں اور وہاں چائے کے ساتھ انتظار کے مرحلے سے گزرتے ہیں --!

ٹیلے کے پچھواڑے سے راستہ تلاش کرتے ایک اور موہنجوداڑو میں اترے -- خاموشی، تاریکی اور سینکڑوں سال کی بربادبستی کی ایک تنگ و تاریک گلی سے گزرتے خوف کی لہریں خصوصاً اس وقت ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی تھیں کہ جب دائیں بائیں ویران، تباہ حال مکانوں میں سے چمکتی آنکھوں والے نامعلوم جانور گردنیں نکال نکال کر جھانکتے تھے -- میں اور وجدان ٹیم کی قطار میں سب سے پیچھے چل رہے تھے، عین اس وقت ڈر کر سہم گئے کہ جب ایک ویران، تاریک مکان میں کچھ بلیاں خوفناک آوازوں کے ساتھ آپس میں لڑ رہی تھیں اور لڑتے لڑتے یکا یک مکان سے نکلیں اور کوندے کی طرح ہمارے سامنے سے گزر کر دائیں والے ٹوٹے کھنڈر میں جا کر پھر سے خوفناک آوازوں کے ساتھ لڑنے لگیں --!

میرے دل نے کہا -- سلمان صاحب -- مانو یا نہ مانو -- دراوڑ کے کھنڈروں کے آسیب اور چڑیلیں کالی بلیوں کا روپ دھار کر، رستہ کاٹ کر گزری ہیں -- پرانے زمانوں کے سیانوں اور بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو کوئی نہ کوئی مصیبت، آفت آیا کرتی ہے -- میں نے دل ہی دل میں سوچا، باہر نکل کر صدقہ خیرات کرتے ہیں، اللہ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے --!

وجدان بولا -- بابا، کالی بلیوں نے رستہ کاٹا ہے، ان کی آنکھیں بلبوں کی طرح چمک رہی تھیں، آپ نے دیکھا --؟"

"--ہاں، مگر فکر کی کوئی بات نہیں--اللہ وارث ہے--"!!!

"--بابا، میں نے سنا ہے کہ قلعہ دراوڑ کے اندر اور باہر کے کھنڈرات میں جنات صدیوں سے رہتے ہیں--کیا یہ بات درست ہے--کیا یہ بلیاں بھی آسیب تھیں--؟"

"--ابھی کچھ مت بولو--کچھ نہ سوچو--دیکھو سامنے مسجد نظر آ رہی ہے، ہم اس کے زیرِ سایہ ہیں، وہاں حضرت محبت شاہ بخاریؒ پڑے سوتے ہیں، ان کی موجودگی میں کوئی خوف نہیں ہے--وہ بھی شاہ دو جہاںؐ کے چاہنے والے ہیں اور ہم بھی--ڈر کیسا--"!

غرض، قصہ مختصر یہ آسیب زدہ بغلی گلی، آثارِ قدیمہ سے نکل کر مسجد کے سامنے تکونے چوک پر آ کر نکلی--بس، گلی کا موڑ مڑنا تھا کہ رونق، میلے ایسے لگے تھے کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا--مسجد رنگین اور سفید روشنیوں سے بقعۂ نور بنی کھڑی تھی--لوگوں کے رش اور ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس عارضی بازار میں لگے کھڑے تھے--میلے کا ایسا سماں تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عین اس ہنستے بستے بازار کی پشت پر ایسا موئنجوداڑو موجود ہے کہ جس میں تاریکی رقص کر رہی ہے اور بھوت پریت آسیب کالی بلیوں کے روپ دھار کر اپنے خون آشام پنجے نکالے لڑتے پھر رہے ہیں--!!!

باب ۳۱

اُس رات چُولستان حالتِ جشن میں تھا، سردی، انتظار، بھوک اور پھر پیدل سفر--!

یہ وہی جگہ تھی کہ جہاں دوپہر کو عمر سعید گم ہو گیا تھا اور اس کو چار گھنٹے میں بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ گم شدہ سیاح ہے--جو رونقیں دوپہر میں یہاں لگی تھیں، وہی سماں اب بھی تھا--بس صرف فرق روشنی کا تھا۔ اُس وقت یہاں سورج روشنی بکھیرتا تھا اور اب یہاں بلب روشنی کے چھوٹے بڑے ہنڈولے ہیں--گرد اس وقت بھی اڑتی تھی اور اب بھی اُسی طرح اڑتی ہے--پھیری والے تب بھی گاہکوں کو جو بھی ان کے پاس تھا، بیچتے تھے اور اب بھی دھڑا دھڑ بیچتے ہیں--رنگین مرچوں کی روشن لڑیاں مسجد کے میناروں، گنبدوں پر جگمگا رہی تھیں--قلعے کی حفاظتی دیوار اور دروازے پر بجلی کی رنگ برنگی مرچیں ٹم ٹم جلتی بجھتی تھیں--!

یہی جشن دراوڑ تھا--!

بڑی مشکل سے ایک عارضی چائے خانے میں بیٹھنے کی جگہ ملی--اس کے پاس اپنے معزز گاہکوں کو بٹھانے کے لیے جو بہترین فرنیچر کا اثاثہ تھا، وہ کچھ یوں تھا: پانچ کرسیاں وہ کہ جن پر کسی شادی میں براتیوں کو بٹھایا جاتا ہے، تین لکڑی کے پھٹوں سے بنے لمبے بنچ، دو عدد اینٹوں کو جوڑ کر بنائے گئے نُرجی پیڑھے، جن پر روئی کی میلی

گدیاں رکھ کر انھیں آرام دہ بنایا گیا تھا اور دو عدد وسیع و عریض رنگین پایوں والے گھریلو مَنجے، جو شاید چائے فروش کی بہو بیگم اپنی جہیز میں شب زفاف عزت سے گزارنے کے لیے لائی ہوگی--!

ایک لمبے بینچ پر گیس کا چولھا دھرا تھا۔ ساتھ میں چائے، پتی سے کشید کرنے کے لیے ایک گھریلو سی پتیلی رکھی تھی، باقی بینچ پر چائے کی پتی کا کھلا ڈبہ، ساتھ میں ایک اور برتن میں کھلا دودھ، جس کے بارے میں ہم سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ ہو ناں ہو یہ کسی اونٹنی کا دودھ ہے-- بہت سی مختلف ڈیزائن کی پیالیاں مگے پڑے تھے کہ جن کا چائے فروشی کے لیے ہونا لازم و ملزوم تھا--!

ایلومینیم کی پتیلیوں میں چائے بنتے دیکھ کر میری طبیعت مالش سی کرنے لگی، مگر جب صحرائی ہوا کے سرد ترین جھونکے نے آ کر بدن کو جھنجوڑا تو میرا ارادہ جو چائے نوشی سے راہِ فرار اختیار کر رہا تھا، شرافت کے ساتھ اس شرط پر چائے نوشی پر آمادہ ہو گیا کہ آنکھیں بند کر کے بطور دوائی پی لوں گا اور کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہونے دوں گا کہ بندہ حقیر فقیر، بر سرِ عام یہ تبلیغ کرتا پھرتا ہے کہ ایلومینیم کے برتنوں میں رکھا ہوا اور پکا ہوا، انسانی صحت اور جسم کے لیے زہر قاتل ہے-- اس دھات میں کھانے سے جسم میں موجود انفکشن کبھی شفا نہیں پاتے جو کچھ مدت بعد کینسر میں تبدیل ہو جاتا ہے-- ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یاد آیا کہ میں تو کسی جراثیمی بیماری کا شکار نہیں ہوں-- سو مجھے یہ ایلومینیم چائے چپ کر کے پی جانی چاہیے، کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ میں اس دھات کے مضر اثرات سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ شراب اگر مفت کی ہو تو قاضی صاحب قبلہ پر بھی حلال شمار ہوتی ہے، یہ تو پھر اونٹنی کے صحت مند دودھ کی چائے ہے، اس کے حلال ہونے میں تو کوئی شک و شبہ ہی نہیں ہے-- اور زندگی میں ایک بار ایلومینیم کے برتن میں تیار کردہ چائے پینے سے کون سی قیامت آ جائے گی--!

اتنے پے در پے حوالہ جات اور وزنی دلائل کے بعد میں نے اس گرم گرم چائے کو عین صحت مند اور خوش ذائقہ قرار دے دیا-- پھر یہ بھی یاد آیا کہ چولستان صحرائی اونٹنی کا دودھ، امراض جگر و معدہ کے لیے تمام حکیم لوگ شافی بتاتے ہیں--!

عمر سعید بھائی بھی یہ سارے غذائی نظارے دوپہر سے اب تک کر رہے تھے، سو فکر مند تھے-- کہنے لگے-- ان چھوٹی پیالیوں میں چائے پینا خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ ساتھ کے واحد جنرل اسٹور پر گئے اور خوش خوش واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں ڈسپوزایبل گلاسوں کی پوری ایک سوٹ تھی-- ہمارے ایک ساتھی نے یہ کہہ کر اس صحت مند اور محفوظ گلاس میں چائے پینے سے یوں انکار کر دیا کہ جو چائے پینے کا مزا ہینڈل والے مگ میں ہے، وہ

اس کاغذ کے گلاس میں نہیں آتا--!

اوہ، ہاں یاد آیا--میں آپ کو بتاتا چلوں کہ قلعہ دراوڑ کے سائے تلے، مسجد کے چوک میں یہ رونقیں اور میلے ان ہی چار دنوں کے ہیں، باقی سال کے تین سو باسٹھ دن اور راتیں یہاں ایسی ویران اور سنسان ہیں کہ دل کو ہول آنے لگتے ہیں--آدم نہ آدم زاد، ویرانہ ہی ویرانہ ہوتا ہے یہاں۔ اِن چار دنوں کے علاوہ، کبھی بھول کے بھی نہ آیئے گا یہاں آپ--!!!

جوں جوں رات ڈھل رہی تھی توں توں سردی بھی بڑھ رہی تھی--انتظار ہو رہا تھا کہ کوچ کے قریب آنے کی خبر آئے تو کیمپنگ پہنچ کر گرم گرم چکن تکے اڑائے جائیں--بھوک سے ہر کوئی بے قرار تھا، مگر اس لئے کچھ خرید کر کھانے پر آمادہ نہیں تھا کہ اگر یہاں کھالیا تو اس کھانے کا کیا بنے گا، جو بیچ صحرا، تازہ بہ تازہ ہمارا منتظر ہے--اردگرد کئی بجی والے اپنی ریڑھیوں پر گرما گرم چولستانی بجیاں سلاخوں پر چڑھائے بھون بھون کر فروخت کیے جاتے تھے--آخر صبر کا پتھر اپنے پیٹ پر باندھا اور اس لمحے اور وقت کی یاد میں بجی والے کے گرد کھڑے ہو کر تصویریں بنوانے پر صبر شکر کے ساتھ اکتفا کرنے پر گزارہ کیا--آج میں ان تصویروں کو جب بھی دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بھوکے بٹیروں کے منہ سے رال بھی ٹپکتی تھی--!

آخر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ ہماری کوسٹر خشک دریائے ہاکڑہ کے پار جو سڑک ہے، اس پر آ رہی ہے، اُدھر تک پیدل بھوکے پیاسے جانا ہوگا، تب ہی راحتِ جاں گرم گرم تکوں سے ملاقات ہوگی--!

ایک بار پھر قافلہ پکی سڑک پار کر کے دریائے ہاکڑہ کی خشک تہہ میں اترا--ادھر بھی میلے کا سماں تھا--دریائے ہاکڑہ کا فرشِ زمین، اتنا پانی سطح زمین پر اچھال چکا تھا کہ کیچڑ کم اور دل دل زیادہ تھا--ہم گارے، کیچڑ اور دل دل سے بچتے چلے جاتے تھے--سب کے جوتے ٹخنوں تک گارے میں بھر کر من من بھر کے ہو چکے تھے--مجھے یاد آیا کہ دریائے ہاکڑہ اس خشک تہہ کے نیچے آج بھی بہتا ہے اور راتوں میں اپنے پانی کو نشانی کے طور پر سطح زمین پر اچھال کر اپنے ہونے کا یقین دلاتا ہے--!

پھر وہی رستہ کانٹوں بھری جھاڑیوں کے درمیان آیا کہ دوپہر جہاں سے ہم اونٹوں پر بیٹھ کر گزرے تھے--پھر صحرا کا میدان سامنے تھا، دور، بہت دور ایک ترتیب میں گاڑیوں کی روشنیاں قطار اندر قطار چمکتی تھیں--بس وہی سڑک تھی کہ جس پر ہمیں ہر حال میں پہنچنا تھا--وہیں کہیں ہماری کوچ بھی ہوگی، اس میں جا کر جب راحت کے ساتھ بیٹھیں گے تو تبھی آسودگی ملے گی--!

اُڑتی مٹی اور دھول نے ہمارے چہرے بھی بھوت اور لباس بنجارے بنا دیئے تھے--ایک دوسرے کی شکلیں جب ٹارچوں کی روشنی میں دیکھتے تو ایسا لگتا کہ قلعہ دراوڑ کی سمت سے بہت سے بھوت پریت، جدید قسم کے لباس پہنے چلے آتے ہیں--!

خدا خدا کر کے نام نہاد دھول اُڑاتی سڑک آئی--اس کے سڑک ہونے کی سب سے بڑی اور قابل وثوق نشانی یہ تھی کہ بے شمار موٹریں اس پر قطار میں چلتی تھیں، اس کے علاوہ کوئی ایسی نشانی اور دلیل نہیں تھی کہ اسے سڑک قرار دیا جائے--!

یہ ایک تکونہ، سہ رستہ چوک تھا--!

ٹریفک پولیس کا ناکہ بھی تھا کہ موٹر سائیکل سواروں کی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔

سب کے سوکھے مٹی زدہ منہ سے بے اختیار نکلا--''وہ رہی ہماری کوسٹر--''

کوسٹر سڑک کنارے اسٹارٹ کھڑی تھی--اندر بیٹھتے ہی سب چلائے--بھوک لگی ہے بھوک--جلدی کیمپنگ چلو--ہم تو صحراؤں اور جھاڑیوں کے درمیان چل چل کر مرنے والے ہو گئے ہیں--!

مگر قدرت کو ابھی کچھ اور ہی منظور تھا--!

ابھی چولستان سے عشق کے اور بھی کڑے امتحان باقی تھے--!

ٹھنڈی اور اندھیری رات ابھی تو صحرائے چولستان میں نئی نئی چڑھی تھی--!

چاند اپنی چاندنی کے ساتھ بیچ آسمان چمکتا تھا--!

سیاح بھوک سے بے تاب تھے اور جوڑے جلدی سے سو جانے کو بے قرار تھے--!!!

باب ۳۲

اور ہم اُس رات صحرائے چولستان میں،
جب راستہ بھول جاتے ہیں--!

ہیڈ لائٹس سے نکلتے روشنی کے تیز دھارے نے سامنے ریت کے اُونچے ٹبے پر بیٹھے چاروں لوگوں کی آنکھیں چندھیا ڈالیں--اُن کے پس منظر میں ایک گاؤں کے سامنے والے کچے مکان بھی رات کے اندھیرے میں چمکنے لگے۔

ان چند لوگوں میں، مَیں عبدالرحمٰن ساربان کو پہچان گیا--شاید وہ لوگ وہاں اپنے گاؤں کے باہر بیٹھے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ جو دوسرے لوگ عبدالرحمٰن ساربان کے ساتھ تھے، ان کے پہلوؤں میں رکھے روایتی آلاتِ موسیقی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ وہی فنکار لوگ تھے کہ جن کو آج رات بون فائر ڈنر میں چولستانی لوک موسیقی کے اہتمام میں خصوصاً مدعو کیا گیا تھا۔

آپ یقین جانیے کہ ہم چولستانی صحرانورد ریتیلے راستوں، کانٹے دار جھاڑیوں، اونچی نیچی راہوں اور خشک دریائے ہاکڑہ کی نام نہاد دلدلوں میں چل چل کر یہ بھول ہی گئے تھے کہ وہاں کیمپنگ میں آج رات محفلِ موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا--مجھے اس وقت حیرانگی یہ ہوئی کہ یہ چولستانی لوک فنکار وہاں کی بجائے یہاں کیوں بیٹھے

تھے اور دوسرا سوال یہ تھا کہ ہم کیمپنگ کی بجائے یہاں اس گاؤں میں کیوں کر آن پہنچے ہیں۔

ان سوالوں کے جواب فوراً ہی مل گئے۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ پورے دن کی افراتفری میں فرصت ہی نہ ملی تھی کہ کہیں سے رات کے بون فائر کے لیے لکڑیاں لے کر رکھ لی جاتیں، سو ہم یہاں ایک چولستانی لڑکے کی قیادت میں، جو ڈرائیور خرم شہزاد کے برابر بیٹھا تھا اور رستہ بتاتا تھا، بون فائر کے لیے لکڑیاں لینے پہنچے تھے۔ چونکہ بالن کی لکڑی قلعہ دراوڑ کے آس پاس نہیں مل سکی تھی تو عبدالرحمن ساربان نے اپنے قدیمی تعلقات خرم شکیب سے نبھاتے ہوئے، اسے پیش کش کی تھی کہ وہ اس لکڑی کے زمانہ قحط میں اپنے گھر کے چولہے اور استعمال کی لکڑی، ہماری خوشی کی خاطر دے دے گا۔۔ جہاں تک ان تین چولستانی لوک فنکاروں کا تعلق تھا، ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ عشاء کے بعد کیمپنگ میں پہنچ گئے تھے، مگر جب انتظار کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے تو ان کے انتظار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے ہماری آمد سے ناامید ہو کر اپنی موسیقی کا ساز و سامان اٹھایا اور عبدالرحمن ساربان کے گاؤں پہنچ گئے۔۔ ان سے لاکھ لاکھ بار درخواست کی گئی، معذرت کی گئی، وجہ بتائی گئی مگر وہ بھی آن والے تھے، قطعی راضی نہ ہوئے۔ سو موسیقی کا لیٹ نائٹ پروگرام تل پٹ ہو گیا، جس پر ہمارے صحرانوردوں نے ایک لفظ بھی اعتراض کا نہیں کہا۔۔ بس، اب تو سب کو مجھ سمیت ایسے بھوک لگ رہی تھی کہ پیٹ میں چوہے دوڑنے والا محاورہ بھی دم توڑنے لگا تھا۔۔ ایسا لگتا تھا کہ پیٹوں میں دوڑنے والے صحت مند بھوکے چوہے بھی بے دم ہو کر نقاہت سے انتڑیوں کے خالی گوشوں میں کچھ دبک دبک کر بیٹھنے سے لگے ہیں۔۔!

کوسٹر کی چھت پر کھٹاک پٹاخ جلدی جلدی لکڑیاں لادی گئیں۔۔ پھر کوسٹر کا دروازہ کھلا اور عبدالرحمن ساربان کا بیٹا ذیشان عمران، جس کی عمر دس بارہ برس کی ہو گی، ایک کرکٹ کے بیٹ اور زرد رنگ کے ٹیپ بال کو پکڑے بڑی شان سے اندر داخل ہوا اور میرے برابر کی جمپر سیٹ پر بیٹھ گیا۔۔ کرکٹ کا بیٹ بال دیکھ کر سوئے سوئے بھوکے جوانوں کی آنکھیں سی کھلیں۔۔ سب نے مسرت کا اظہار کیا کہ تکے کبابوں کی ضیافت کے بعد صحرا میں کرکٹ کھیلنے کا مزا آ جائے گا۔۔ ایک نوجوان بولا۔۔

''۔۔ ایک بات سب سن لو، جو بھی اونچی ہٹ لگائے گا، وہ صحرائی اندھیرے میدان میں جا کر خود گم شدہ بال کو ڈھونڈ کے لائے گا۔ میں تو اسی شرط پر کھیلوں گا۔۔''

''۔۔ بیٹا جی، سنا ہے کہ یہاں اندھیرے صحرا میں رات کو چڑیلیں بھی ہوتی ہیں۔۔''

یہ سن کر ایک لمحے کو سناٹا چھایا، خوف کا یا فکرمندی کا --- معلوم نہیں۔ ایک اور نے لقمہ دیا۔ ''--- ہم تو خود چڑیلوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں ---'' کسی بے فکرے نے اطمینان سے کہا۔

''--- بیٹا جی، اگر کسی کو "چمٹ" گئی تو ہماری طرف سے کوئی امید نہ رکھے ---''

''--- وہ خود اپنی چڑیل آپ اتارے گا، شاہ جی آپ فکرمند ناں ہوں، بس اپنی فکر کریں ---''

''--- کسی نے پہلے کبھی چڑیل دیکھی ہے، دیکھی ہے تو بھائیو، پہچان تو بتا دو ---؟''

''--- دیکھی تو نہیں، پر دیکھنے کا شوق ہے ---'' کسی نے لقمہ دیا۔

''--- چپ کرو، فقرے بازی پاکستان کی سرحد کراس کرنے والی ہے ---''!!!

''--- پھر تو انڈیا میں ہندو چڑیل ہی ہو گی ---''!

''--- کون سی ---؟''

''--- کالی ماتا، ہری ماتا، لال زبان اور آٹھ ہاتھوں والی ---''!

''--- خواتین کا احترام لازمی ہے، ورنہ پوری کہانی سنا دیتا ---'' کوئی من چلا بولا۔

''--- لگتا ہے، چپل سے ٹھکائی کرنی پڑے گی ---'' ایک خاتون کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ بول ہی پڑی۔ اس جملے کے بعد خاموشی چھا گئی۔

یہ سن کر ارشاد عالم خان کے پٹھان خون نے جوش مارا --- میرے کان میں با آواز بلند بولا ---

''--- قسم خدا کی --- کسی عورت ذات نے مجھے، عزت دار پٹھان کو یہ جملہ بولا ہوتا تو میں اسی وقت، بیچ صحرا کے جان دے دیتا --- زندہ رہنا پسند نہ کرتا --- مگر یہ زندہ ہے، آفرین ہے، آفرین ہے ---'' عالم خان پٹھان کا چہرہ سرخ تھا ---

پچھلی نشستوں سے قہقہے لگ رہے تھے اور عالم خان پٹھان ان کی غیرت پر ماتم کر رہا تھا ---!

یہ حالات دیکھ کر میں تو سچ مچ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ کہیں چولستان کے صحرا میں تعصب کی ہوا پھیل گئی تو فسادات کا بازار گرم ہو جانے کا اندیشہ تھا --- مگر قہقہے اتنے بلند اور فلک شگاف تھے کہ کچھ پتہ نہ چل سکا ---!

ٹھیک رات کے بارہ بجے کر حسن اتفاق سے ناں گھڑی کی سوئی ذرہ بھر ادھر تھی نہ اُدھر، کوسٹر نے گاؤں کی سمت سے منہ پھیرا اور اندھیرے صحرا کی طرف اپنے مسکن کی سمت چل دی --- وہ بہت دیر تک کالے اور اندھیرے صحرا میں چلتی چلی گئی ---!

چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا --- کبھی کبھی دور کہیں روشنی کے بلب دیئوں کی طرح ٹمٹماتے نظر آتے تھے --- مگر پھر یک دم ایسے گم ہو جاتے، جیسے ہمیں دیکھ کر خاص طور پر بجھا دئیے گئے ہوں۔ ایسے میں چاروں طرف گھور اندھیرا چھا جاتا، مگر کوسٹر کے اندر بلب روشن تھے، جو باہر کی تاریکی کو ایک سانس میں نگل جاتے تھے --- اندر کی دنیا، اپنی دنیا میں مگن تھی، کوئی لطیفے سنا کر پوری ٹیم سے قہقہوں کی امید کرتا تھا، اگر جوابی قہقہہ نہ آتا تو خود ہی بھونڈے قسم کے چھت پھاڑ قہقہے لگانے لگتا --- کچھ لوگ وقت گزارنے کے لیے آپس میں ہی دھیرے دھیرے اپنے سفری تجربات سنائے جاتے تھے --- غرض باتیں ہی باتیں، وقت گزاری ہی وقت گزاری تھی اور کوچ صحرا میں کسی سمت چلی جا رہی تھی ---!

میں اپنی ذات کی خاموشی میں محصور تھا اور رہ رہ کر ایک ہی خیال آتا تھا کہ اتنا فاصلہ تو نہیں ہے کہ جتنی دیر سے ہم تاریک راستوں پر چلتے چلے جا رہے ہیں ---!

آدھی رات میں صحرائی تاریکیاں یقیناً لامحدود ہیں، مگر اتنی تو نہیں کہ قدم رکنے کا نام نہیں لیتے اور فاصلے کا کوئی سنگ میل حد نگاہ تک نظر نہیں آتا ---!

رات کے اندھے اندھیروں میں صحرا کی ہیبت کا اندازہ کتابوں، سفرناموں کے پڑھنے سے قطعی نہیں ہو سکتا --- اس کی دن میں وحشت، اور نوعیت اور طرح کی ہوتی ہے اور رات کی دہشت اور طرح کی ہوتی ہے --- رات کو جو ریت کا ٹیلہ یہاں ہوتا ہے، صبح اٹھ کر دیکھو تو کہیں اور ہوتا ہے؛ دن میں جن ریت کے پھسلواں پہاڑوں کے نیچے سائے ہوتے ہیں، وہ سائے رات میں دہشت کی علامت بن جاتے ہیں --- ریت کی دلدلیں پورا پورا قافلہ نگل جاتی ہیں --- صرف ساربان اور صحراؤں کے راستہ شناس ہی جانتے ہیں کہ کیسی ریت میں کس راستے پر قدم رکھنے ہیں اور کس پر نہیں رکھنے --- دن میں سورج کی اٹھان اور ڈھلوان، رستے اور رخ بتاتے ہیں، راتوں میں یہی کام ستارے کرتے ہیں --- جیسے صدیوں کی جمی برف کے گلیشیئر گائیڈ کے بغیر عبور نہیں ہو سکتے، اسی طرح ریت کے بیابان صحرا بھی رہنمائے دشت کے بنا نہیں پائے جا سکتے۔ جو خود سے یہ جرات کرتے ہیں، ان کے انجام سے اللہ محفوظ رکھے ---

"--- لگتا ہے کہ ہم صحرا میں رستہ بھول گئے ہیں ---" میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

یکدم کوچ میں خاموشی چھا گئی۔

"--- کون بولا کہ ہم رستہ بھول گئے ہیں ---؟" کسی نے ناراض سا ہو کر احتجاج کیا۔

"--میں نے کہا ہے--یہ میں نے کہا ہے کہ ہم یقیناً رستہ بھول گئے ہیں--" میں نے اونچی آواز سے دہرایا۔

"--خرم شکیب صاحب، کیا آغا صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں--؟؟؟"

کئی تشویش زدہ آوازوں میں سے کسی کی آواز گونجی۔

"--جی ہاں--ہم رستہ بھٹک گئے ہیں، آپ فکر نہ کریں ابھی مل جائے گا--" خرم شکیب نے اعتماد سے کہا۔

"--ہم کتنی دیر سے گم ہیں، مجھے بڑی بھوک لگی ہے--" کسی لڑکی کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

"--بھوک تو ہم سب کو لگی ہے، دعا کرو رستہ مل جائے--" اگلی نشستوں سے کسی نے کہا۔

صحرا میں بھٹک جانے کے بعد آسانی سے رستے نہیں ملا کرتے--ہر سمت ایک جیسی ہوتی ہے، ہر رستہ ایک جیسا ہوتا ہے بلکہ رستہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ ریت اور کہیں کہیں جھاڑیوں کے آثار ملتے ہیں، بس اندازے ہوتے ہیں، اور کم از کم میں جانتا ہوں کہ انسانوں کے اندازے عموماً گمراہ کن اور غلط ہوا کرتے ہیں، فقط اللہ کے اندازے ٹھیک ٹھیک اور مقررہ ہوتے ہیں۔ انسان کو زیبا ہی نہیں کہ وہ اندازوں کے تیر تکے لگائے، وہ تو تیر تکے چلاتا ہے۔ رب جلیل کے اندازے حکمت بھرے اور کامل ہوتے ہیں--کوسٹر صحرا کے ویرانوں اور بیابانوں میں اندازوں پر رستہ تلاش کرتی بھاگی جا رہی تھی--کبھی اس سمت، کبھی اس طرف--کوسٹر میں بیٹھے ہر سیاح کی آنکھیں بھوک، پیاس، نیند سے آزاد ہو چکی تھیں اور ونڈ شیلڈ پر جمی ہوئی تھیں--وہاں ہیڈ لائٹس کی حد روشنی کی بعد اندھیرا اور ویرانہ ہی ویرانہ تھا--دور کہیں کوئی بتی ٹمٹماتی نظر آتی تو امید کی کرن بن جاتی--پھر خدا کا کرنا ایسا ہوتا کہ وہ ٹمٹماتی امید کی کرن بھی یکا یک گل ہو جاتی--میں محسوس کر رہا تھا کہ ڈرائیور اور شکیب بھی اسی نفسیاتی دباؤ کے زیر اثر آ چکے تھے--یعنی جدھر بھی دور کہیں روشنی کی جگنو کرن چمکتی، ڈرائیور خود بخود گاڑی کا رخ اسی سمت موڑ دیتا۔

پھر جب اس جگنو کی سمت چلتے تو وہ روشن نکتہ یا تو آف ہو جاتا یا پھر نظر کا دھوکہ بن کر رتیلے بنجر میدانوں ویرانوں میں تحلیل ہو جاتا--ہم کسی ایسی جگہ تھے کہ وہاں کسی بھی موبائل نیٹ ورک کا کوئی بھی سگنل نہیں آ رہا تھا--

عجیب بے بسی اور لاچاری تھی--

ڈرائیور ہر سمت میں اپنی گاڑی کو گھما پھرا کر ہیڈ لائٹس ڈالتا تھا کہ کوئی کیمپ مل جائے، کوئی فرد مل جائے کہ اس سے رہنمائی کا مشورہ کیا جا سکے--مگر لگتا تھا کہ دور دور تک ایسی کوئی امید کی کرن روشن نہیں ہے--!

فکر مندی ہر کسی کو کھائے جا رہی تھی-- میں نے خرم شکیب سے پوچھا--"بھائی، آپ جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے صحرا میں گاڑی دوڑائے چلے جا رہے ہو، دھیان رکھنا، کہیں ڈیزل نہ تمام ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں--"

جواب میں ڈرائیور خرم شہزاد نے کہا--"ٹینکی فل ہے، اللہ نگہبان ہے--"

یہ ہمارا ڈرائیور بھی عجیب درویش صفت بندہ تھا-- پتہ نہیں کیوں میرا دل اس کی درویشی کو تسلیم کرتا تھا، حالاں کہ بہ ظاہر ایسی کوئی سند ساتھ لیے نہیں پھرتا تھا-- میرا خیال تھا کہ درویشی اور قناعت اس کی آنکھوں سے جھانکتی تھی، باقی کوئی ظاہری عمل ایسا نظر نہیں آتا تھا--!

یکا یک سامنے بہت دور، بلکہ بہت ہی دور سے کسی موٹر یا جیپ کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں-- کوچ کے ہر مسافر کی آنکھیں ونڈ شیلڈ کے پار ان دو ننھے دیوں پر امید بن کر جم گئیں-- وہ امید کی کرنیں ہماری طرف ہی بڑھ رہی تھیں-- بے ساختہ ہمارے ڈرائیور نے بھی اپنا رخ انہی امید کی کرنوں کی طرف موڑ دیا-- وہ ہماری طرف بڑھ رہے تھے اور ہم ان کی طرف بڑھتے جا رہے تھے-- ایسے میں ہم میں سے کوئی سوئی سوئی آواز میں گھبرایا ہوا بولا--!

"--یار-- وہ کہیں صحرائی قذاق ہی نہ ہوں-- جو ہمیں لوٹنے آ رہے ہوں--"!

"--ابے، چپ کر جا، کبھی تو اپنی کالی زبان سے اچھی بات کر دیا کر--"!

پھر خاموشی چھا گئی-- وہ ہماری طرف اور ہم ان کی طرف ایک سیدھ میں ایسے بڑھ رہے تھے کہ اگر گاڑیاں بروقت نہ روکی گئیں تو ایک دوسرے کا منہ ماتھا ہی چاٹ لیں گی--!

دونوں گاڑیاں صحرائے چولستان کے اندھیرے میں ایک دوسرے کے مقابل آن کر رکیں-- اس جیپ سے دو گھبرائے ہوئے نوجوان نیچے اترے-- ان کی گھبراہٹ اور پریشانی بتاتی تھی کہ وہ صحرائی قذاق ہرگز نہیں ہیں-- اِدھر سے دروازہ کھول کر علی رضا چنگیزی کسی تائیوانی پہلوان کی طرح خرم شکیب کے ساتھ نیچے اترا تو ہوا کا یخ بستہ جھونکا کوچ میں آیا، جس سے معلوم ہوا کہ باہر شدید ترین سردی ہے-- صحرائی سردی جو گلیشیر کی سردی کے ہم پلہ ہوتی ہے--!

دونوں پارٹیوں میں ہیڈ لائٹس کی روشنی میں معانقہ ہوا-- وہ اپنی گاڑی میں سر جھٹکتے ہوئے بیٹھے اور کسی سمت کو نکل گئے اور ہم، جدھر سینگ سمائے، اُدھر چل دیے--!

جیسے ہی ہمارے لوگ اندر آئے، سب نے بہ یک زبان پوچھا--"کچھ پتہ چلا رستے کا--؟"

"--نہیں--وہ تو خود رات دس بجے سے صحرا میں گم شدہ ہیں--وہ ہم سے رستہ پوچھتے تھے اور ہم ان سے پوچھتے تھے--جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم بھی صحرا میں ان کی طرح ہی لاپتہ ہیں تو نا امیدی کے عالم میں کسی نامعلوم سمت نکل گئے--" خرم شکیب نے بتایا۔

"--اب ہم کیا کریں گے--؟"

"--ہم بھی کسی نامعلوم سمت چل پڑیں گے--"!!!

"--غضب خدا کا، ہمیں صحرا میں ٹامک ٹوئیاں مارتے دو گھنٹے ہو چلے ہیں--" کوئی بولا۔

"--بھائی جی، شکر کرو ہم دو گھنٹے سے لاپتہ ہیں، وہ جیپ والے چار گھنٹے سے گھومے جا رہے ہیں--" چینگ نے تڑپ کر کہا۔

لگتا تھا کہ آج کی رات دشت کے انجانے اور ویرانے ہمارا مقدر بن گئے تھے--حال یہ تھا کہ آگے بیٹھے لوگ آنکھیں پھاڑے ہر سمت میں گربائے دشتی کی طرح آنکھوں کی پوری پوری پتلیاں کھول کھول کر دیکھتے، پھر آپس میں باہمی بصیرت افروز مشورہ کرتے اور جو اندھیری سمت درست محسوس ہوتی، اس طرف کو اسٹیرنگ مڑوا دیتے--مگر ہر بار ناکامی سے دوچار ہوتے--کئی لوگوں کا خیال تھا کہ بھاجی، لگتا ہے کہ اب صبح ہی رستے ملے گا--!

دور بہت دور ایک ننھی سی روشنی ادھر ادھر حرکت کرتی نظر آئی--یہ امید کی ایک تازہ کرن تھی--فوری فیصلہ ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ کوئی جھونپڑا یا اکیلا دوکیلا کیمپ یا چھولداری ہے، اسی سمت چلتے ہیں، شاید کوئی راہ نکل آئے--ایک صاحب کا خیال تھا کہ کوئی ہماری کوچ کی ہیڈ لائٹس کے ادھر ادھر بھٹکنے سے ہماری آوارہ وطنی پر ترس کھا رہا ہے اور اپنے موبائل کی ٹارچ سے ہمیں اپنی طرف بلا رہا ہے کہ ہماری مدد کر سکے--!

دریا میں ڈوبتے کو تنکے کا بھی سہارا ہوتا ہے، صحرا میں گم شدہ ہم لوگوں کو روشنی کا یہ سگنل امید کا سہارا لگا--لیجئے صاحب، پھر کوچ کا منہ اسی طرف موڑ دیا گیا--چلتے گئے--چلتے گئے اور اس تک پہنچ ہی گئے--وہ موٹر سائیکل کے دو سوار تھے۔ایک سوار نے پرنے سے ایسا منہ لپیٹ رکھا تھا کہ ہماری آدھی کوچ کے لوگوں کو اس کی جنس کا تعین کرنے میں قوی شبہ تھا! جب کہ وہ نوجوان جو اپنے موبائل ٹارچ سے سگنل دے رہا تھا، اس کی سردی سے حالت بہت بری تھی--ان کا موٹر سائیکل صحرائی جھاڑی کا کانٹا لگنے سے پنکچر ہو گیا تھا۔انہوں نے ہمیں اس لیے سگنل دیا تھا کہ اگر ہم لوگ کوئی جیپ والے ہوئے تو ان کی موٹر سائیکل کو جیپ میں لاد کر دراوڑ گاؤں تک پہنچانے میں شاید کوئی مدد کر سکیں--پوچھا، تم یہاں کیسے تو جواب ملا کہ دراوڑ سے تین گھنٹے پہلے اپنے کیمپنگ کو نکلے تھے،

ہمارے باقی موٹر سائیکل والے ساتھی آگے نکل گئے، ہم رستہ بھٹک گئے--نئی مصیبت یہ آئی کہ ٹائر پنکچر ہو گیا ہے اور اوپر سے فون کا کوئی سگنل بھی نہیں ہے--میرا ساتھی بہت ڈرپوک ہے، میں نے اسے کہا بھی کہ رات یہیں بسر کر لیتے ہیں، پر وہ زمین پر لیٹنے اور سونے سے ڈرتا ہے--!

کوسٹر کو جب ریورس لگا اور اس خاموش ساتھی کے چہرے پر نگاہ پڑی تو بہت سے نوجوان اس بات پر بضد ہو گئے کہ مانو یا نہ مانو، موٹر سائیکل والے کے ساتھ لڑکی تھی، جس کو لڑکا شو کیا جا رہا تھا--اس کے ڈھکے چہرے پر چمکتی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے کیسے لشکارے مار رہے تھے--!

"--تجھے اندھیری رات میں کاجل کے لشکارے بھی نظر آ گئے--مان گئے بھئی مان گئے، تیری بینائی چھ ضرب چھ نہیں، بارہ ضرب بارہ کی ہے--"

یہ سن کر دوسرے نے بہت آہستگی سے لقمہ دیا--"لو بھڑیا، اس موذی کو فوراً دکھ جاتی ہے--"

بھانت بھانت کے لوگوں، خصوصاً نوجوانوں کی ٹیم کے ساتھ سفر کرنے کا یہی مزا ہے کہ طرح طرح کی جملے بازیاں اور قسم قسم کے رویے سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں--ان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، جو سفر میں رنگا رنگی پیدا کرتا جاتا ہے--اسی لیے مجھے ان لوگوں، اجنبی لوگوں کے ساتھ سفر کا زیادہ لطف آتا ہے--بے فکرے، کھلنڈرے، خوف سے آزاد، اپنی دنیا میں مگن لوگ--!

یکا یک آگے بیٹھے، آنکھیں کھولے، راستہ تلاش کر کے مشورہ دینے والوں کو احساس ہوا کہ ہماری گاڑی چلتے چلاتے چولستان کار ریلی کے اجاڑ ویران ٹریک پر چڑھ گئی ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ ہمارا رخ ویرانوں میں رحیم یار خان کی طرف ہے یا چولستان کی طرف--اگر منہ رحیم یار خان کی طرف ہے تو بھی اللہ حافظ ہے اور اگر نہیں، تب بھی--گھبرا کر کوسٹر کو ٹریک سے اتار کر ادھر ہی اللہ توکل موڑ دیا گیا کہ جدھر سے آئے تھے--!

یکا یک آگے غل ہوا کہ خرم شکیب کے فون میں سگنل آ گئے ہیں--اسی وقت کوچ روک دی گئی کہ اگر ایسے میں گاڑی کسی ایسی سمت نکل گئی اور سگنل ٹوٹ گئے تو پھر صحرا میں سگنل کو تلاش کرنا، مزید مشکل کھڑی کر دے گا--!

خرم کا رابطہ کرامت علی سے ہو گیا--امید کی کرن پھر روشن سی ہونے لگی۔

"--بھائی جی، کہاں ہو، رات کے تین بج رہے ہیں، چکن تکے بھی ٹھنڈے ہوئے جا رہے ہیں، ہم نے چتیلی میں رکھ کر ان کو گرم رکھا ہوا ہے--" کرامت علی بولتا چلا گیا--

"--تکوں کو گولی مار بھائی کرامت--ہم صحرا میں کہیں گم ہو چکے ہیں--کچھ پتہ نہیں کہاں ہیں، بھوک

پیاس مر چکی ہے-- سمجھ نہیں آ رہا کہ کدھر کو جائیں-- اچھا تو ایسا کر کہ ہمیں اپنے اردگرد کی کچھ نشانیاں بتا--"

کرامت علی نے اپنے اردگرد تمبو کناتوں اور ان پر رنگین لائٹنگ کی بے شمار نشانیاں بتائیں مگر کوئی بھی نشانی ہماری نگاہ کی دسترس میں نہیں نظر آتی تھی-- آخر خرم شکیب کو ایک ترکیب سوجھی۔

"--کرامت علی، ایک کام کر-- جو بلب اپنے کیمپنگ میں بانس پر لگایا ہوا ہے، تم کسی طرح اس بانس کو اور اونچا اٹھا سکتے ہو--؟"

جواب آیا "--جی، جناب، جتنا اونچا کر سکتا ہوں کر دیتا ہوں--"

"--جب اونچا ہو جائے تو مجھے دوبارہ فون کرو، ہم صحرا میں جہاں کھڑے ہیں، وہیں کھڑے رہتے ہیں، تاکہ سگنل آتا رہے--" خرم شکیب نے ہدایات جاری کیں۔

چند ہی منٹ بعد کرامت علی کا فون آ گیا--

"--سر جی، بڑی مشکل سے بلب کو اونچا کیا ہے--وہ اپنے عمران کریم پراڈو والے ہیں ناں، ان کی پراڈو جنریٹر کے پاس منگوا کر کھڑی کی ہے: میں اس وقت پراڈو کی چھت پر کھڑا ہوں، بلب بانس پر لگایا ہوا ہے، میں بانس پکڑے چھت پر ہوں، اس سے اوپر اور نہیں ہو سکتا--" کرامت علی نے صورت حال سے مطلع کیا۔

"--اب تم ایسا کرو کہ یحییٰ سے کہو کہ بلب کو وقفے وقفے سے آن آف کرتا رہے، میں علی رضا چنگیزی کو کوچ کی چھت پر چڑھاتا ہوں: وہ وہاں سے دیکھ کر بتا سکا تو ٹھیک ورنہ ہمارا تو اللہ ہی حافظ ہے--"

خرم شکیب نے جو اس وقت پلان بنایا، وہ بہترین دانشمندی تھا--

لیجئے صاحب، علی رضا چنگیزی عرف مسٹر چینگ کو کوسٹر کی چھت پر چڑھا دیا گیا۔ اسے یہ بھی ہدایت دی گئی کہ جب گاڑی چلے گی تو منہ لپیٹ لے، کہ گرد کا طوفان اٹھتا ہے، اور اپنی لیدر جیکٹ کو بھی بند کر لے، چلتی کوچ میں چھت پر ہوا برف ہو گی-- اگر دائیں طرف روشنی نظر آئے تو دائیں طرف کی چھت کو بجائے اور اگر بائیں طرف روشنی نظر آئے تو بائیں طرف کی چھت کو بے دریغ پیٹے۔ اسے پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ ہمیں تو چاروں سمت اندھیرا نظر آتا ہے، تم چھت پر کھڑے ہو کر اندازہ کرو کہ اجتماعی روشنیاں اور کرامت کا جلتا بجھتا بلب کہاں ہو سکتا ہے۔

باب ۳۳

جب راستہ بھُول کر ہم صحرا میں گول گول گھُومتے تھے،
تب بھُوت جھاڑیاں رستہ روک لیتی تھیں---!

صحرا میں چاروں جانب ریت اور تاریکی بول رہی تھی۔

دور دور بکھری جھاڑیاں روپ بدل بدل کر اپنی آسیبی شکلیں دکھا رہی تھیں---کبھی لگتا تھا کہ کچھ بھوتنیاں آپس میں سر جوڑے، میدان کے بیچ ویرانے میں بیٹھی ہیں اور ہاتھ چڑھے شکار کو کچا کھا رہی ہیں---تیز ہوا کا جھونکا آتا تو جھاڑیوں کی بھوتنیاں زمین پر جھکے، اپنے کولہے یوں مٹکاتیں کہ خوف کی لہریں ریڑھ کی ہڈیوں میں سنسناتی چلی جاتیں---پھر کبھی ایسے لگنے لگتا کہ صحرا کے ویرانے میں بھوت جھاڑیاں ہوا کے زور سے کبڑی اور بڈھی مائیوں کی طرح بیٹھے بیٹھے چلی جاتی ہیں---جب ان کو غور سے دیکھا جاتا تو یوں لگتا بڈھی بھوتنیوں کی پراسرار ٹولی، ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر خرمستیاں کرتے کرتے اِدھر اُدھر بھاگی پھرتی ہے---

صحرا کے خوف زدہ کر دینے والے اندھیروں میں، میرے سامنے پھیلا ہوا حدِ نگاہ صحرا جاگتا، سانس لیتا اور نظارے بدلتا تھا---!

ایسے جاگتے خوف میں علی رضا چنگیزی، تن تنہا کوسٹر کی چھت پر چڑھا اور دور دور نظریں دوڑانے لگا---

اس نے ڈرائیور کو آواز دی--

"--استاد جی، گاڑی کو موڑو، جدھر کوچ کی دم ہے، ادھر کو اپنا منہ کرو اور سیدھے سیدھے چل دو--اس طرف ہی کہیں دور افق کے پار روشنیوں کی مدھم سی لکیر نظر آتی ہے، باقی ہر سمت گھور اندھیرا جا گتا ہے--"

باہر شدید سردی اور منجمد کر دینے والی ہوا تھی--چینگ کوچ کی چھت پر تھا۔ ڈرائیور کے کھلے کھڑکی شیشے سے برف ہوا اندر آتی تھی کہ کپکپی چھوٹتی تھی--اور وہ لڑکا بے یار و مددگار چلتی بلکہ دوڑتی گاڑی کی چھت پر--"او، پی" کے فرائض انجام دے رہا تھا--!

کافی دیر کی خاموشی اور بے سمت سفر کے بعد چنگیزی نے کوچ کی چھت کے لوہے کو زور زور سے بجایا--وہیں رک کر پوچھا گیا--اس نے ایک نئی سمت کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں، اس طرف ایک بلب کبھی بجھتا ہے اور کبھی جلتا ہے--جب سمت کا تعین ہو گیا تو گاڑی اس طرف دوڑانی شروع کر دی گئی--جوں جوں آگے بڑھتے گئے، پھر ویرانہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ تاریکی چھا گئی--کوچ پھر روک دی گئی--چنگیزی سے پوچھا گیا یہ کیا معاملہ تھا--کہنے لگا کوئی روشنی تھی، جو جھاڑی کے پیچھے تھی۔ جھاڑی ہوا سے لہراتی تو لگتا حق بجھا دی گئی ہے، جھاڑی ہوا کی لہر سے واپس آتی تو لگتا، بلب روشن کر دیا گیا ہے--اور وہ لائٹ نامعلوم تھی کہ پھر نظر آنا قطعی طور پر بند ہو گئی--اب پھر ویرانہ تھا اور ہم تھے--!

پورا آدھا گھنٹہ یہی کھیل تماشہ چلتا رہا--میرے سے نہ رہا گیا--آخر میں بول ہی پڑا--میں نے بہ آواز بلند خرم شکیب سے کہہ ہی دیا۔

"--خرم صاحب--وہ لڑکا آدھے گھنٹے سے برف ہوا اور طوفانی گرد میں چھت پر کھڑا ہے، خدا کے لیے اسے واپس بلا لیں--یہ تو اب طے ہو گیا ہے کہ ہمیں راستہ ملتا دکھائی نہیں دیتا، بچے کو نمونیا ہو گیا یا ٹھنڈ سے اکڑ کر کوسٹر کی چھت سے نیچے گر گیا تو اور نئی پریشانی کھڑی ہو جائے گی--" میری یہ بات خرم شکیب کے دل کو لگی۔

کوچ پھر بیچ صحرا روک دی گئی--علی رضا چنگیزی سے کہا گیا کہ نیچے آ جاؤ۔

کوسٹر کا دروازہ کھلا، پہلے ٹھنڈی برفیلی گرد آلود ہوا کا تھپیڑا اندر آیا--اس کے ساتھ ہی گرد و غبار میں اٹا چینگ اندر داخل ہوا--اس کا لباس اور چہرہ مٹی کی تہوں سے کچھ اس طرح لبریز اور چینٹ زدہ تھا کہ اگر اس کے نیلے مٹی جیسے ہونٹ سردی سے کانپ نہ رہے ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ وہ علی رضا چنگیزی نہیں بلکہ این، سی، اے کے مجسمہ سازی کے شعبہ میں تیار کیا گیا، بہترین مجسمہ ہے کہ جس کے جتّے پر مٹی گارا زیادہ تھوپ دیا گیا ہے--!

مٹی جھاڑنے کے بعد اندر سے اصلی چینگ برآمد ہوا--جب وہ کچھ بولنے کے لائق ہوا تو اس کی مشاورت سے فقط اتنا طے پایا کہ جدھر گاڑی کا منہ ہے، اُدھر ہی کہیں روشنی کے نامعلوم شائبے پائے جاتے ہیں--بس اسی سمت کو چلے چلو--پہنچ گئے تو ٹھیک، ورنہ اللہ مالک ہے--!

میں اس بات پر حیران تھا کہ جتنے بھی لوگ اس گاڑی میں موجودہ صورت حال سے دوچار ہیں، ان کی بہت بڑی اکثریت ان حالات وواقعات کی گمبھیرتا سے تقریباً لاتعلق ہی تھی--مجھے صاف لگتا تھا کہ فکرمندی میرے علاوہ ڈرائیور اور کمپنی کے لوگوں میں ہی بے چینی بن کر پائی جاتی تھی--میں نے بے فکری کا یہ عالم دیکھ کر اپنے ایک پڑوسی سے کہا کہ لگتا ہے کہ آپ صحرا میں کھو جانے کو بہت لائٹ لے رہے ہیں--تو جواباً پنجابی میں بے زاری سے بولا کہ تو کیا کریں، لڈیاں ڈالیں--ایک گندی سی گالی دی، جیسا کہ پنجاب کا تہذیبی دستور ہے اور ٹانگیں لمبی کر کے ایسے سوتا بن گیا، جیسے اپنے بیڈروم میں پڑا ہو--!

پچھلے دس پندرہ منٹ سے مجھے لگ رہا تھا کہ ہم گول گول گھوم رہے ہیں--وجہ اس احساس کی یہ تھی کہ جب بھی سیدھے چلتے، آگے جھاڑیاں آجاتیں، گاڑی کو پھر سے ریورس کیا جاتا--پھر کسی کھلی سمت میں موڑا جاتا تو پھر آگے خاردار اونچی اونچی جھاڑیاں دیوار بن کر راستہ روک لیتیں--میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس بارے میں اپنی رائے، کوچ کے کھیون ہاروں کو دوں مگر یہ سوچ کر چپ میں ہی عافیت سمجھی کہ بلا پوچھے اپنی رائے دی تو کہیں یہ سننا نہ پڑ جائے کہ یہ درمیان میں بیٹھا آدمی کیوں بولتا ہے--اس قسم کی عزت افزائی سے کہیں بہتر تھا کہ جو ہو رہا ہے، ہونے دو اور خاموش رہو--کسی کو بھی آپ کی رائے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے--!

وہی ہوا--آخر یہ بات کوئی بیس منٹ بعد ڈرائیور صاحب کی عقل میں بھی آ ہی گئی--کہ جب پھر ایک بار جھاڑیوں کی دیواری قطار سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تو انھوں نے ایک طویل ترین ریورس لگایا--جو اللہ جھوٹ نہ بلوائے کوئی دو سو گز کا تھا--جب اس ریورس سے گاڑی کی ہیڈ لائٹس میدان پر پڑیں تو پتہ چلا کہ ریت کا بہت بڑا میدان ہے، اس کے تین اطراف میں جھاڑیوں کی دیواریں ہیں اور ہم بلا مبالغہ اس میدان میں گول گول دائرے کی شکل میں گھومے چلے جا رہے ہیں--!

صحرا کا قدرتی اور آفاقی اصول ہے کہ خواہ دن ہو یا رات، جب کوئی حقیقتاً رستہ بھول جاتا ہے تو صحرا کا دھوکہ اس کو ایک بڑے سے گول دائرے میں گھمانے لگتا ہے، جب کہ گم ہو جانے والا اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ بالکل سیدھا چلا جا رہا ہے۔

اب کامل یقین ہو گیا کہ ہم واقعی گم شدگی کے قدرتی گول چکر میں پوری طرح پھنس چکے ہیں--
میدان میں پڑنے والی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کوچ کے ٹائروں کے نشانات واضح نظر آنے لگے تھے، جو ایک دائرے میں خوبصورت میری گو راؤنڈ بنائے ہوئے تھے--!
دائرے کی خالی سمت سے باہر نکلے اور کسی نامعلوم سمت چلنے لگے--یکا یک ایک سمت بہت سی اونچی روشنیاں نظر آنے لگیں--قریب پہنچے تو وہ ایک بہت بڑی ٹینٹ کنوپی تھی، جس میں میوزک پروگرام کے ساتھ زبردست مجرا ہو رہا تھا۔قریب جا کر ایک جھاڑی کے پاس بیٹھے آدمیوں سے رستے کا پوچھا تو اندازہ ہوا کہ سب ہی نشے میں ٹن اور انٹا غفیل تھے--!
پھر لگا کہ کسی سمت میں نیلی روشنیاں بہت اونچے بانسوں پر لگی ہیں--یہ ٹینٹ بھی چاروں طرف سے بالکل سیل بند تھا اور اطلاعات کے مطابق اندر ڈانس ہو رہے تھے--یہاں سے بھی بے نیل و مرام کسی نئی سمت میں نکل کھڑے ہوئے--!
راستے میں ایک اور پراڈو مل گئی--انہوں نے ڈپر مار کر ہمیں اشارہ دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرات تو خود رات گیارہ بجے سے گم شدہ ہیں۔یہ لوگ دراوڑ کے کسی تندور سے اپنے لوگوں کے لیے روٹیاں لے کر آ رہے تھے کہ گم ہو گئے ہیں--وہ ہم سے راستہ پوچھتے تھے اور ہم ان سے--نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات تھا--!
کبھی کبھی سگنل مل جاتے تو کرامت علی کا تشویش زدہ فون آتا۔
''--سر جی، میں پراڈو کی چھت پر کھڑے کھڑے سردی سے اکڑ گیا ہوں--'' جواب میں خرم شکیب نے بے بسی سے کہا--ہمیں کچھ دور روشنیاں سی نظر آ رہی ہیں اور--''
اور پھر سگنل ٹوٹ گیا--
واقعی ایک ریت کا ٹیلہ سامنے آیا، ڈرائیور نے کمال مہارت سے کوچ کو ٹیلے پر چڑھا ہی دیا--ٹیلے کی اونچائی پر چڑھنا بڑا بھاگوان ثابت ہوا--تین طرف اندھیرا اور بائیں سمت دور جاگتی سڑک پر تیرتی گاڑیوں کی لائٹس جگمگا رہی تھیں--کوچ کا رخ ادھر ہی موڑ دیا گیا--کوئی دس منٹ میں ہم پُر رونق چلتی سڑک کے کنارے آ گئے--
عبدالرحمٰن ساربان کا بچہ عمران بھی تھک چکا تھا--اسے نیند آ رہی تھی--سڑک دیکھ کر بولا--مجھے یہاں اتار دو، وہ دائیں طرف میرا گاؤں ہے، میں خود ہی چلا جاؤں گا--اور وہ اپنا بیٹ بال اٹھا کر خاموشی سے اتر گیا--

کوچ اس شاہراہ کے کنارے روک دی گئی--خرم شکیب، چینگ اور ڈرائیور اتر کر لوگوں سے راستہ پتہ کرنے چلے گئے اور ہم لوگ جو گاڑی میں ساڑھے تین گھنٹے سے بیٹھ بیٹھ کر اکڑ گئے تھے، اتر کر چٹیل میدان کے کنارے کھڑے ہو گئے--میں نے سگریٹ نکالا اور بے بسی کا دھواں اڑانے میں مصروف ہو گیا--!

یہاں سگنل بھی آ رہے تھے، کرامت علی سے پورا پورا رابطہ تھا مگر یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیمپنگ کس سمت میں ہے--!

میں نے عندلیب کو فون بلا سوچے سمجھے ملا دیا--

"--اس وقت فون--خیریت تو ہے--" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"--ہم صحرا میں راستہ بھول چکے ہیں--"

"--کیا آپ اکیلے ہیں، بچے کہاں ہیں، وجدان اور حیدر کہاں ہیں--" اس نے پوچھا۔

"--وہ بھی ساتھ ہیں--ہماری کوچ ہی راستہ بھول چکی ہے، ہم رات بارہ بجے سے صحرانوردی کا شکار ہیں--تم دعا کرنا--"

رابطہ پھر منقطع ہو گیا--شاید تیز ہوا نے سگنل کا رخ پھیر دیا تھا۔

ڈرائیور خرم شہزاد کوچ میں آیا--صبح کے چار بجنے والے تھے--معلوم ہوا کہ جس کسی گاڑی کے ڈرائیور سے بات ہوتی ہے، وہ خود گم شدہ ہوتا ہے--کچھ پتہ نہیں کون کہاں ہے اور کہاں جاتا ہے--!

پھر عجب واقعات ہوئے--!

پوچھا--کچھ رستے کا علم ہوا--جواب آیا--کچھ پتہ نہیں--!

ڈرائیور خرم شہزاد نے آتے ہی ایک ایسی قوالی لگا دی کہ جس سے بہت سے لوگوں کو شدید ناگواری ہوتی تھی--لوگوں کو اندر آنے کا اشارہ دیا--اے سی آن کر دیا اور ڈیک کی آواز کا والیم اپنی آخری حدوں تک بلند کر دیا--سب چپ--کوئی بھی نہ بولا--ادھر خرم ڈرائیور نے اپنا سر اسٹیرنگ پر لگا دیا۔

امجد صابری کی مولائی قوالی اپنے عروج پر تھی--!

وہ اسٹیرنگ پر اپنا سر لگائے، عالم بے خودی میں مدہوش، دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا--کوئی دس منٹ اور یونہی گذر گئے--

یکا یک اس نے اپنا سر اسٹیرنگ سے اٹھایا--ایک لفظ زبان سے نہ بولا-- یکدم گاڑی کو سلف مارا--

پیچھے مڑ کر ایک نگاہ سواریوں پر ڈالی اور تیزی سے گاڑی کو کسی نامعلوم سمت پوری رفتار سے موڑا-- اتنی اسپیڈ دی کہ الامان الحفیظ--

کوسٹر ہوا میں اڑتی جا رہی تھی-- جتنی بلند آواز قوالی کی تھی اس سے بھی تیز رفتار گاڑی کی تھی-- اللہ جھوٹ نہ بلوائے، سو کلومیٹر سے کیا کم ہوگی۔

کوچ سیدھی گئی-- ایک موڑ اتنی تیزی سے اندھیرے کی طرف کاٹا کہ مجھے لگا کہ الٹتے الٹتے بچی ہے--!

پھر تیز رفتاری کے ریکارڈ بناتی ہوئی، اندھیروں کو چیرتی ہوئی نکلی اور ایک مقام پر جا کر اسی شدت سے بریک لگائے، ایک نئی سمت میں مڑی-- اندر اس قدر خاموشی تھی کہ جیسے ہر کسی کو سانپ سونگھ گیا ہو--!

اب بھی اس کی رفتار سو میل فی گھنٹہ سے کم نہ تھی--!

ڈیک پر ایک ہی آواز متواتر گونج رہی تھی۔

"-- حق علی علی-- حق مولا علی--"

سامنے ایک بلب ہوا میں جلتا نظر آیا--

گاڑی کی تیز روشنیوں میں کرامت علی اور یحییٰ قیصر کھڑے حیرت سے اسی گاڑی کو اپنی طرف آتا دیکھ رہے تھے-- ہمارا کیمپ ہمارے سامنے تھا--

وہ پوری رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا کیمپ کے بیچوں بیچ گاڑی لایا-- اتنی زور سے بریک لگائے کہ ریت میں پڑے باریک اور چھوٹے پتھروں سے بھی شرارے نکل آئے-- اور اس نے گاڑی لا کر عین کیمپنگ کے درمیان میں کھڑی کر دی--!!!

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے-- لوگ اترے اور کھانے پر پل پڑے-- میں سیدھا خرم شہزاد ڈرائیور کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا-- کہ پوچھوں یہ سب اتنی آسانی سے کیسے ہو گیا-- عالم استغراق میں ہوا کیا کہ راستہ یوں مل گیا کہ جیسے ہر موڑ اور نشانی اسے دکھائی گئی ہو، بڑی تفصیل سے بتائی گئی ہو--!

ڈرائیور خرم شہزاد اپنی سیٹ پر ابھی تک بیٹھا تھا-- میں نے اس کا شیشہ بجایا اور اپنا سوال اس کے آگے رکھ دیا-- جو اس نے بتایا، وہ حرف بہ حرف یوں تھا--!

"-- آغا صاحب-- اس چوک میں رستہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا-- میں نے فیصلہ کیا کہ میری ماں نے بتایا تھا کہ جب کسی مشکل میں پھنس جاؤ-- کوئی رہنمائی نہ ملتی ہو تو آقائے دو جہاں صلعم اور ان کے بھائی حضرت علی

ابن ابی طالب سے مدد مانگو--- میں خالص سنی العقیدہ مسلمان ہوں مگر جانتا ہوں کہ زمین کے اصل وارث کون ہیں، انہی کو سب راستے بھی معلوم ہیں۔ میں نے گاڑی میں آ کر ان ہستیوں کے نام کی قوالی لگائی --- درود شریف کے بعد نادعلی پڑھنا شروع کی --- ابھی تیرہ مرتبہ ہی پڑھی تھی کہ کسی ہستی نے آ کر میرے دائیں طرف کھڑے ہو کر بتایا کہ پریشان کیوں ہوتا ہے --- دائیں طرف مڑ، پھر سیدھا جا، کافی آگے ایک درخت آئے گا، اس درخت سے بھی دائیں طرف مڑ جا، پھر سیدھا جا، وہاں بہت سی جھاڑیاں بائیں طرف کو آئیں گی --- تو جھاڑیوں سے پہلے ہی مزید دائیں طرف مڑ جانا --- سامنے سیدھے ہی چلے جانا، تم سب کا گھر آ جائے گا --- چل جلدی کر، بچوں کو بہت بھوک لگی ہے ---"!!!

✽

باب ۳۴

چولستان کے صحرا میں آخری بون فائر
اور وہ کہتی ہے
”میں پیاسی ہوں اور تم اِس سفید چاندی پانی سے منہ کیوں دُھوتے ہو--!“

جتنی دیر میں نامعلوم درویش سے بات مکمل ہوئی، اتنی دیر میں الاؤ روشن ہو چکا تھا--!

کچھ لوگوں کو تکے کبابوں اور کوکا کولا نے خمار چڑھا دیا اور کچھ کو نہیں چڑھایا--!

جن کو دانہ گندم اور مشروب مغرب نے خمار آلودہ کیا وہ رنگین خیموں کے رنگین سایوں میں رنگین خوابوں میں کھو گئے اور ہم جیسوں کو کہ جن پر دانہ گندم، خمار آگہیں نہیں ہوتا، وہ آ کر بون فائر کے شعلوں اور اونچی اڑتی، چٹ پٹ چنگاریوں کا مزا لینے لگے-- ہوا کی خنکی اور آگ کی گرماہٹ نے مل کر نیند کو کوسوں دور اڑا دیا۔

شاعری سے شغف اور دلچسپی حضرت انسان میں ازل سے موجود ہے-- مگر اندازہ ہوا کہ ذوق لطیف بدل چکا ہے-- پہلے کبھی ایسی پراسرار اور نزاکت بھری محفلوں میں، ایسے ویرانوں اور بنجر راتوں میں قابل قدر شعراء کے اشعار سنائے جاتے تھے، جس سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا تھا-- اول یہ کہ حاضرین محفل میں ذوق شعری کتنا، کس معیار کا ہے اور دوسرے یہ کہ ان کے اشعار کا انتخاب کس درجے اور علمی سطح کا ہے-- پھر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ

تلفظ، طرز، بیان، شعری اسلوب منتخب شعراُن کی علمی قابلیت کوظاہر کرتا تھا--اگلے مرحلے میں بیت بازی نے اپنی جگہ بنائی جو یادداشت، حاضر جوابی اور فوری انتخاب شعر سے شرکائے محفل کی ادبی اپچ میں عزت افزائی کا سبب بنا--مگر صاحب، اب افسوس اور شرمندگی سے کہنا پڑتا ہے کہ مشہور عصری اور قدیم شعراء کے ناموں سے بھی نئی نسل واقف نہیں ہے--اور اس امر کو باعث شرمندگی وندامت بھی نہیں سمجھتی ہے--اب معیار بدل چکے ہیں--یہاں بھی وہی ہو رہا تھا جو کہ موجودہ عہد میں سکہ رائج الوقت ہے--!

آپ یقیناً پوچھیں گے کہ شاعری میں موجودہ عہد کا سکہ رائج الوقت کیا ہے--تو میں بڑے ادب مگر افسوس صد افسوس کے ساتھ عرض کروں گا-- بلکہ نئی نسل سے جان اور عزت وآبرو کی امان کے ساتھ عرض کرنے کی گستاخی کروں گا کہ وہ ہے، فلمی شاعری--

فلمی شاعری، نئی نسل کی گھٹی میں موجود ہے--ان کو نہیں معلوم کہ اردو کے کلاسک شعراء میں کیسے کیسے یگانہ روزگار شعرائے ہیں، ان کو نہیں معلوم کہ جدید شعراء میں کیسے کیسے نامی گرامی شعراء ہیں--ان کو تو صرف فلمی گانے یاد ہیں اور ان کا المیہ بھی یہ ہے کہ ان کو فلمی نغموں کے بول بھی پوری طرح یاد نہیں ہیں؛ صرف طرز، لے اور دو حرفیاں نشانی کے طور پر ازبر ہیں کہ انہی پر اتراتے ہیں--شرمندگی کا لفظ ان کی ذاتی ڈکشنری میں موجود ہی نہیں ہے--سو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے گانوں کے بول بولتے ہیں کہ جو قابل شرم ہیں اور مانع حیا ہیں--اس عمل کے دوران عبائے قبائے میں لپٹی لڑکی کا بھی وہی حال ہے کہ جو سر پر دوپٹہ نہ رکھنے والی کا ہے۔ میں معذرت کے ساتھ سب بچیوں کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانک رہا-- جو حیا والی ہیں، وہ یا تو ایسی محفل سے دور بیٹھتی ہیں یا شریک ہی نہیں ہوتیں-- جو شریک ہوتی ہیں، وہ اشارے کنایوں سے پیغام رسانی کے پورے پورے فرائض ادا کرتی ہیں--جب کام مکمل اور مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر سے وہی پرانا، بوسیدہ اور تار تار لبادہ اوڑھ کر پارسائی کے ڈونگرے برساتی ہیں--!

فلمی گانوں کی یہ محفل، جس کا کوئی ہندوانہ نام آج کل نوجوانوں میں "انتاکشری" کے نام سے مقبول ہے--یہاں بھی خوب گرم ہوا--درجہ حرارت بون فائر کے الاؤ کی وجہ سے نہیں بڑھا تھا بلکہ صنف نازک کے گلابی ہونٹوں سے ادا ہونے والے فلمی نغموں سے بڑھا تھا--یہاں تک کہ صحرا کی برفیلی سرد ہوائیں میرے جسم کو بری طرح کپکپاتی تھیں--مگر جوانوں کے بدن سندر چہروں، سریلی آوازوں اور صنف نازک کی بے باک سرمستی سے گرمائے جا رہے تھے--یہاں تک کہ صبح ساڑھے چار سے صبح کے پونے سات بجنے لگے؛ سردیوں کا موسم ہونے کی

وجہ سے طلوع آفتاب کا سپیدۂ سحر ظاہر ہونے میں ذرا دیر لگی--تب جا کر اپنے اپنے خیموں کا رخ کیا گیا--!

صبح نو بجے کے لگ بھگ، اس وقت آنکھ کھلی کہ جب خیمہ اندر سے، تمازت آفتاب کی سبب جل جل کے تندور بن چکا تھا--اگر وہ آگ کا گولہ نہ بن گیا ہوتا تو شاید دوپہر کو ہی آنکھ کھلتی--

نیلے آسمان پر موٹر سائیکل گلائیڈر پروازوں پر پروازیں کرنے میں مصروف تھا--!

دھوپ میں ہلکی ہلکی گرمی کی شدت کے ساتھ فروری کی گلابی سردی بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی--!

آج ۱۴ فروری ۲۰۱۶ء اتوار ہے۔

لوگ دنیا بھر میں آج کا دن دو انداز میں منا رہے ہیں۔

کچھ لوگ ویلنٹائن ڈے کے طور پر

اور کچھ یوم حیا کے طور پر

اور میں یا ہم--آج کا دن چولستان کے صحرا میں--!

آج میرا ویلنٹائن، چولستان کا صحرا ہے--!

ایسا ویلنٹائن صحرا کہ جس میں دور دور تک پانی نہیں ملتا--بس ایک ہینڈ پمپ کسی بزرگ کی دعا سے دراوڑ کی مسجد کے پہلو میں دن رات چلتا ہے--!

میں عالم تصور میں دیکھتا ہوں کہ میرے اردگرد چولستان کا سیاہ نایاب ہرن اور ان کی سنہری اور جوان ہرنیاں بھاگی پھرتی ہیں--!

اور اُدھر جو قطار اندر قطار پنہارنیں دکھائی دیتی ہیں، وہ سنہری رنگ روپ والیاں نہیں ہیں، آبنوسی سیاہ ہیں مگر ان میں سے بعض اپنے نقوش، قد کاٹھ، صراحی دار کمر، بھاری جوبن اور پُر ترنگ ناز و انداز کے اعتبار سے بے پناہ خوبصورت ہیں--!

میں اپنے آگ بگولہ تندور خیمے سے باہر آتا ہوں--کوئی باڈی بلڈنگ کے آسن جمائے ہوئے تھا، کوئی اپنے خیمے کے پچھواڑے جھاڑیوں کی گول اور محفوظ آڑ میں فرائض ضروریہ ادا کرنے میں مصروف تھا، کوئی منہ ہاتھ دھونے میں مگن تھا اور جو لوگ اس قسم کے امور سے فارغ تھے یا ہو چکے تھے، وہ دور دور صحرا میں سیر گشت سے لطف اندوز ہو رہے تھے--!

نیلے بڑے خیمے میں باورچی خانے کا دروازہ نصف کھلا تھا اور وہاں سے بلا مبالغہ انڈے فرائی ہونے کی بہت اچھی خوشبو آ رہی تھی -- گویا باورچی یحییٰ قیصر سیاحوں کو ناشتہ بنا بنا کر دے رہا تھا --!

میرے خیمے کے بالکل عین پیچھے کافی گھنی ببول کی جھاڑیاں تھیں، میں نے ایک اپنی بیڈ شیٹ لی اور اس طرح پھیلا کر جھاڑیوں پر ڈالی کہ زبردست واش روم بن گیا -- آپ حضرات سے کیا چھپانا، خوب احسن طریقے سے محظوظ ہوا کہ طبیعت خوش باش اور ہلکی پھلکی ہو گئی -- اصل میں ضرورت ایجاد کی والدہ ماجدہ ہوتی ہیں، مذکورہ محظوظ فارمولا خواتین کی ایجاد تھا، جس کو ہم نے اسی انداز میں اپنا کر دل و جان سے سراہا --!

اب منہ دھونے کا مرحلہ تھا -- وہ جو پانی کی وافر بوتلیں بہاول پور میں ناشتے کے بعد خریدی تھیں -- اب ان ہی کے بے دریغ استعمال کا وقت تھا -- ہمارے خیمے میں ابھی بھی اللہ کے فضل سے پانچ بوتلیں موجود تھیں -- میں نے فراخ دلی سے ایک بوتل اٹھائی اور ذرا پرے ہٹ کر منرل واٹر سے منہ پر جمی گرد اتارنے کے لیے چھپکے مارنے لگا -- ابھی دو چار چھپکے ہی مارے تھے کہ ایک صحرائی لڑکی، عمر کوئی بارہ برس کی ہو گی، ننگے پیر بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔

چڑھے سانس کے ساتھ بولی۔

"-- اتنے سفید اور میٹھے پانی کو منہ صاف کر کے ضائع کیوں کرتے ہو --؟؟؟"

میں اپنا منہ دھوتے دھوتے رک جاتا ہوں۔

وہ اردو اور سرائیکی کی ملغوبہ زبان میں سوالیہ اور پریشان کن آنکھوں سے کہہ رہی تھی -- شاید وہ سمجھی کہ میں نے اس کی بات سنی نہیں یا سمجھی نہیں -- وہ پھر بولی۔

"-- یہ پانی ضائع نہ کرو -- مجھے یہ سفید پانی پلا دو -- میں نے ایسا سفید پانی کبھی نہیں پیا -- تم بہت امیر آدمی لگتے ہو کہ اس "چاندی پانی" سے اپنا منہ دھوتے ہو -- منہ کو نہ دھو، مجھے پلا دو --"

میں نے اس کی نیلی سیاہ آنکھوں میں امید اور حسرت کے دیے جلتے دیکھے۔

میرا دل کانپ گیا -- میں کیا جانوں اس سفید چاندی پانی کی قدر، جو یہ ننھی سی جان جانتی ہے --

"-- کیسے پیو گی تم --؟" میں نے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں، ہتھیلیوں کی اوک بنا کر پانی پینے کی خواہش کا اظہار کرے گی -- مگر اس نے ایسا نہ کیا -- اس نے دائیں بائیں دیکھا -- سامنے کی جھاڑیوں میں پھنسا ہوا سفید تھرل پور کا گلاس، کانٹوں

میں ہاتھ ڈال کر نکال لیا-- اسے اپنے میلے پلو سے رگڑ کر صاف کیا اور گلاس میرے آگے کر دیا۔
میں نے خاموشی سے پانی، گلاس میں انڈیلا-- وہ ایک سانس میں پی گئی-- مشکور و ممنون نظروں سے مجھے دیکھا اور گلاس کو مزید پانی کے لیے میرے آگے کر دیا-- اس نے چار گلاس سفید پانی کے پیئے-- شکر گزار نظروں سے پھر دیکھا، کچھ نہ بولی، بس اُس کی ہرنی جیسی آنکھیں بولتی تھیں اور پھر وہ صحرا کی طرف صحرائی ہرنی کی طرح خاموشی سے قلانچیں بھرتی دوڑ گئی--!
میں کھڑا فقط دیکھتا رہا-- یہاں تک کہ اس کے ہیولے اور میرے درمیان ریت کا بگولہ آ گیا-- اور سب چولستانی مٹی کی دھند میں تحلیل ہو گیا--!!!

باب ۳۵

چولستان جیپ ریلی ۲۰۱۶ء

آسمان پر فوٹو ڈرون اور زمین پر دبیز دھول اُڑتی تھی--!

صبح صبح عجب واقعہ ہوا--!

میں، وجدان اور حیدر اپنا تمبو چھوڑ کر ذرا سی دیر کو اِدھر اُدھر ہوئے--شاید ایک منٹ یا دو منٹ کے لیے کہ وہ اندوہ ناک حادثہ ہو گیا--!

جب خیمے میں پینے کا پانی لینے گئے تو معلوم ہوا کہ پانی کی بوتلیں چوری ہو گئیں--!

خاموشی سے ڈھنڈیا شروع کی گئی--کچھ پتہ نہ چلا--!

اس لق و دق صحرا میں سب کے لیے سب سے اہم اور نایاب چیز سفید چاندی پانی ہی تھا--وہی کسی نے موقع پا کر چابک دستی سے اڑا لیا--!

عین اسی وقت ہمارے پڑوسیوں کے تمبو کے درمیان فقط ایک منظر ہمیں دیکھنے کو مل رہا تھا--دو خود غرض اور چالاک سیانے، چار بھری سیل بند بوتلیں پاس رکھے تھے--ان میں سے ایک گھڑا، دوسرے کا منہ، ہاتھ بازو صابن سے رگڑ رگڑ کر دھلوا رہا تھا--منہ دھونے والا صابن سے رگڑ رگڑ کر اپنی کھال چمکا رہا تھا اور دوسرا جوڑی دار

ایسے پانی کی دھار اس کی صابن زدہ جلد پر بہاتا تھا کہ جیسے مال حرام کو خرچ کرتے دکھ نہیں ہوتا -- ہمیں شدید پیاس لگی تھی اور مزید پانی ملنے کا امکان نہیں تھا -- ہم تینوں بے بسی اور خاموشی سے پینے کے پانی سے جسم دھلنے کا منظر دیکھتے رہے -- حیدر اور وجدان نے تو صاف کہہ دیا کہ ہو نہ ہو -- یہ ہاتھ کی صفائی انہی دونوں نے کمال مہارت سے موقع پا کر دکھائی ہے --!

اتنے میں عمر فرحان بھی آ گیا -- ہم نے بتایا کہ نا معلوم چور ہماری پانی کی بوتلوں پر موقع پا کر ہاتھ صاف کر گئے ہیں -- وہ کہنے لگا کہ میں نے دو بوتلیں اپنے بیگ میں آڑے وقت کے لیے سنبھال کر چھپا رکھی ہیں، ابھی لایا -- یہ دونوں بد فطرت وہی تھے کہ جن کو مولا علیؑ کے نام سے نفرت اور کھانے پر بھنبھناتی مکھیوں سے محبت تھی --!

جو دو بوتلیں فرحان لایا، ان میں سے ایک بوتل ہم نے اپنے خیمے میں مزید آڑے وقت کے لیے بیگ میں چھپا دی اور دوسری بوتل سے سب نے پانی اور غصے کی پیاس بجھائی -- چونکہ ہم نے واردات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ مگر سمجھتے سب تھے -- اسی لیے خاموش رہے -- اسی اثنا میں ان دونوں میں سے ایک سیدھا ہمارے خیمے کے دروازے پر آیا، اور بولا "-- ایک بوتل پانی مل جائے گا --؟"

اس سے پہلے کہ ہم جواب دیتے، اس کمینے چور نے اپنی گردن خیمے میں ڈالی، ہمارا جواب سنے بغیر سیل بند بوتل اٹھائی اور قصائی کی طرح ایک لمحے میں کھولی، دو گھونٹ پانی پیا اور بھاگ کر اپنے ساتھی کے پاس گیا اور اس کا صابن لگا منہ دھلوانے لگا -- ہم نے اس بے باکی اور بے غیرتی پر خاموشی اختیار کی اور ہر قسم کی منہ ماری سے اجتناب اختیار کر کے چپ ہو رہے --!

جب کوچ میں سوئے لوگ آئے تو میں نے بس اتنا کہا کہ یار پتہ نہیں کس بد بخت نے ہمارا پینے کا پانی چرا لیا -- ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا تو ان دونوں پانی کے لٹیروں نے اس چوری کا الزام بڑے دھڑلے سے ارشد عالم خان پٹھان پر سر عام لگا دیا -- ارشد عالم نہایت شریف نوجوان تھا، ہم نے حالات خراب ہوتے دیکھے تو بات کو مذاق میں لے گئے تاکہ بد مزگی نہ ہو -- مگر ان کی بد قسمتی کہ کچھ لوگ اس سینہ زوری کا منظر دور اپنی کوسٹر میں بیٹھے ونڈ اسکرین میں سے دیکھ رہے تھے -- انہوں نے ہمیں بتا دیا کہ ہمارے پانی کے چور کون ہیں -- وہی جو ارشد عالم خان پر الزام تراشی کر رہے تھے اور جن پر ہمیں قوی شک تھا --!

دنیا کی صبح جب بھی ہوتی ہو، ہماری صبح تو اب ہی ہوئی تھی --!

جب بھی کچن ٹینٹ سے ہماری جانب ہوا کا جھونکا آتا، ناشتہ بننے کی خوشبو اشتہا انگیزی پیدا کرتی تھی --

حیدر اور عمر فرحان کو تمبو کی حفاظت پر چھوڑا اور میں اور وجدان کچن میں آ گئے۔

یہاں کی دنیا ہی اور تھی --- یحیٰی گیس سلنڈر سے چولہا جلائے اور اپنے ارد گرد انڈوں کی ٹوکریاں، ڈبل روٹیاں، رات کے بچے تکے، نان رکھے بیٹھا تھا --- چائے کا بڑا سا دیگچہ --- ساتھ ہی رکھا تھا، جس کا جتنا دل چاہے چائے نوش جان کرے، انڈوں کا آملیٹ اپنی مرضی کا ہرا مصالحہ اور نمک مرچ ڈلوا کر تازہ بہ تازہ اپنی پسند کا بنوائے --- سلائس پر جام لگائے یا آملیٹ، پوری آزادی اور انتخاب کا حق دیا گیا تھا، اپنے سیاحوں کو --- !

جب میری باری آئی تو میں یحیٰی تک کے ساتھ بچھی پیڑھی پر بیٹھ گیا ---

" --- سر، حکم کریں، تکے، سلائس، جام، انڈا ابلا ہوا یا آملیٹ --- ؟" یحیٰی نے بڑے پریم سے پوچھا۔

" --- چار انڈوں کا آملیٹ، سبز مرچ، لال مرچ اور پیاز نمک ڈال کے بنا دو ---" میں نے اپنی پسند کہہ دی۔

" --- آغا صاحب، ادرک بھی ڈال دوں، ہاضمہ اچھا رہے گا --- کھانا اب شام تک ہی ملنے کا امکان ہے، خوب پیٹ بھر کے ناشتہ کر لیں، پھر نہ کہیے گا کہ بتایا نہیں ---" یحیٰی نے مسکرا کر کہا۔

" --- میاں اگر یہ بات ہے تو انڈے چار کی بجائے چھ کر دو ---" میں نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھا کر کہا۔

" --- سر، دس کرا لیں --- ہمیں کوئی تنگی نہیں ہے ---" یحیٰی نے خوش دلی سے کہا۔

" --- نہیں بھائی، میں مذاق کر رہا تھا، بس تین کافی ہیں ---" میں نے کہا۔

" --- آغا صاحب، میں نے فرائی پین میں چار پھینٹ دیے ہیں --- ہاہاہا ---" وہ بولا۔

فرش پر ایک طرف چٹائی بچھی تھی، جاذب اور صبا جام اور سلائس اڑا رہے تھے۔ خرم شہزاد نے ٹینٹ کا پچھلا دروازہ کھول کر اونٹ کی طرح گردن اندر ڈالی ہوئی تھی اور چائے پر چائے لنڈھا رہا تھا --- وجدان دروازے کے ایک طرف کھڑا بھرپور ناشتے سے کھڑے کھڑے لطف اندوز ہو رہا تھا --- میں نے ایک ٹرے میں اپنا ناشتہ چائے رکھی اور آ کر اپنے خیمے کے دروازے پر کھلی فضا میں بچھے سلیپنگ میٹ پر بیٹھ گیا اور مزے لے لے کر ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگا --- حیدر اور فرحان کو جلدی سے کچن ٹینٹ بھیجا اور اپنے تمبو کی چوکیداری سنبھال لی --- !

آج کے دن کا سب سے "ہاٹ فیوریٹ ایونٹ" چولستان جیپ اینڈ کار ریلی کا فائنل تھا کہ جس نے پورے پاکستان کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا --- دُور دُور سے لوگ اس میں شرکت کے لیے کچے دھاگے سے بندھے

چلے آئے تھے--- ایک وہ جنھوں نے اپنی طرح طرح کی گاڑیوں کے ساتھ اس ریس میں حصہ لینا تھا اور دوسرے وہ لوگ جو ریت کے صحرا میں، ہماری طرح ان شاہکار مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے--- ان دو طرح کے لوگوں کے علاوہ گاڑیوں کے شوقین حضرات بھی تھے، جن کے جذبات و احساسات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے--- ایسے ایسے ماڈلز کی عام اور نایاب گاڑیاں جیپیں اس ریس میں شریک تھیں کہ آدمی حیرت زدہ رہ جائے--- پھر فوٹوگرافی کے شوقین فوٹوگرافرز کی تعداد بھی بے پناہ تھی، جو ریس ٹریک پر صبح تڑکے سے اپنے کیمرے لگائے اور جمائے بیٹھے تھے---!

ہماری کوسٹر اپنے سیاح مسافران کو لیے چولستان جیپ ریلی کے اسٹارٹنگ پوائنٹ کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی--- جوں جوں اسٹارٹنگ پوائنٹ قریب آتا جا رہا تھا، گہما گہمی ایسے بڑھتی جاتی تھی کہ لگتا تھا کہ ہر سمت اتنا وسیع وعریض میلہ لگا ہوا ہے کہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا--- سب کی دعا یہی تھی کہ کاش ہماری کوسٹر کو عین اسٹارٹنگ پوائنٹ پر پارکنگ کی عمدہ جگہ مل جائے، مگر ہر کسی کا مایوسی سے کہنا یہی تھا کہ جس قدر گاڑیوں اور دیگر تماشیوں کا رش ہے، اس کی موجودگی میں ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔

لیجیے صاحب--- کار ریلی ولیج آ گیا--- ہزاروں خیمے، سینکڑوں اسٹال، اَن گنت اور طرح طرح کی عارضی دکانیں--- خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میڈیا اور درجنوں ٹی وی چینلز کی وسیع وعریض کوریج--- سینکڑوں ریڑھی والے--- کوئی ریڑھیوں پر برف کے ٹبوں میں پانی کی بوتلیں لگائے ہوئے، کوئی طرح طرح کے کولڈ ڈرنکس سجائے ہوئے اور کوئی رومال پَرنے بیچتا ہوا--- غرض کچھ مت پوچھیے--- کسی نے ریڑھی پر سگریٹ پان اور کسی نے تازہ بہ تازہ پکوڑے تلنے کا سامان سجایا ہوا تھا--- بہت سے خیمے، کاروں اور موٹر سائیکلوں کے مستریوں نے لگا رکھے تھے کہ اُن کو ان چیزوں کی مرمت میں سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی--- گویا آج کے دن اس مقام پر ہر کاروباری پر دولت کا ہُن برس رہا تھا اور ہم سیاحوں پر دھول مٹی ایسے برس رہی تھی کہ لگتا تھا کہ فقط طوفانی گرد میں سانس لیتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ ایک تولہ مٹی سیدھی حلق اور پھیپھڑوں میں بے دریغ جاتی ہے---!

خوش قسمتی دیکھیے کہ قدرت شکر خورے کو شکر ہی دیتی ہے--- کار ریلی کے اسٹارٹنگ زیرو پوائنٹ کے عین سامنے ہمیں ایسی اچھی پارکنگ مل گئی کہ جیسے ہمارے لیے، ہماری پسند کی جگہ کسی نے خاص طور پر روک کر رکھی ہو---!

باہر نکل کر دیکھا تو زمین سے آسمان تک گرد کے طوفان کی طرح مٹی چڑھی ہوئی تھی۔ لوگوں کی موجودگی کا عالم یہ تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا--- ہوا میں باریک مٹی اس طرح اڑتی تھی کہ سانس آزادی سے لینا محال تھا۔ وجہ

اس کی یہ تھی کہ ریس ٹریک پر تو امن تھا، مگر اردگرد کے میدانوں میں جو گاڑیاں، شتر بے مہار کی طرح دوڑتی پھرتی تھیں، مٹی ان کی تیز رفتاری سے اڑتی تھی--لگتا تھا کہ یہاں ہر کوئی سواری والا مٹی اڑا کر چولستان کار فیسٹیول میں اپنا بساط بھر حصہ ڈال رہا ہے--!

فیصلہ یہ ہوا کہ اگر کسی کو ریس کے آغاز کا سیاہ و سفید خانے دار جھنڈا گرتے اور گاڑی کے بگٹٹ بھاگنے کا منظر سکون قلب سے دیکھنا ہے تو وہ کوچ کی چھت پر چڑھ جائے--یہ ایک اچھا فیصلہ تھا--میں نے بھی اس فیصلے کو قبول کیا--کوچ کی چھت پر پہنچنے اور چڑھنے کے لیے کوئی سیڑھی نہیں تھی۔ بس، طریقہ یہ تھا کہ داخلی دروازے کو کھول لیں، اس کی کھڑکی سے شیشہ دوسری طرف کھسکا دیں۔ پہلا قدم کھڑکی میں، دوسرا قدم دروازے کے اوپر رکھیں، پھر ہاتھ لمبا کر کے چھت پر سامان رکھنے کی حفاظتی گرل کو مضبوطی سے پکڑیں، جسم کو ٹِلک دے کر پیر اوپر اٹھالیں اور پھر اپنے بازوؤں کی طاقت پر اعتماد کرتے ہوئے، جسم کو خود ہی چھت تک لے جائیں--میرے اس آخری مرحلے کو حیدر نے آسان کر دیا، میرے آگے بڑھے ہاتھ کو پکڑا اور اوپر کھینچ لیا--لیجیے جناب، بندہ بھی کوچ کی اونچی چھت سے ہر طرف نظارہ کرنے کے لائق ہوگیا اور نوجوانوں کی قطار میں عزت و احترام سے شامل ہوگیا--!

یہاں بلندی سے چاروں طرف کا نظارہ سب سے زیادہ دل فریب اور واضح تھا--چولستان کار ریلی کا اسٹارٹنگ پوائنٹ عین ہمارے سامنے اور نیچے تھا--خانے دار جھنڈی والے ریفری آنکھوں کے سامنے ریس ٹریک کے دونوں طرف کھڑے تھے، جو فائر کی آواز پر بیک وقت فضا میں لہراتے جھنڈوں کو نیچے گراتے تو اسٹارٹنگ لائن پر کھڑی گاڑی، جو ریس پر ریس دے رہی ہوتی، اپنے ایکسلریٹر کو طوفانی رفتار سے دباتی کہ ان کے پچھلے پھڑ پھڑاتے اور پر تولتے پہیوں سے ایک گرد کا گول سا طوفان بڑی ادائے بے نیازی اور طمطراق سے یکا یک فضا میں کسی ایٹمی دھماکے کی طرح بلند ہوتا اور گاڑی ریس ٹریک پر بجلی کی طرح دوڑتی--اس کو اس انداز مستانہ میں بے خود دیوانہ وار بڑھتا دیکھ کر ٹریک پر گردنیں نکالے لوگ کئی کئی قدم، بے ساختہ پیچھے ہٹ جاتے اور دوڑنے والی گاڑی چند سیکنڈ میں ہوا سے باتیں کرتی صحرا میں اپنے مخصوص راستے پر دیوانہ وار دوڑتی نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور اس کے پہیوں سے اڑنے والی گرد بہت دیر تک ٹریک کے دونوں طرف کھڑے لوگوں پر پھوار کی طرح برستی رہتی--ٹھیک کم از کم پندرہ منٹ بعد ریس انتظامیہ دوسری منتظر گاڑی کو اذنِ روانگی اسی پروٹوکول کے ساتھ دیتی تھی--!

ریس میں حصہ لینے والی گاڑیوں کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی--ہر ریسی گاڑی کی اپنی مخصوص سج دھج تھی--ہر گاڑی کے مالک نے اپنی گاڑی کو اپنی پسند کے مطابق ایک سے ایک انوکھے انداز میں بنا سجا رکھا

تھا-- رنگ برنگی اسٹیکر، اور طرح طرح کا باڈی پینٹ کررکھا تھا-- گاڑی کی چھت کا رنگ اور ہے تو اگلے بونٹ کا اور طرح سے ہے، سائیڈیں رنگ رنگ کے انداز میں ایک سے بڑھ کر ایک رنگوں سے آراستہ-- خاص طور پر ریس انتظامیہ کی طرف سے جو شرکت کی رجسٹریشن کے نمبر الاٹ کیئے گئے تھے، ان کو گاڑی کی باڈی کی ہر سمت یہاں تک کہ چھتوں پر بھی ایسی دل فریب خوبصورتی سے لکھا اور لگایا گیا تھا کہ ہم تماشیئوں کا دل بھی ان کی لش پش کو دیکھ کر خواہ مخواہ جذباتی ہوا جاتا تھا-- البتہ ہر ریسی گاڑی میں کوئی فالتو سامان اندر موجود نہیں تھا، مثلاً پچھلی تمام سیٹوں اور باہر کے بمپروں سے یہ گاڑیاں قطعی آزاد تھیں-- صاف دکھائی دیتا تھا کہ ہر گاڑی میں آگ بجھانے کا سامان، لازمی رکھا تھا اور ہر طرح کے وزن کو ہٹا کر گاڑی کو ہلکا پھلکا کر دیا گیا تھا۔

ادھر زیرو پوائنٹ پر ہماری کوچ کے برابر برابر میڈیا ٹیلی ویژن کی بے شمار او، پی وینز اپنی اپنی گاڑیوں کی چھتوں پر سیٹلائٹ ڈشیں کھولے قطار اندر قطار کھڑی تھیں-- درجنوں ملکی اور غیر ملکی ٹی وی چینلز اپنے اپنے کیمرے لگائے، اس ریس کی لائیو کوریج کر رہے تھے؛ ان ٹی وی چینلز کی رپورٹر لڑکیاں کمال کی سج دھج میں تھیں اور مرد رپورٹر بھی بناؤ سنگھار اور اداؤں میں حسیناؤں سے کم نہیں تھے، وہ مرد رپورٹر اپنے چہروں کے کناروں پر ہوا سے اڑ کر آ جانے والی بالوں کی لٹوں کو گردن کے ایسے نازک ادا جھٹکوں سے پرے ہٹاتے کہ ان مردانہ اداؤں پر ہزار زنانیوں کی اداؤں کو قربان کیا جا سکتا تھا--!

آسمان پر میڈیا ٹیلی ویژن والوں کے فوٹو ویڈیو ڈرون ہر سمت اڑتے پھرتے تھے، جن کو ان کے او، پی ٹینٹوں سے رموٹ کنٹرول کیا جا رہا تھا-- اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمان پر اڑتے ڈرون، سورج کی تیز روشنی میں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ گویا ڈرونز کی پروازوں نے آسمان کو لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا دیا تھا--!

جب کوئی گاڑی دوڑنے کا اشارہ پانے والی ہوتی تو عین اس کے سامنے ٹریک کی فضا میں کئی کئی فوٹو ڈرون آ کر ساکت ہو جاتے۔ جیسے ہی گاڑی کو دوڑنے کا اشارہ ملتا، وہ ڈرونز فضا میں گاڑی کے آگے آگے ہواؤں میں تیرتے چلے جاتے۔ یہ منظر اور نظارہ دیکھنے میں بے پناہ خوبصورت اور جذباتی تھا کہ ان کے ہونے سے ٹریک کے دونوں طرف کھڑے لوگوں میں جوش اور ولولہ چنگاریاں بن کے پھوٹ پڑتا تھا-- جب گاڑی ڈرونز کی حد سے باہر نکل جاتی تو بے شمار ڈرونز سرخ اور نیلی بتیاں جلاتے مختلف سمتوں سے واپس اپنے اپنے کنٹرولر کے ہاتھوں پر آ کر اتر جاتے--!

باب ۳۶

میں کوسٹر کی چھت پر کھڑا چینل کو انٹرویو دیتا ہوں، اُدھر حسین بلتی، ٹیپو گرمانی کے ساتھ جیپ دوڑاتا ہے--!

میں کوچ کی چھت پر کھڑا اپنے اردگرد کے نظارے دیکھنے میں محو تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی--!
میں نے بے خیالی میں کال کرنے والے کا نام دیکھے بنا ہی فون آن کر لیا-- دوسری طرف سے ایک کھنکھناتی آواز سنائی دی۔

"-- آغا جی، کہاں ہیں اس وقت آپ-- آپ نے پہچانا نہیں میں صبح زہرا بول رہی ہوں، بچ ٹی وی سے--"

"-- میں اس وقت چولستان میں جیپ ریلی کے زیرو پوائنٹ پر ایک کوسٹر کی چھت پر کھڑا دنیا کی خوبصورتی اور جذباتیت کا نظارہ کر رہا ہوں--" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"-- اور میں آپ کو اپنی او بی وین کی چھت پر کھڑی دوربین سے دیکھ رہی ہوں، بالکل آپ کے دائیں جانب ساتویں گاڑی سے-- میں اپنے چینل کا ڈرون ڈھونڈ رہی تھی کہ آپ نظر آ گئے-- میں نے کہا کہ ضرور آغا صاحب ہی ہیں جو اپنے سفرنامے کا مواد کوسٹر کی چھت پر کھڑے ہو کر جمع کر رہے ہوں گے--" وہ بے تکان بولتی چلی

گئی۔

"--ہاہاہا--بس سمجھو یہی ہو رہا ہے--چولستان آج ایک نئی آن بان شان سے مجھے دکھائی دے رہا ہے--تم سناؤ، دھوپ میں کب سے ٹنگی ہو--؟"

"--سر ڈیوٹی ہے ڈیوٹی--آغا جی، آپ نے چھت سے بالکل نہیں اترنا، میں اپنے کیمرہ مین کو کہتی ہوں کہ وہ آپ کو اسی پوز میں کلوز کرے--جب میں آپ کو فون کروں تو فوراً اٹنڈ کر لیں، ہمارا چینل آپ کا فون اور سیٹلائٹ کیمرے سے لائیو انٹرویو کرے گا--"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا--میں وہیں دھوپ میں کھڑا--اپنے اردگرد فرشِ زمیں پر مختلف مناظر اور کلچر کے انداز دیکھنے میں مصروف ہو گیا--کوئی دس منٹ بعد صبح زہرا کا فون آ گیا--اور لائیو انٹرویو وایا سیٹلائٹ شروع ہو گیا--!

مجھے جو سب سے خوبصورت منظر اس اونچی جگہ سے کھڑے ہو کر لگتا تھا، وہ تھا کار ریسنگ کے زیرو پوائنٹ پر آ کر بجی سنوری گاڑی کا بڑی ادا سے کھڑے ہونا، پھر ڈرائیور اور اس کے معاون جوڑی دار یعنی کوارڈینیٹر کا برابر میں سیٹ پر بیٹھ کر مضطرب و بے قرار ہونا، اس کے بعد ڈرائیور کا ٹریک کے آغاز پر کھڑے ہو کر بار بار تباہ کن ریس دینا اور پھر کالے سفید خانے دار جھنڈے کا ایک ادائے بے نیازی سے فائر کے ساتھ گرنا اور پھر دیوانوں، مستانوں کی بدمستی کے ساتھ گاڑی کا ٹریک پر دیوانہ وار نکلنا اور دوڑنا اور ریت کے بادل اڑاتے صحرائے چولستان کی اتھاہ وسعتوں میں کہیں گم ہو جانا--!

مگر صاحب میں تو کوچ کی چھت پر، دھوپ میں کھڑا جل جل کر بدحال ہو چکا تھا۔ پہلے اس ٹی وی انٹرویو کی وجہ سے اور اب اس خوبصورت قدیم لینڈ کروزر جیپ کی وجہ سے، کہ جس کا ماڈل وہی تھا جو مشہور شیروں کے شکاری کینتھ اینڈرسن اور کرنل جیم کاربیٹ افریقہ اور سندر بن کے جنگلوں میں شکار کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔

کوئی رینجرز کے کرنل صاحب اس جیپ کے ڈرائیور یعنی کیموں ہار تھے--ان کی پوری فیملی ان کو سپورٹ کرنے کے لیے، ان کی خوبصورت اور حسین و جمیل جیپ کے گرد ٹریک پر جمع تھی--ماشاءاللہ کرنل صاحب کی فیملی بھی کافی بڑی تھی۔ لگتا تھا کہ پورے گھرانے کی خواتین، بچے، بالے، بوڑھے جوان ان کی حوصلہ افزائی کے لیے آئے ہوئے تھے اور ہر کوئی اسٹارٹنگ ٹریک پر ان کے اور ان کی ماہ جبیں جیپ کے ساتھ تصویریں اور سلفیاں بنوانے

میں دل و جان سے مگن تھا--خاندان اور دوستوں کے ساتھ تصویر کشی مکمل ہوتی تو اذن روانگی کا سگنل انتظامیہ کی جانب سے عطا کیا جاتا--اللہ جھوٹ نہ بلوائے کوئی پچاس سے زیادہ لوگوں نے تصویریں بنوائیں اور ہم لوگوں کا اس تیز تپتی دھوپ اور دھول میں سچ مچ حشر نشر سا ہو گیا تھا--!

یہ منظر اور حالات دیکھ کر میرے پاس کھڑے ایک نوجوان کے صبر کا پیمانہ سچ مچ لبریز ہو گیا--اس سے کسی نے یونہی پوچھ لیا کہ آخر یہ جیپ کب دوڑے گی، ہم لوگ اس کے چلنے کے انتظار میں کھڑے کھڑے جل کر کوئلہ ہو چکے ہیں--تو دوسرے من چلے نے عجیب بات کہی--کہنے لگا--

"--بھائی جی، ان کی فیملی میں ایک بچے کے آنے کا انتظار ہو رہا ہے، جب وہ آ جائے گا تو سلفی اور فوٹو بنانے کے بعد یہ دوڑ شروع کریں گے--"!

"--کون سا بچہ بھیا--؟؟؟" کسی نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"--وہی جو ابھی بس پیدا ہوا چاہتا ہے، وہ پیدا ہو کر آ جائے تو اس کے ساتھ سلفی بنا کر ریس شروع کرتے ہیں--!!!"

"--وہ کب پیدا ہو گا--؟" کسی نے معصومیت سے پوچھا۔

"--یار، بتایا تو ہے، بس وہ پیدا ہونے کی کوشش کر رہا ہے، تم سے صبر نہیں ہوتا کیا--"

نیچے سے خرم شکیب نے اونچی آواز میں خبر دی--!

"--ابھی ابھی مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ قلعہ دراوڑ عوام الناس کے لیے کھول دیا گیا ہے--"

یہ خبر یقیناً سب کے لیے پُرکشش تھی--سب ہی لوگ اس عظیم الشان ہزار سال پرانے قلعے کو اندر سے ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔

کوسٹر پھر صحرا میں قلعہ دراوڑ کی طرف دوڑنے لگی--باہر کی آب و ہوا میں رہنے سے ہم سب لوگوں کی صورتیں مٹی دھول کے لیپ سے بالکل ویسی ہی بن چکی تھیں کہ جیسی صورت گزشتہ رات جب صحرا میں علی رضا چنگیزی کو چھت پر چڑھانے اور گاڑی صحرا میں دوڑانے کے بعد بنی تھی۔ وہ تو رات تھی تو پردہ رہ گیا تھا، یہ دن تھا سو کچھ بھی چھپائے نہ چھپتا تھا--اس موقع پر وہی ویٹ ٹیشو دھڑا دھڑ کام آئے جو رفع حاجت کے لیے انگریزی لوٹے کے طور پر خریدے گئے تھے--!

ایک فون کال سے پتہ چلا کہ آخر کرنل صاحب نے ٹریک پر نومولود کے ساتھ سیلفی بنوا کر گاڑی دوڑا دی--!

عین اسی وقت ہمارے دوست، مشہور ٹریکر حسین بلتی، اپنے ساتھی ٹیپو گرمانی کے ساتھ اپنی گاڑی میں ٹریک کے زیرو پوائنٹ پر پہنچے--!

حسین بلتی کا آپ سے تعارف یہ ہے کہ یہ شکلاً خالص بلتی ہیں، دور سے دیکھنے پر آپ کو وہ فلپینو دکھائی دیتے ہیں۔ پڑھے لکھے اور تیز طرار آدمی ہیں--شمالی علاقہ جات میں ٹریکنگ کے لیے ان کی کمپنی دنیا بھر میں خاصی معروف ہے--غیر ملکی ان کی کمپنی کو کے ٹو، مشابرم، کونڈو گورالا، اور سنولیک کی سخت اور پُر مشقت مہمات کے لیے ترجیح دینا پسند کرتے ہیں--سنا ہے کہ حسین بلتی کے ٹو اور کونڈو گورالا، ایسے چڑھ جاتے ہیں جیسے بندر نتھیا گلی میں درختوں پر پھلانگتے پھرتے ہیں--پچھلے دنوں وہ سنولیک کی مہم جوئی پر جاتے ہوئے مجھے اور وجدان کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے، جس کا خرچہ برچہ، فی آدمی ایک لاکھ تیس ہزار تھا، مگر میرے اور وجدان کے لیے سو فیصد اعزازی فری تھا، مگر میں اُن کے ساتھ نہ جا سکا، جس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا--!

ان لوگوں کی گاڑی کا ریس الاٹنگ نمبر ۵۰۵ تھا۔

ٹیپو گرمانی ریس ڈرائیو اور نیوی گیٹر معاون کے فرائض حسین بلتی انجام دے رہے تھے۔

ان کی گاڑی ''ورم اپ'' ہونے کے لیے زیرو پوائنٹ پر کھڑی ریس پر ریس دباتی تھی، جیسے شیر حملہ کرنے اور لمبی چھلانگ لگانے سے پہلے اپنے پچھلے پیر دبا کر شکار پر اپنی آنکھیں گاڑ دیتی ہے--ان کی بچی بچی آنکھیں سامنے ریس ٹریک کو ایسے ہی شکاری نظروں سے دیکھ رہی تھیں--!

حسین بلتی سے ہماری دوستی کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے، مگر ٹریکنگ کے حوالے سے لگتا ہے کہ بہت قدیمی ہے--گذشتہ برس حسین بلتی نے فری آف کاسٹ سنولیک ٹریکنگ ہائیکنگ کی بھرپور دعوت دی مگر افسوس کہ میں اپنی ذاتی مصروفیات کے سبب پاکستان کی اس خوبصورتی سے لطف اندوز نہ ہو سکا، جس کا مجھے افسوس رہے گا--بہر حال اس پرخلوص دعوت کے لیے میں حسین بلتی کا خصوصی شکر گزار ہوں--میں نے حسین بلتی کو کہا کہ یار زندہ، صحبت باقی، انشاءاللہ پھر کبھی سہی--!

ہمارے دوستوں کے پاس 4000 cc--Wrengler Jeep تھی، جس کو ٹیپو گرمانی نے اس ریس میں شرکت کے لیے اپنی نگرانی میں سیٹ کرایا اور اس پر اپنی پسند کا رنگ و روغن کرا کے سجایا بنایا تھا۔

بقول حسین بلتی اس چولستانی کار ریس ریلی میں ان کا اصل اور جذباتی مقابلہ رونی پٹیل سے تھا -- رونی پٹیل گزشتہ کئی سالوں سے نہ صرف اس مقابلے میں حصہ لینے کا وسیع تجربہ رکھتا تھا اور یہ ریس ٹریک اس اعتبار سے اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جب کہ ہمارے دوستوں کا تجربہ کم تھا، مگر حوصلہ بلند تھا --!

ان کے رونی پٹیل سے مقابلے کی ٹیکنیکل وجہ یہ تھی کہ فسٹ کوالیفائنگ راؤنڈ میں رونی پٹیل اور ٹیپو کرمانی کے نمبر برابر برابر آئے تھے، یعنی 1.9 نمبرز --!

کچھ آپ کو کوالیفائنگ راؤنڈ کے بارے میں بتا دیں کہ یہ راؤنڈ فائنل سے پہلے کسی دن ہوتا ہے -- کوالیفائنگ راؤنڈ تین کلومیٹر کا ہوتا ہے۔ ٹیپو اور پٹیل نے یہ فاصلہ 1.9 منٹ میں طے کیا تھا -- جب کہ اس ریس کے ایک اور مشہور ہیرو وقار مگسی نے یہی فاصلہ 1.30 منٹ میں طے کر کے اپنی کیٹیگری میں اونچی پوزیشن بنائی تھی۔

اس موقع پر میں آپ کو اس چولستان جیپ ریلی ریس کی کچھ اور باتیں اور بنیادی اصول بھی بتانا چاہوں گا -- اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ کل آپ کا دل بھی اس میں شرکت کے لیے للچائے تو آپ کم از کم میری رہنمائی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا کر مجھے ڈھیروں دعائیں دینے کی پوزیشن میں ہوں -- لیکن سچی سچی بات کہوں، میرے پر نہ رہیے گا، اپنا بندوبست آپ کیجئے گا --!!!

ہر گاڑی میں دو بندے لازمی ہوتے ہیں -- ایک ڈرائیور کہ جس کا گاڑی میں ہونا اشد ضروری ہے، ورنہ کسی چیز کی کوئی گارنٹی نہیں ملتی -- ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ڈرائیور کا جوڑی دار کوارڈینیٹر کے طور پر ہوتا ہے، اس کا کام یہی ہے کہ ہر وقت رَولا ڈالے، ڈرائیور کو جھوٹی سچی ہدایات وقت بے وقت دیتا رہے اور دوران ریس ڈرائیور کو قطعی طور پر سونے نہ دے، اگر خود سو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے -- ریس کے دوران استاد جی کو روٹی پانی سگریٹ کا پوچھتا رہے، مگر صرف آفر کرے، کھلانے پلانے کی ہرگز کوشش نہ کرے -- کوارڈینیٹر اپنی سلفیاں جتنی چاہے بنائے مگر ڈرائیور کے ساتھ ہرگز ہرگز معانقے کی کوشش سے پرہیز کرے -- اور اگر اللہ کے فضل سے ڈرائیور ذات نازک ہو تو ہر قسم کی بدتمیزی اور بے تکلفی سے اجتناب کرے، ورنہ کسی بھی وقت وہ گاڑی الٹا کر اپنا انتقام لینے میں حق بجانب ہوں گی یا ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی بے وقت کی نوازشات سے دل برداشتہ ہو کر کوارڈینیٹر جی کی سیٹ بیلٹ کا ہک چپکے سے کھول دے اور وہ اچھل کر صحرا بُرد ہو جائیں --!

اور اگر اس کے برعکس ڈرائیور کوئی دل والا مرد ہو اور ساتھ میں کورڈینیٹر خاتون ہو تو ریس ہارنے کا امکان بہت واضح ہے، مگر جیتنے کا امکان بھی روشن ہوتا ہے -- ایسے میں دل ہارنا یا دل جیتنا ڈرائیور کے ہاتھ میں ہوتا ہے،

بس پر قانون زیادہ بے تکلف تبصرے کی اجازت نہیں دیتا، سو میں اپنے ہدایت نامے کی طرف واپس آتا ہوں--!

میں کہہ رہا تھا کہ ہر گاڑی میں دو بندے ہوتے ہیں-- ڈرائیور اور جوڑی دار--!

پورا ٹریک تقریباً بیضوی شکل کا ہوتا ہے-- اسٹارٹنگ پوائنٹ اور فنیشنگ پوائنٹ، چولستان کار ٹریک میں تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع ہیں-- آپ کو یاد ہوگا کہ رات جب ہم صحرا میں گم ہوئے تو بھٹک کر فنیشنگ پوائنٹ پر چڑھ گئے تھے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ہمارے کوچ ڈرائیور کا کہ اس نے عقل سے کام لے کر ہمیں ریس میں شامل ہونے سے بچا لیا تھا--!

کُل ٹریک کی لمبائی ۲۴۰ کلومیٹر ہے، جس کا نصف سرا رحیم یار خان شہر کے پاس سے واپس پلٹ کر یہاں تک آتا ہے۔ صحرائے دراوڑ سے رحیم یار خان کا اندرونی صحرائی راستہ، جس پر ریس ٹریک ہے، اونٹوں کے سفر کے ذریعے دو گھنٹے اور بذریعہ جیپ ایک گھنٹے کا ہے۔ اس بات کی تصدیق ہماری ہم سفر چولستان صبا اشرف نے کی، اس لیے کہ وہ رحیم یار خان کی رہنے والی ہیں۔

اس ٹریک میں کل ۱۳ اسٹر پوائنٹ بنائے گئے ہیں، جن کو C.P کہتے ہیں-- ہر CP پر ریس انتظامیہ کی طرف سے ٹریکٹر اور ایمبولینس ریس کے مہیا کردہ نقشے میں کھڑے دکھائے گئے تھے-- مگر بہ قول حسین جلتی یہ سہولت فقط مڈ پوائنٹ پر ہی مہیا کی گئی تھی--!

اس کار ریلی کا سرکاری نام کچھ یوں تھا۔

TDCP 11th Cholistan Jeep Rally--14. Feb. 2016

میڈ ریس پوائنٹ 120.8 کلومیٹر پر کہیں رحیم یار خان کے پاس تھا-- ریس کی فی گاڑی رجسٹریشن فیس مبلغ بیس ہزار روپے صرف تھی-- کہتے ہیں کہ پورے ٹریک پر کوئی ایمرجنسی بوتھ یا وائرلیس رابطے کا ذریعہ موجود نہیں تھا-- حسین جلتی اور نیپو گرمانی کو اس بات کا شدید دکھ تھا۔

ابتدائی کوالیفائنگ راؤنڈ کا اصول یہ تھا کہ جو گاڑی، رجسٹریشن کے بعد، تین کلومیٹر سب سے کم وقت میں طے کرے گی، وہی صبح ریس کے کیو میں سب سے آگے کھڑی ہوگی۔

قانونِ ریس کا سب سے اہم اور قابلِ ذکر اصول یہ دیا گیا تھا کہ ہر گاڑی والا اپنی گاڑی صحرائے چولستان کے ٹریک پر ۱۲۰ کلومیٹر کی رفتار سے ہی چلانے کا پابند تھا-- اس کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ صحرا میں ریتلے ٹیلوں اور اتھلی ریتلی دلدلوں میں اس سے کم رفتار سے گاڑی چلانا بہت خطرناک ہے--!

اب سنیئے حسین بلتی اور ٹیپو گرمانی کی ریس کہانی--!

ٹیپو گرمانی اپنی جیپ کے استاد جی یعنی ڈرائیور تھے اور حسین بلتی صاحب، دیسی زبان میں چھوٹے تھے یعنی کوارڈینیٹر--!

انھوں نے اپنی گاڑی صحرائی ٹریک پر دوڑا دی-- خیر خیریت سے CP 6 یعنی 80.2 کلومیٹر تک پہنچ گیے--

انھوں نے راستے میں CP 5 پر دیکھا کہ رونی پٹیل کی بیوی شازیہ پٹیل کی گاڑی خراب ہو کر ٹریک آؤٹ ہو چکی تھی اور وہ اپنی گاڑی کا بونٹ کھولے، سر پکڑے صحرا کی ریت پر بیٹھی تھی-- ٹیپو اور حسین بلتی اسے ہمدردی کا ہاتھ ہلا کر ریت کے بادل اڑاتے اس کے پاس سے گذر گیے--

مگر یہ انداز اور غرور قدرت کو پسند نہیں آیا-- اللہ جانے ٹیپو اور بلتی کو شازیہ پٹیل کی بد دعا لگ گئی یا نظر بد کھا گئی کہ ٹیپو بلتی کی گاڑی صرف تین کلومیٹر چل کر بڑی طرح "ٹو لورام" ہو گئی--!

اس وقت ریس کار نمبر ۵۰۵ جس میں ٹیپو اور بلتی تھے، CP 7 اور CP 8 کے کہیں درمیان میں تھی، اس کی انجن ہیٹ کی سوئی اچانک آسمان سے باتیں کرنے لگی، بونٹ سے دھواں نکلنے لگا اور گاڑی ہچکولے لینے لگی اور بیچ صحرا میں دوپہر تین بجے کے قریب بند ہو گئی--!

جب بونٹ کھولا تو انجن میں آگ لگی ہوئی تھی-- فٹافٹ ٹیپو نے آگ بجھانے والا سلنڈر نکالا اور فوم کا سپرے شروع کر دیا، اُدھر حسین بلتی گھبراہٹ کے عالم میں جلتی ریت کو اپنی ٹوپی میں اٹھا اٹھا کر انجن پر ڈالنے لگا-- آخر آگ پر قابو پا لیا گیا-- اب یہ لوگ بھی شازیہ پٹیل کی طرح ریتلے ٹریک کے کنارے سر پکڑے بیٹھے تھے--!

میں نے پوچھا کہ آگ کیوں لگی، سچ سچ بتانا--!

تو حسین بلتی نے بتایا کہ جب گاڑی روکی تو انجن کی آدھی مشینری آگ بگولہ گرم تھی، ہم نے بڑی احتیاط سے سنی لے کر انجن کا ڈھکنا کھولا تو دیکھا انجن آئل دو نمبر ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے خشک ہو چکا تھا-- ہم نے اِن حالات میں جونہی انجن میں آئل ڈالا، باقی کام پورا ہو گیا-- دیکھتے ہی دیکھتے موبل آئل آگ پکڑ گیا--!

حسین بلتی نے بڑی افسردگی سے کہا۔

"-- آغا صاحب-- ہم کبھی نہ ہارتے اگر ہمیں یہ گاڑی کا انجن دھوکہ نہ دیتا--"!!!

"-- ہاہاہا- یہ عمدہ تاویل ہے--"! میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بعد کی کہانی یہ ہے کہ انھوں نے کسی پیغام کے ذریعے اپنی ذاتی ٹریکٹر ٹرالی منگوائی اور ٹامک ٹوئیاں مارتے، رات گیارہ بجے زیرو پوائنٹ پر پہنچے -- وہ اجاڑ پڑا تھا --!!!

تقسیم انعامات اور تقسیم اسنادِ شرکت کی تقریب، کبھی کی فینشنگ پوائنٹ پر ختم ہو چکی تھی -- یہ لوگ تو واپس اسٹارٹنگ پوائنٹ پر آئے تھے، پھر شکایت کیسی --!

ایک اور شکایت بھی حسین بلتی کو بہت زیادہ تھی -- اس کا مختصر قصہ بھی ان ہی کی زبانی سن لیجیے۔

حسین بلتی کا کہنا یہ تھا کہ انھوں نے خود دیکھا کہ رونی پٹیل کی نو عمر بیوی شاز یہ پٹیل اپنی ریس گاڑی خود نہیں چلا رہی تھی بلکہ اس کا شوہر رونی پٹیل چلا رہا تھا -- اس کے باوجود شاز یہ پٹیل کو خواتین کار ریسنگ میں دوسرا ایوارڈ ملا --"

میں نے حسین بلتی سے کہا کہ شاز یہ پٹیل کا کو ارڈینیٹر کون تھا --؟

بتایا کہ رونی پٹیل خود تھا --

تو جناب، آپ کو کیا اعتراض ہے، ہو سکتا ہے کہ کہیں جیپ بُری طرح اچھلی ہو یا شاز یہ کی کمر میں جھٹکا آ گیا ہو، چِک پڑ گئی ہو یا -- یا کچھ اور ہو گیا ہو تو پھر جوڑی دار کو ارڈینیٹر گاڑی چلانے کا حق تو رکھتا ہے -- رونی پٹیل نے اپنا اور بیوی کا حق ادا کیا، اس نے کیا برا کیا --!!!

"-- پھر سوچیے ناں، پوری ریس ٹیم میں کل دو خواتین ہی حصہ لے رہی تھیں -- جو اُن میں سے ذرا آگے نکلی وہ اوّل اور جو ذرا پیچھے رہ گئی وہ قانوناً دوم ہوئی -- آپ کو کیا اعتراض ہے جناب --؟"

"-- اس موقع پر ایک اور بات بھی کہتا چلوں کہ خواتین کا فنشنگ ریس پوائنٹ، مڈ پوائنٹ تھا -- جو پہنچا وہ سکندر اور جو نہ پہنچا وہ بھی نائب سکندر بلکہ سکندرہ --"!!!

اُدھر شام کو میڈیا پر یہ خبر گرم تھی کہ مشہور ریس ڈرائیور قادر مگسی کی گاڑی جب گڈ لک میں فنشنگ پوائنٹ پر پہنچی اور ایک ریت کے ٹیلے سے اچھلتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی تو بہت سے تماشائی نوجوان خوشی میں ٹریک پر چڑھ آئے -- قادر مگسی کی گاڑی اچھلنے کی وجہ سے قدرتی طور پر بے قابو تھی۔ یہ ایک قدرتی امر ہوتا ہے کہ جب کوئی گاڑی ریت کے بے یا ٹیلے سے ایک سو چالیس کی رفتار سے نیچے اترتی ہے تو ہوا میں چاروں پہیوں سمیت معلق ہوتی ہے، ایسے میں ذرا سا ڈول جاتی ہے، قادر مگسی کی گاڑی بھی ڈولی اور سامنے ٹریک پر خوشی سے ناچتے جوانوں کو روندتی چلی گئی۔ شاید دو تین لوگ موقع پر دم توڑ گئے -- میں سمجھتا ہوں کہ اس میں قادر مگسی کا کوئی قصور نہیں تھا -- بس ان کو اظہارِ خوشی کا یہ انداز راس نہیں آیا۔

ﷺ

باب ۳۷

دن میں قلعہ دراوڑ کا رُوپ نرالا ہے

دیومالائی داستانیں اور قلعے میں خزانے --!

تیز دھوپ، گرم دوپہر، مقامیوں کی بے لگام یلغار اور ماحول برباد--!

لگتا تھا کہ بلی کے بھاگوں، چھیکا ٹوٹا ہے۔

ایسا ماحول تھا کہ قلعے کے اندر جانے کو جی نہیں کرتا تھا-- کاش کہ انتظامیہ کو ذرا سا شعور ہوتا کہ آج کے دن چولستان میں دور دور سے آئے سیاحوں کا زور ہے تو فقط اتنا ہی کر دیتے کہ صرف آج کے لئے مہمان سیاح اس نایاب قلعے کو دیکھ سکتے۔ مقامی لوگ جو کچھ سیاحوں کے ساتھ کر رہے تھے، اُس نے سارا مزا، کر کرا کر دیا--

کوئی موقع پرست جیب تراشی کی کوشش کرتا تھا-- کوئی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے۔ آپ کے کندھے پر لٹکے بیگ میں صفائی سے ہاتھ مار کر کچھ بھی نکالنے کو داؤ مارتا تھا، اور کچھ نہیں تو پانی کی بوتل پر ہی ہاتھ صاف کر لیتا تھا۔ میں نے دو مرتبہ اپنی پانی کی بوتل بچائی-- وہ جنگلی گالیاں ایسے بکتے تھے کہ شرم سے پسینے آتے تھے-- جہاں کوئی سیاح لڑکی دیکھتے، درجنوں مکھیوں کی طرح اسی کی جانب بڑھنے لگتے، فحش اشارے کرتے، کوئی کندھا مارتا، کوئی چھونے کی کوشش کرتا اور کوئی، جو اس کے بس میں ہوتا، کر گذرنے کو بے چین و بے قرار ہوتا-- بہت سوں کی خواہش

یہ تھی کہ کسی طرح آپ کے موبائل فون یا کیمرے پر ہاتھ صاف کر دیا جائے--عزت اور مال کو محفوظ رکھنا مشکل ہو رہا تھا--دل کرتا تھا کہ تاریخ اسلاف، تفریح اور تحقیق پر لعنت بے شمار کر کے ناموس بچائی جائے اور جلد از جلد قلعے سے باہر نکل جایا جائے اور سکھ کا سانس لیا جائے۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں جتھہ بن کے چلنا اور ساتھ ساتھ رہنا ہی قدرے محفوظ تھا، مگر وہ لوگ تو دیوانے، ہلکائے ہوئے جا رہے تھے اور میں حیران تھا کہ اتنے سارے جانوروں کو مقامی انتظامیہ نے یوں بے مہار کھلا کیوں چھوڑ دیا ہے--!

پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں خواہ کتنا ہی رش اور عوام کیوں ناں ہوں، کوئی ایک مقامی بھی، ایسی بدحرکتیں اور ذرہ بھر بدتہذیبی نہیں کرتا--خاص طور پر شمالی سیاحتی علاقوں کے لوگ عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کی بھی عزت کرتے ہیں--مگر یہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا--غالباً یہاں کے مقامی لوگ سمجھتے تھے کہ ہم سیاح یہاں اپنا مال اور عزت و آبرو ان لوگوں کے ہاتھوں لٹانے آئے ہوئے ہیں--کوئی بُرا منائے یا اچھا منائے، صاف صاف بات کہتا ہوں کہ پنجاب میں کسی سیاح فیملی کو ایسے مقامات پر اپنا مال اور اپنے ساتھ موجود خواتین کی عزت بچانے کی فکر ہر وقت دامن گیر ہی رہتی ہے--جب کہ پورے صوبہ سرحد میں کسی ویران ترین اکیلے مقام پر بھی آپ کی عزت اور حرمت کو، دن اور رات میں کسی قسم کا خطرہ کبھی بھی رپورٹ نہیں ہوا ہے--شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ سیاحت، تفریح اور ہنی مون کے لیے شمال میں بے دھڑک جانا پسند کرتے ہیں، کیونکہ وہاں وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں--!

معاف کیجئے گا--یہ جو میں عرض کر رہا ہوں جناب--یہ شکایتیں ہرگز نہیں ہیں--یہ یہاں کے عمومی معاشرے کے حال کا آئینہ ہے--باقی جو آپ کے دل میں آئے، آپ کو سمجھنے کی کھلی اجازت ہے مگر اس رائے کے ساتھ کہ پانچوں انگلیاں ہرگز برابر نہیں ہوتیں۔

سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ہمیں ذاتی کردار کی تشکیل نو کی اشد ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ امیر ہو یا غریب اُن کو اپنے گھروں میں اچھے ماحول اور تربیت کے فقدان کا سامنا ہے۔

جو قومیں گدھوں اور گھوڑوں میں تمیز کی لکیر قائم رکھتی ہیں، وہ دنیا پر حکمرانی کرتی ہیں اور جو گدھے اور گھوڑے میں فرق ختم کر دیتی ہیں، عموماً اخلاقی اور سماجی طور پر تباہ و برباد ہو کر مذاق بن جاتی ہیں۔

ہاں اس موقع پر یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ہمارے میں سے جو لوگ اس ماحول اور معاشرے کی پیداوار تھے،

ان کو یہ سب بہت اچھا، اپنا اپنا اور فل آف گلیمر لگ رہا تھا ۔۔ اس اعتبار سے اس تہذیب و تمدن میں ہم جیسے ادب آداب والے لوگ سراسر مس فٹ تھے ۔۔ یوں سمجھ لیجئے کہ خربوزوں نے خربوزوں کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیا تھا ۔۔!

یوں ہی دیکھنے میں قلعہ دراوڑ ایک روایتی قلعہ ہے، مگر یاد رہے کہ پورے ہندوستان میں جو بھی قدیم قلعے ہیں، وہ اپنے اندر ایسے ایسے طلسمات، بھول بھلیاں اور مظاہر عجائب رکھتے ہیں کہ بندہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے ۔۔ یہ قلعہ جس میں، میں ابھی کھڑا ہوں، عجائبات اور طلسمات کا حسین مرقع ہے۔

چولستان میں ایک عام کہاوت صدیوں سے مشہور ہے۔

''۔۔ رنگ ایویں وٹے نے، جیویں ڈراوڑ کوٹ وٹینڈے ۔۔''

یہ تو ایسے تیور بدلتا ہے کہ جیسے دراوڑ کا قلعہ روپ بدلتا ہے ۔۔!

کہتے ہیں کہ چولستان میں دراوڑ ایسا قلعہ اور عمارت ہے کہ جو دن میں آٹھ رنگ، ہر پہر کے ساتھ بدلتی ہے۔ پھر یوں بھی مشہور ہے کہ سورج کے طلوع یا غروب کے وقت کسی اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اس کو دیکھیں تو دراوڑ کے پس منظر میں ایک اور قلعے کے نقش و آثار بھی نظر آتے ہیں اور قلعے کے گرد ایسی عمارتیں بھی دکھائی دیتی ہیں، جو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ سردیوں میں جب دھند چڑھی ہو تو ایسا لگتا ہے کہ قلعہ دراوڑ ایک وسیع و عریض شہر کے وسط میں ایستادہ ہے ۔۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر پہر کے بعد فصیل قلعہ کی دیواروں کے رنگ بدل جاتے ہیں ۔۔ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے مگر شاید اس کی وجہ سراب نور ہے ۔۔!

اس اعتبار سے یہ قلعہ چولستان کا سب سے زیادہ طلسماتی قلعہ کہلاتا ہے۔

یہ قلعہ ۱۷۳۹ء تک سوجان سنگھ کی اگلی نسلوں کے پاس رہا۔ اس وقت راول رائے سنگھ اس کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ صادق محمد خان اول نے اپنی بیس ہزار فوج کے ساتھ اس پر چڑھائی کی اور فتح کر کے قبضہ کر لیا اور راول رائے سنگھ کو معزول کر کے اسی قلعے میں رہنے کی اجازت دے دی اور پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔

اسی قلعہ دراوڑ میں ۸۰۰ء کے قریب تنو سنگھ کا بیٹا باجے راؤ حکمران ہوا ۔۔ باجے راؤ کو جیسلمیر کی شہزادی مستانی سے محبت ہو گئی۔ اس لیے کہ وہ بہادر اور حسین لڑکی تھی ۔۔ اگر آپ باجے راؤ اور مستانی کی داستان محبت کو جاننا چاہتے ہیں تو میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ حال ہی میں منظر عام پر آنے والی ہندوستانی فلم ''باجے راؤ مستانی'' دیکھ لیجئے کہ باجے راؤ اور مستانی کو اس کے بھائیوں اور بھائیہ رشتے داروں نے کیسے الگ کر کے قتل کیا۔ باجے راؤ بڑی رانی میواڑ رانا وت کے شکم سے پیدا ہوا اور مسند نشین ہوا ۔۔ یہ قلعہ دراوڑ اس دوران مہاراجہ جیسل میر کے قبضے میں تھا ۔۔

جیسل میر، قلعہ دراوڑ سے مشرق کی طرف ۱۲۰ میل کے فاصلے پر، بہت وسیع اور بڑا شہر تھا اور اب بھی ہندوستان کے ملحقہ صوبے راجستھان میں موجود ہے۔

ہندو اور سکھ دور سے پہلے یہاں کا عام مذہب بدھشت تھا۔ یہاں تک کہ احمد پور شرقیہ بھی بدھوں کا گڑھ تھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ قلعے کی اندرونی عمارات بنیادی طور پر حیرت انگیز تعمیراتی قابلیت کا نمونہ ہیں -- تمام سکھ ادوار کے مالکانِ قلعہ یہاں پر تہہ خانوں میں رہتے تھے -- قلعے کے اندر، زیرزمین ایک تالاب کے آثار ہیں۔ سوکھے تالاب میں ایک زینہ اترتا ہوا اب بھی دکھائی دیتا ہے -- اس زینے کے آخر میں ایک بڑی سرنگ کا دروازہ لوہے کی موٹی سلاخوں سے بنا نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سرنگ اتنی کشادہ ہے کہ اس میں گھوڑے پر بیٹھ کر بہ آسانی سفر کیا جا سکتا ہے۔

پھر سامنے قلعے کے میدان میں دیکھا کہ نیچے جانے کے راستے تھے -- یہ زیرزمین پہلی منزل ہے -- اس کی چھت قلعے کا میدان ہے -- اور نیچے بے شمار کمرے، ہال قسم کے درباری کمرے، گودام ہیں -- چھتوں پر اتنا خوبصورت اور نفیس نقشین اور رنگین پچی کاری اور گل کاری کا کام ہوا ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ہوا کے رخ ایسے شاندار اور رواں ہیں کہ گھٹن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -- اب ان زیرزمین کمروں کی حالت بہت خستہ ہے کہ اندر قدم رکھتے، چھت کے گر جانے کا خوف ستاتا ہے، مگر آج بھی چھتوں میں ایسی مضبوطی اور پائیداری ہے کہ اس وقت بھی سینکڑوں لوگ چھت کی زمین سے گزر رہے ہیں مگر مجال ہے کہ چھت کی مٹی گرتی ہو -- اللہ جانے ان لوگوں نے کس میٹریل اور ٹکنیک سے یہ سب تعمیر کیا تھا کہ ابھی تک قائم ہے۔

عباسی خاندان کی حکمرانی سے پہلے تمام حکمرانِ قلعہ، قلعہ دراوڑ میں زیرزمین ہی رہائش رکھتے تھے -- اوپر کی تمام تعمیرات مختلف عباسی حکمرانوں کی تعمیر نو ہے جو ۱۷۳۵ء سے ۱۹۶۰ء تک ہوئی ہیں -- !

ایک شرف جو قلعہ دراوڑ کو روزِ اوّل سے ۱۹۶۶ء تک حاصل رہا، وہ یہ ہے کہ ہر حکمران کی رسم تاج پوشی دھوم دھام سے ہمیشہ اسی قلعے میں ہوئی ہیں۔ خواہ وہ عباسی تھے یا صادق یا راول سنگھ کی اولادیں -- !

یہ بھی شرف حاصل رہا کہ گزشتہ ہزار سالوں میں جو بھی رانی بیاہ کر آئی، وہ بھی قلعہ دراوڑ میں ہی آئی اور مہارانی بن کر رہی -- !

ایک ہزار سالوں میں دراوڑ کے تمام حکمرانوں کی تاج پوشیوں کے موقع پر قلعے کی چاروں سمتوں کی

فصیلوں، جن میں ہر کونے پر چار بڑے برج فصیل اور ۳۶ چھوٹی فصیلی برجی دیواریں ہیں، ان پر خالص گھی چراغوں میں ڈال کر چراغاں کیا جاتا تھا۔ یہ رسم آخر تک جاری رہی -- کہتے ہیں کہ آخری چراغاں ۱۹۵۰ء میں چھوٹے شہزادے کی پیدائش پر ہوا تھا۔

یہ بھی بڑے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ اس قلعہ دراوڑ میں بے شمار سونے چاندی، ہیرے جواہرات کے قدیمی خزانے سکندر اعظم کے دور سے دفن ہیں -- ایک واقعہ اس سلسلے میں بہت مشہور ہے کہ ہر ایک کی زبان پر ہے اور تقریباً ہر کتاب میں لکھا ہوا ملتا ہے

جب ۱۷۳۵ء میں نواب صادق اول نے قلعے پر قبضہ کیا تو انھوں نے راول سنگھ کے وزیر خزانہ کو بھی پکڑ لیا۔ اس سے پوچھا کہ بتاؤ خزانہ کہاں موجود ہے -- اس نے کہا کہ اس شرط پر خزانے تک لے چلوں گا کہ آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دوں گا -- نواب صاحب نے اس خطرناک شرط کو منظور کر لیا -- وہ ایمانداری سے نواب صاحب کو اندرونی راستوں سے گذار کر خزانے تک لے آیا -- وہاں پہنچ کر وزیر نے کہا کہ آپ خود اکیلے جس قدر مال و زر لے جانا چاہیں لے جا سکتے ہیں -- کہتے ہیں کہ نواب صاحب اس خزانے اور زر و جواہر کی مقدار کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور جو لا سکتے تھے، ساتھ لے آئے -- مگر مرتے دم تک وزیر خزانہ نے خزانے کا رستہ نہیں بتایا -- وزیر خزانہ جب تک زندہ رہا؛ نواب صاحب جب بھی خزانے تک رسائی مانگتے، وہ دیتا رہا -- وزیر خزانہ کی قدرتی موت کے بعد سے کسی کو معلوم نہیں کہ قلعہ دراوڑ میں خزانے کا راستہ کہاں سے ہے اور خزانہ کس جگہ ہے -- کہتے ہیں خزانہ اب بھی قلعہ دراوڑ میں موجود ہے اور ایک ناگوں کا جوڑا، اس کی حفاظت پر مامور ہے -- واللہ اعلم بالصواب --!!!

ویسے میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی جا کر قلعہ دراوڑ کی خاک چھانیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو خزانہ مل جائے اور آپ کے طفیل ہمارے نصیب بھی بدل جائیں -- مگر ناگوں کے جوڑے سے آپ ہی کو نبٹنا ہوگا -- بندہ اس معاملے میں معذرت خواہ ہے --!

ہاں البتہ، میں اس جوڑے اژدہا کی نشانی بتا دیتا ہوں، تا کہ آپ کو اسے پہچاننے میں قطعی دشواری نہ ہووے -- اس اژدہا کا سر قلعہ کی کسی گپھا میں ہے اور دُم ایک سُرنگ میں ہے --!

باب ۳۸

قلعہ دراوڑ میں خوبصورت خواب محل، جس کی بربادی دیکھ کر دِل خون کے آنسو رُویا

قلعہ دراوڑ سے بس ذرا تین میل پہلے آج بھی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔۔۔ جس کو "سنگھار والا ٹبہ" کہتے ہیں۔

اس جگہ کی آج بھی نشانی یہ ہے کہ اس مقام پر سرکنڈے کے جھنڈ کے جھنڈ موجود ہیں اور اتفاق سے خواہ دھوپ کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو، یہاں ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔

یہ سنگھار والا ٹبہ اس لیے کہلاتا ہے کہ جب نواب صاحبان اور ان کا حرم بہاولپور سے قلعہ دراوڑ جاتے تھے تو ان کی بیگمات صحرا کے اس پُر فضا مقام پر ہمیشہ رک کر آرام کرتیں یعنی آج کے زمانے کے مطابق فریش ہوتیں؛ مرد لوگ ہرن کا شکار کرتے۔۔۔!

خواتین، یہاں اس مقام پر نہا دھو کر، کنگھی پٹی کر کے خوب بناؤ سنگھار کرتیں؛ گویا یہ پڑاؤ، بناؤ سنگھار کے لیے ہوتا تھا۔۔۔ جب نواب صاحب کو خبر بھیج دی جاتی کہ بیگمات خوب سج، بن کر تیار ہو چکی ہیں تو قافلے کا کاروان قلعہ دراوڑ کی طرف روانہ ہوتا تھا۔۔۔ اس لیے اس جگہ کا نام "سنگھار والا ٹبہ" مشہور ہو گیا۔۔۔!

کہتے ہیں کہ نواب صادق اول کی ایک بیگم بہت ہی حسین اور خوبصورتی میں بے مثال تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نواب صاحب نے ان بیگم صاحبہ سے شادی کے بعد نہ ہی کوئی کنیز رکھی اور نہ ہی اس زمانے کی روایت کے مطابق کوئی اور شادی کی-- ان بیگم صاحبہ کی خوبصورتی کا یہ عالم بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ پانی پیتی تھیں تو پانی ان کی صراحی دار گردن سے گزرتا دکھائی دیتا تھا اور اگر وہ سرخ سیب یا کوئی سیاہ انگور نوش جان کرتی تھیں تو اس پھل کا رنگ اور دانہ ان کے حلق اور گردن سے جھلک مارتا دکھائی دیتا تھا--نواب صاحب ان کے لیے کابل سے سیاہ انگور خصوصاً منگواتے تھے اور ان کو اپنے سامنے بٹھا کر کھلاتے تھے اور اس سیاہ انگور کے دانوں کو ان کے حلق سے گزرتا دیکھ کر واری نثار ہوئے جاتے تھے--!

ان ہی بیگم صاحبہ کی خاص فرمائش پر نواب صاحب نے قلعہ دراوڑ کی فصیل کی شمال مشرقی بڑی برجی کے اوپر ان کی مرضی کی اونچی دو منزلہ خواب گاہ تعمیر کرائی تھی-- نیچے کی منزل کنیزوں کے لیے تھی اور اوپر کی پُر فضا خواب گاہ اِن مہارانی صاحبہ اور نواب صاحب کے لیے تھی--!

اس خواب گاہ کا نام رانی صاحبہ نے ''خواب محل'' رکھا تھا--!

میں اس وقت رانی صاحبہ کے اُجڑے خواب محل میں حیران و پریشان کھڑا تھا--!

میں تاریخ کی کتابوں میں پڑھ کے آیا تھا--خواب محل کی نایاب خوبصورتیوں، دیواروں پر بنی نقاشی، محرابوں اور روشن دانوں پر بنے بیل بوٹوں اور پھولوں کلیوں کے حسن و جمال کے قصے، اور چپی کاری سے سجی چھتوں کی بے مثال گل کاری اور ان چھتوں پر بنے مصورانہ رومانوں کے بارے میں--مگر میری آنکھوں نے اس حسین، رُومان پرور اور گل ریز خواب محل کو جس حالت زار میں اس وقت سسکتا اور اپنے انجام پر آنسو بہاتے دیکھا ہے کہ خود میری آنکھوں میں اس کا دکھ، اذیت اور بربادی دیکھ کرنمی آ گئی--

ایک بربادی تو وہ ہوتی ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر خود بہ خود ہوتی ہے، مگر ایک بربادی وہ ہوتی ہے، جو نا اہلوں اور اجڈ بے تہذیبوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے ہوتی ہے-- یہاں ساری بربادی کا نوحہ، موجودہ عہد کے لوگوں کے ہاتھوں اور سوچ سے لکھا ہوا پایا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، جو خود تو کچھ بنا نہیں سکتے مگر اپنی محرومیوں کا انتقام ان نایاب اور قابل قدر خوبصورتیوں اور یادگاروں کو اپنے اندر کی صدیوں سے موجود نفرتوں کا نشانہ بنا کر لیتے ہیں--!

ایسی نایاب تعمیرات کو اجاڑتے، برباد کرتے ہوئے، ان کو ایک بار بھی، بھولے سے یہ خیال بھی نہ آیا کہ

ظلم اور بربریت کی کوئی حد ہوتی ہے-- اور ان کرتوتوں پر ان کو کوئی شرمندگی بھی نہیں ہوتی-- اس خواب محل کے درو دیوار کے حسن نایاب کو تباہ و برباد کرتے ہوئے، کیا وہ جانور بن گئے ہیں-- جی ہاں، ان کے اندر کا جانور ان کو انسانوں کی دنیا میں جینے نہیں دیتا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کی سوچ، بدفطرتی اور جسمانی اعضاء کو بروقت قانون کی نکیل نہ ڈالی گئی تو وہ شاید اس پاک وطن کو ہی اجاڑ کر رکھ دیں گے-- یہی لمحہ فکریہ ہے--

میں اور آپ سمجھتے ہیں کہ اب اگر ان جانور نما انسانوں کے ان وحشیانہ اور جابرانہ کرتوتوں کا ذکر کیا جائے گا اور تحریروں میں غم زدگی کے اس احوال کے نوحے کو لکھ دیا جائے گا تو ان کے حمایتی، بڑی مکاری اور شاطری سے ایک مخصوص جملہ کہتے ملیں گے۔

"--سب لوگوں کو تو ایسا نہ کہیں-- کسی نادان نے اگر اس خواب محل کے در و دیوار کے نقشین خواب ستاروں کو اپنی کم عقلی سے برباد کر دیا ہے تو اس میں باقی لوگوں کا کیا قصور ہے--"

میں سوچتا ہوں کہ یہ کیا پوپلے منہ سے بولا گیا معصومانہ جملہ ہے۔

ہمارے معاشرے کا موجودہ دستور یہ ہے کہ اس طرح کی بچگانہ دلیل دے کر مجرم کے ساتھ ساتھ، اس کے سہولت کاروں کو بھی بچایا جاتا ہے۔

بھائی مثل مشہور ہے کہ دیگ کا ایک دانہ ہی چکھ کر پوری دیگ کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔

تو جناب، عرض یہ ہے کہ دنیا کا دستور ہے کہ نااہل کے ہاتھ میں چھری یا تلوار نہیں دی جاتی-- ورنہ وہ خود کو بھی کاٹ ڈالے گا اور کئی دوسرے معصوموں کا بھی خون کر دے گا-- یہ بھی اصول ہے کہ خزانہ علم اگر ناقدرے جاہل قولن کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے تہس نہس کر دیتا ہے، اور قوم کو صدیوں پیچھے دھکیل دیتا ہے-- دولت اور اسلاف کی عزت و حرمت، ناخلف کے تصرف میں چلی جائے تو بربادی مقدر بن جاتی ہے-- اور یہ بھی تہذیب یافتہ معاشرے کا قانون ہے کہ اگر باولا کتا مسجد میں آن گھسے تو مارا جاتا ہے اور بھیڑیئے شہر میں آن گھسیں تو سمجھو کہ ان کی موت بھی آ گئی ہے-- مگر سوچئے کہ شہر میں راج سنگھاسن ہی بھیڑیوں کا ہو تو جو سمجھائے گا اور نکیل ڈالے گا، اسی کو دوڑ کر ہی کاٹیں ماریں گے--!!!

میں یہاں، اس خوبصورت خواب محل کے چکنا چور ماحول میں حق دق کھڑا، ایک ایک در و دیوار، دیواروں، چھتوں، محرابوں، چھت کی گگروں پر بنے صدیوں پرانے نقش و نگار اور رنگ و روغن کی طرح طرح سے کی گئی بربادی کو دیکھتا جاتا ہوں-- آنسو میری پلکوں پر نہ بہنے کے لیے نا جانے کیوں رکے ہوئے ہیں-- میں چپکے سے اپنے آنسو

پونچھ لیتا ہوں اور خوابوں کی ایک گم گشتہ دنیا میں کھو جاتا ہوں۔

میری آنکھیں، میرے گرد پھیلی ہوئی بربادی پر نوحہ کناں ہیں، میرے احساسات غم وغصے میں بدل رہے ہیں۔۔مگر میں بے بسی سے صبر کے کڑوے گھونٹ پیتا جاتا ہوں اور خون کے آنسو بہنے سے روکے جاتا ہوں۔۔!

رانی صاحبہ، شکر ہے کہ آپ اس بدفطرت عہد میں موجود نہیں ہیں، ورنہ اپنے خواب محل کا یہ حال دیکھ کر صدمے سے ہی ہلاک ہو جاتیں۔

رانی صاحبہ کو کیا پتہ تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہر کس وناکس، ان کی خواب گاہ میں دن دیہاڑے دندناتا پھرے گا۔۔اور اس حسین خواب گاہ کے درودیوار کو ایسے اجاڑے گا کہ پھر ری اسٹور بھی نہ کیا جا سکے گا۔۔!

میں سوچ رہا ہوں کہ ان کی روح اگر یہاں آ جائے تو کس قدر بے چین، بے قرار اور اپنے آپ کو بے کس و مجبور محسوس کرے گی۔۔!

یہ خواب محل، رانی صاحبہ کے نازک خوابوں کی تعبیر کو حقیقت میں ڈھال کر بنایا گیا تھا۔۔اس خواب گاہ کی سیدھی اور سپاٹ دیواروں پر پھولوں کے نقش لافانی شاہکار تھے اور جو کچھ اب بھی نظر آتا ہے، وہ بھی نایاب ہے۔۔ان دیواروں، محرابوں اور چھت پر بنے پھولوں، کلیوں اور پتیوں کی پینٹنگز آج بھی شاہکار نظر آتی ہیں۔۔جن میں کسی انسانی یا حیوانی چہرے کو نہیں دکھایا گیا بلکہ صرف اور صرف چولستانی صحرائی پھولوں کو ان کے اصل رنگوں کی شان و شوکت کے ساتھ کسی ماہر مصور نے پینٹ کیا تھا۔۔!

ڈیزرٹ لیکلس میں جب کبھی پھول کھلتے ہیں تو وہ ایسے حسین اور نازک رنگوں اور پتیوں پنکھڑیوں میں ہوتے ہیں کہ جو بھی ان کو دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور بے خود ہو جاتا ہے! مگر یہ سالوں بعد ہی کبھی کھلتے ہیں، روز نہیں کھلتے۔۔!

خواب محل کے درودیوار پر ایسے ہی نایاب اور گل رنگ پھولوں کو مصور نے رانی صاحبہ کے ذوق کے مطابق منقش کیا۔۔رانی صاحبہ جب اس خواب محل کی خواب گاہ میں اپنے چھپر کھٹ کی آرام دہ مسہری پر اونچے تکیے پر سر رکھ کر اور لیٹ کر اپنے ارگرد کی دیواروں اور چھتوں کی آرائش و زیبائش کو دیکھتی ہوں گی تو کیسی راحت اور کتنا سکونِ قلب ان کے رگ و جاں میں آسودگی بن کر لہریں لیتا ہو گا۔۔!!!

میری سوچ کا دریائے پاکیزہ اس موقع پر یک دم سوکھ کر بنجر ریگستان میں بدل گیا۔۔میں نے دکھ کے ببول کانٹوں کو اپنے بدن میں بے اختیار چبھتا محسوس کیا۔۔مجھے لگا کہ میرے اردگرد جال جنڈ کے لمبے لمبے کانٹے

کھڑے ہیں اور میں ان میں پھنس گیا ہوں اور رانی صاحبہ گھٹنوں میں سر دیئے گھٹ گھٹ کر رو رہی ہیں اور ان کو دلاسہ تسلی دینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

خواب محل کا حاصل منظر یہ تھا کہ تین صدیوں سے قائم، دیواروں چھتوں کی نقاشی پر چاپئے کے سلنڈر سپرے پینٹ سے بے دردی کے ساتھ اپنے اور اپنے جیسی پاک باز محبوباؤں کے نام لکھ کر مشہوری کمائی گئی تھی -- میں اس پر بھی حیران تھا کہ نفیس روشن دانوں کے ارد گرد بھی موٹے مارکروں سے اپنی محبوباؤں کا نام لکھ کر ان کے جنسی اعضاء کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ صرف فحش تصویریں اور خاکے بنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ گندی گندی فحش گالیوں اور ایسے بد افعال جملے معہ کرتوت لکھے گئے تھے کہ جو دیکھے شرم سے پانی پانی ہو جائے۔

تو بتایئے ناں، کہ جو بھی وطن اور وطن کی چیزوں سے محبت کرنے والا ان قومی اثاثوں کو یوں برباد ہوتے دیکھے گا، وہ میری طرح خون کے آنسو نہیں روئے گا تو کیا خوشی کے نقارے بجائے گا --؟

قلعے کے مرکزی دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک کشادہ سرنگ نما راستے سے اندر آئیں تو قلعے کی چھت کا میدان آ جاتا ہے -- اس سے دائیں طرف ایک چوڑا راستہ، بالکل فصیل قلعہ کے ساتھ ساتھ حرم سرا اور شاہی باورچی خانوں کے برابر سے ہوتا ہوا اوپر کو جاتا ہے۔ پھر اس راستے پر ایک بلند محراب سے گذرنے کے بعد راستہ مزید اوپر کو فصیل کے ساتھ ساتھ تیزی سے اونچائی چڑھ کر آتا ہے۔ وہاں ایک بڑا لیکن عام سا منقشین دروازہ ہے کہ جو ایک محفوظ صحن میں کھلتا ہے -- اس صحن سے خواب محل کے احاطے کا آغاز ہوتا ہے -- سامنے ایک خوبصورت، ہوادار، روشن اور وسیع آراستہ کمرہ ہے، جس میں چاروں سمت دروازے اور کھڑکیاں ہیں، یہ کمرہ بھی منقشین مصوری کا شاہکار ہے۔ صحن میں واپس آئیں تو بائیں طرف سے تنگ سیڑھیاں مزید اوپر کے کمرے میں جاتی ہیں -- یہ کمرہ خواب محل کی اصل "شاہی خواب گاہ" ہوگا -- کیونکہ یہ کمرہ نیچے والے کمرے سے زیادہ خوب صورت، روشن اور نظارہ گاہ ہے -- جب یہاں ریشمی اور حریری پردے نرم اور ٹھنڈی ہوا سے لہراتے ہوں گے، تو دل مسرت سے باغ باغ ہوتا ہوگا، چاندنی راتوں میں جب چاند کی مدھم دھیمی روشنی ایک دریچے سے نکل کر دوسرے دریچے سے آر پار ہو کر استراحت کرنے والوں کو اپنی قدرتی خوبصورتی میں لپیٹ لیتی ہوگی تو جذبات و احساسات کے سمندر میں کیسے کیسے جوار بھاٹے آتے ہوں گے -- اُدھر جب طلوع شمس کا قرمزی تھال افق مشرق پر ابھرتا ہوگا تو کیسے عمدہ دن کی نوید ملتی ہوگی --!

خواب محل کی چھت جو اب اتنی بوسیدہ ہو چکی ہے کہ تقریباً گر ہی چکی ہے۔۔میں نے وہاں اس کی چاروں دیواروں کے رُخوں پر کھڑے ہو کر دراوڑ اور چولستان کی حسین دنیا کا فضا سے نظارہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔۔!

خواب محل کی یہ چھت ایسی نظارہ گاہ تھی کہ قلعے کے اندر اور باہر کے تمام منظر اور نظارے عریاں تھے۔۔نیچے مشرق میں پانی کا وسیع و عریض تالاب سبز درختوں کی چھاؤں میں زمرد کی طرح دکھائی دیتا ہوگا۔۔اور شاہی مسجد، اس کے صحن اور پار میں خشک دریائے ہاکڑہ شیشے جیسا صاف نظر آتا ہوگا۔۔قلعہ کے اندر کی بستیوں کے آثار قدیمہ اور باہر کی آبادیوں اور گلیوں کے منظر ہتھیلی پر رکھے دکھائی دیتے تھے۔۔اُدھر قلعے کے اندر کا ہر منظر بھی صاف نظر آتا تھا کہ گویا اس خواب گاہ سے آپ قلعے کے اندر اور باہر کے ہر واقعے اور حرکات و سکنات کو خاموشی کے ساتھ یہاں سے دیکھ سکتے تھے اور ہیں۔۔قلعے کے اوپری صحن میں رکھی توپ بھی صاف نظر آتی تھی۔۔پہلے یہاں دو توپیں ہوا کرتی تھیں مگر اب صرف ایک ہی دکھائی دی۔۔یہ توپیں عباسی نوابوں نے انگلستان سے جدید دور مار اسلحے کے طور پر برآمد کی تھیں۔۔غرض قلعہ کے اندر اور باہر کا پورا آباد شہر یہاں سے دراوڑ کے حکمرانوں کو، خواہ دن ہو یا رات صاف دکھائی دیتا تھا۔۔مندر، مسجد، قلعہ کا پھانسی گھاٹ، قید خانہ، حرم سرا کا اندرونی منظر، حرم سرا کے کمرے برآمدے، بیرونی فصیل کا مرکزی دروازہ، یہاں تک کہ دور دریائے ہاکڑہ کے پار نوابوں کا شاہی قبرستان بھی یہاں سے صاف دکھائی دیتا ہے۔۔!

غرض اس خواب محل کی سب سے اوپر والی چھت سے دیکھنے والے کی نگاہ سے کچھ بھی پوشیدہ نہ رہتا ہوگا۔۔یہی اس خواب محل کی سب سے بڑی خوبی تھی۔۔!

آج بھی، اس وقت بھی کہ جب باہر چاروں طرف آگ برس رہی تھی؛ میں اس خواب محل میں قدرے ٹھنڈک اور تیز ہوا کی نرم رُو لطافت کو محسوس کر رہا تھا۔۔میں سوچ رہا تھا کہ جب یہاں نواب اور ان کی بیگمات گرم دوپہریں گزارتے ہوں گے تو کس قدر آسودہ خاطر ہوتے ہوں گے۔۔کہ جب فرش پر چھڑکاؤ ہوتا ہوگا، موتیے اور گلاب کے پھولوں سے بستر کے سرہانے مہکتے ہوں گے۔۔دروازوں پر خس ڈھکا ہوتا ہوگا اور خس کی رومان پرور خوشبو سے یہ خواب گاہ مہکتی ہوگی تو کیسی پُر وقار شان اور لطیف احساسات پروان چڑھتے ہوں گے۔۔!

یہ ایک خواب تھا کہ میں جس میں یہاں کھڑا کھویا ہوا تھا۔۔!

خواب محل کے یہ خواب اور خوب صورتیاں آج بے خواب اور چکنا چور ہو چکی ہیں، مگر ان کے اثرات اور

نازک احساس آج بھی جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔۔۔!

ماضی کے حسین دریچے، اس بربادی اور بدحالی کے باوجود مجھے بہا کر اپنے اس خوب صورت ماضی میں ہر موڑ پر لے جاتے تھے کہ جو کبھی اپنی نازک خیالی اور جذباتیت میں بے مثال رہا ہوگا۔۔۔!

آج یقیناً خواب محل، قصۂ پارینہ ہے، مگر اس کے آثار اور احوال بتاتے ہیں کہ وہ کبھی لطیف جذبات کی جیتی جاگتی آماج گاہ تھا۔۔۔!

باب ۳۹

طلسمات کی دیومالائی دنیا سے واپسی، جنّات کے بِنا، چولستانی رُوہی کا سفرنامہ اَدھورا ہے--!

دراوڑ میں دوپہر کا عالم ہے۔

گرم صحرائی ہوائیں بگولے بن کر اپنے جوشِ مبارزت اور گرمی کی انتہا پر ہیں۔

اتنی گرمی کہ چیل ہوتی تو وہ بھی اپنے انڈے چھوڑ کر اڑ جاتی--گویا چلچلاتی گرمی ہے۔

چند گھروں کی بستی دراوڑ میں فقط اور فقط ایک ہینڈ پمپ ہے۔

صحرا کی طرف سے روہی والیوں کی لمبی قطار چلی آتی ہے۔

اور ہینڈ پمپ کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اگلنے والی نالی کے آگے، روہی والیوں اور ان کے طرح طرح کے برتنوں کی ایک طویل صبر آزما لائن لگی ہوئی ہے۔

ہم ایک سرکنڈوں کے چھپر کی چھت کے سائے تلے، صبر اور شکر کے ساتھ بیٹھے، کاغذ سے پنکھا جھلتے ہیں--کہ وجدان، حیدر اور عمر فرحان ہاتھوں میں شیمپو کے جعلی ساشے پکڑے، خوشی خوشی آتے ہیں۔

''--بابا جان، ہم نے یہاں پچھواڑے میں ہینڈ پمپ تلاش کر لیا ہے--ہم لوگ سر، منہ، ہاتھ، پاؤں

دھونے جارہے ہیں--آپ بھی چلیں گے کیا--؟؟؟"
بچوں نے خوشی سے لپکتے ہوئے پوچھا۔

"--یارو، میں نے دیکھ لیا ہے وہ، مجھے روہی والیوں کے سامنے محفوظ غسل سے بھی ذرا شرم سی آتی ہے، تم لوگ جاؤ اور ٹھنڈے پانی سے جا کر مزے اڑاؤ--"

کافی دیر کے بعد بچے خوب نہا دھو کر چلے آتے تھے--خوش و خرم اور تر و تازہ--میں نے پوچھا۔

"--روہی والیوں نے اس نہانے والی سرعام فحاشی پر اعتراض تو نہیں کیا--؟"

"--نہیں بابا--جتنی دیر تک ہم سر، منہ، ہاتھ، پاؤں دھوتے رہے، وہ ہمیں اپنی چادروں میں منہ لپیٹ کر دیکھتی رہیں؛ مگر جب ہم نے سر پر شیمپو کا جھاگ بنایا اور اپنے منہ پر بھی جھاگ کو مل لیا تو وہ ایسی کھلکھلا کر ہنسنا شروع ہوئیں کہ ان سے ہنسی ضبط نہ ہوتی تھی--مجال ہے کہ انھوں نے بے تابی یا جلدی کا واویلا مچایا ہو--بڑے تحمل سے انھوں نے ہمیں اس عیاشی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا--ہم واپسی پر ان سب کا شکریہ ادا کر کے آئے ہیں--بڑے صبر والی تھیں وہ سب--حالاں کہ وہ ساریاں بہت دُور دُور سے یہ پینے کا پانی بھرنے کو آئی ہوئی تھیں--جس سے ہم لوگ اشنان کر رہے تھے--"!

"--اشنان--؟؟؟"

میری زبان سے بے اختیار نکلا--"بھئی، تم لوگوں نے اشنان کب سے شروع کر دیا ہے--؟"

"--جی، وہ ہاتھ اتنا مختصر تھا کہ اشنان ہی کہا جائے تو بہتر ہے--بابا جان، وہاں بے پردگی ہی اتنی تھی کہ اتنی عورتوں کے سامنے صرف اسی قدر محفوظ قسم کا غسل ممکن تھا--"

وجدان کی تاویلات سن کر حیدر اور عمر فرحان نہایت سنجیدگی سے سر ہلائے جاتے تھے--!
میں نے بھی سب کچھ تسلیم کر لیا--بس، میں بھی بہت فکر کے عالم میں غور کر رہا تھا۔
"--بے پردگی، اشنان اور محفوظ غسل--خوب ہے بھئی خوب ہے--"!!!

راستے کی گرمی میں اے سی کوسٹر، جولا ہور کی طرف چل دی تھی، اُس نے تھکن کے نشے کو آرام کی راحت سے مل کر، غنودگی اور نیند کی شکل میں دوبالا کر دیا تھا۔

کسی کے پاس کینو تھے؛ اس نے سب کو کینو بانٹ دیے--کینو کو چھیلنے سے جو مہک اس کے چھلکے سے اُن

دیکھی پھوار بن کر پھیلی، اس کی سندر اور تازہ مہک نے فضا میں ایئر فریشنر کا سا کردار ادا کیا--اور کام و دہن نے الگ سے لطف پایا۔

یہ کوسٹر کی سیٹ تھی، کوئی خواب محل میں بچھی مسہری تو تھی نہیں کہ خوش گوار خواب آتے--بس، سوتی جاگتی حالت میں، نہ جانے کیوں دماغ کی سوئی ایک جگہ بُری طرح اٹک گئی--!

رات کو کھنڈر میں سے گزرتے ہوئے، جس کالی بلی نے، میاؤں کی دل خراش آواز کے ساتھ راستہ کاٹا تھا، کیا وہ بھیس بدلے کوئی جن تھا--؟

وہ جو رات کے تاریک صحرا میں جھاڑیاں، کبڑی مائیوں کی طرح بھاگتی پھرتی تھیں، کیا وہ بھی کوئی جناتی مخلوق کے نامعلوم ہیولے تھے--؟

جس صحرا اور قلعے کی میں یہ مختصری خاک چھان اور پھانک کر آ رہا ہوں--یہاں بھی جنات کے قصے اسی طرح اعتماد اور وثوق سے پائے اور سنائے جاتے ہیں کہ جس طرح پہاڑوں کے لازوال ویرانوں میں مقبول ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنات کے ذکر کے بنا چولستان کی معاشرت کی عکاسی ادھوری رہ جاتی ہے۔

کسی سے میں نے کھنڈر میں کالی بلی کے یکدم چھلانگ لگانے کے واقعے کا ذکر کیا تو اس نے خوف زدہ سا ہو کر بے اختیار کہا۔

''--آغا جی، آپ بچ گئے، وہ ہرگز کالی بلی نہیں، جناتی بلا تھی--''

یہ سن کر مجھے تو سچ مچ جھرجھری سی آ گئی تھی۔

پھر ایک صاحب نے کبڑی مائیوں کے حوالے سے عجیب سی بات کہی۔

''--سر جی، وہ صحرائی بلائیں تھیں، جو ہمیں دیکھ کر رُوپ بدل کر سامنے آ گئی تھیں--''

عالم غنودگی میں، میں چولستانی بلاؤں، آسیبوں، جنات اور چڑیلوں کے بارے میں خواہ مخواہ سوچے جا رہا تھا--میں نے اپنے ذہن کو بہت جھٹکا، مگر واقعات و خیالات کا ہجوم مجھے اپنے آپ میں بہائے لیے جا رہا تھا--یہاں تک کہ میں ان ہی کے بارے میں سوچتا چلا گیا۔ یہ وہ واقعات تھے کہ جو مختلف لوگوں نے سنائے تھے--مجھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی کہے جاتا ہے کہ اسی رَو میں رہو، ان ہی آسیبی واقعات کے بارے میں سوچو کہ جن سے پورے سفر میں تم نے سوچ سمجھ کر اجتناب کیا ہے--مجھے لگتا تھا کہ چولستانی بلائیں چاہتی ہیں کہ میں ان کا ذکر کروں اور اگر نہیں کروں گا تو وہ میرے سر پر سوار ہو جائیں گی--!

میں حضرت خواجہ سید محمد عبداللہ ہجویریؒ کے شاگرد سے ملاقات کو کیسے بھول سکتا ہوں۔۔حضرت خواجہ کا قلعہ دراوڑ میں کافی آنا جانا تھا، مگر وہ قلعے میں کبھی قیام نہیں کرتے تھے۔ان کی چولستان کے جنات سے کافی دوستی اور میل ملاقات تھا۔وہ کہا کرتے تھے کہ دراوڑ اور اس کے اردگرد جنات کی قدم قدم پر بستیاں ہیں۔یہ جنات یہاں صدیوں اور نسل درنسل سے آباد چلے آتے ہیں۔۔ان کا شاگرد مولوی کریم علی بتاتا ہے کہ خواجہ صاحب کے آدھے سے زیادہ کام تو اُن کے دوست جنات کردیا کرتے تھے اور ہم لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ جنات میں بھی ولی صفت جن ہوتے ہیں۔ایک دن فرمانے لگے کہ آؤ پھر آج تمہاری ملاقات ایک ولی اللہ جن سے کراتا ہوں۔۔ہم دونوں چلتے چلتے قلعہ دراوڑ کے اندراس ویران مسجد میں آگئے کہ جس کو ہم نے بھی دیکھا تھا اور اس کی ویرانی اور وحشت سے گھبرا کر اندر نہیں گئے تھے۔۔ہم نے وہاں دو رکعت نماز ادا کی کہ ایک بلی، رنگت کی سیاہ بھٹ، مگر صحت اور خوبصورتی میں بے مثال تھی، دوران نماز بڑی خاموشی سے آ کر ہماری جاءنماز کے پہلو میں بیٹھ گئی۔نماز ختم کر کے حضرت خواجہ نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور اس سیاہ بلی کو بلند آواز سے سلام کیا۔۔بلی نے انسانوں سے ملتی جلتی آواز میں وعلیکم السلام کہا تو میرے سچ مچ پسینے چھوٹ گئے۔۔تب مجھے سمجھ آیا کہ وہ سیاہ بلا بلی جن تھا۔۔!

یوں تو یہاں جنات اور ان کی کارستانیوں کے بے شمار واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔بے شمار لوگ بتاتے ہیں کہ کبھی بھی قلعہ دراوڑ میں رات کے وقت نہیں جانا چاہیے! وہاں رات میں جنات، ان کی بلائیں اور بچے کھیلتے پھرتے ہیں۔۔ان جنات کی مستورات حسین عورتوں کی شکل میں نظر آتی ہیں، زیورات سے لدی پھندی ہوتی ہیں، خوبصورتی میں بے مثال ہوتی ہیں۔۔جس مرد پر عاشق ہوجائیں تو اس کا خون پی کر ہی چھوڑتی ہیں! یہ بھی کہتے ہیں کہ دراوڑ میں اندھیری راتیں، جوان لڑکوں کے لیے بالکل مناسب نہیں ہوتیں۔اگر اس جوان پر کنواری ڈائن کا دل آجائے تو وہ اُسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر زیرزمین تہہ خانوں میں لے جاتی ہیں! وہاں وہ اس کے سامنے دل موہ لینے والا رقص کرتی ہیں اور ایسے مشروب پلاتی ہیں کہ جوان اپنے حواس کھو کر ان ڈائنوں پر دل و جان سے مرمٹتا ہے۔۔جب وہ جوان مستی میں بہک جاتا ہے تو ڈائن اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر اس کی جوانی اور مردانگی سے کھیلتی ہیں! پھر جب جوان کے کس بل نکل جاتے ہیں تو وہ ڈائنیں اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہیں اور اگلے دن اس کی لاش کو قلعے کی فصیل کے اُوپر سے باہر کو پھینک آتی ہیں۔۔!

کوئی پچاس برس پرانی بات ہے کہ ایک صاحب قاضی اللہ دتہ ہوا کرتے تھے۔وہ تعمیرات کی ٹھیکے داری کا کام کیا کرتے تھے۔ان کو صحرائے چولستان میں تالاب بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا کہ اس زمین میں پانی کے آثار بھی تھے

اور زمین بھی خاصی پکی مٹی کی تھی کہ جس میں تالاب بننے سے پانی دیر تک محفوظ رہ سکتا تھا-- چاروں طرف صحرائی ویرانہ تھا، مگر چھوٹی چھوٹی انسانی بستیاں بھی ارد گرد، دور دور تھیں۔ قاضی اللہ دتہ اپنے پینتیس مزدوروں کے ساتھ تالاب یعنی ٹوبے کی کھدائی میں دن رات مصروف تھے کہ ایک شام ایک مزدور نے آ کر قاضی صاحب کو بتایا کہ صاحب غضب ہو گیا ہے-- ایک خوبصورت پکی عمر کی عورت، جس کے دانت ابرق کی طرح سفید اور مسوڑھے کوئلے کی طرح سیاہ بھٹ ہیں؛ آ کر ہماری چھولداریوں کے عین درمیان، میرے خیمے کے دروازے پر بیٹھ گئی ہے-- اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس عورت کے تن پر لباس نام کی کوئی شے نہیں ہے، الف ننگی ہے۔ چہرے مہرے سے تیس پینتیس کی لگتی ہے مگر جسم اس کا اٹھارہ بیس کی لڑکی جیسا ہے-- قاضی صاحب، بتائیں اب ہم کیا کریں--؟

قاضی صاحب نے اس گھبرائے سراسیماں مزدور سے کہا کہ پہلے اسے کوئی چادر وغیرہ دو-- میں پہنچتا ہوں-- جب قاضی صاحب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک افیونچی مزدور اس سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور باتوں باتوں میں اس عورت کو دانہ محبت بھی ڈالتا جاتا تھا--!

جب قاضی اللہ دتہ موقع پر پہنچے تو انہیں دیکھ کر عورت نے اپنے تن سے لپٹی چادر اتار پھینکی-- اور جلال میں آ گئی-- اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں کہ سرخی، انگارے کو بھی مات کرتی تھی-- پھر لگا کہ غصے میں اس کی سیدھی غزالی سرخ آنکھیں الف کھڑی ہونے لگیں اور وہ تن کر بولی--

"--ٹھیکیدار-- تجھے پہلے بھی کئی اشارے دیئے کہ تو یہاں سے دفع ہو جا، مگر تُو ہے کہ یہیں جما بیٹھا ہے-- ابھی اسی وقت، اپنے اِن مردود آدمیوں کے ساتھ یہاں سے نکل جا-- اسی میں تیری اور تیرے آدمیوں کی خیر ہے-- تجھے معلوم نہیں کہ میں اس روہی کی ملکہ ہوں-- اوپر سے تو ان اجڑوں کو حکم دیتا ہے کہ مجھے چادر پہنائیں-- تو میرے حسن اور جوانی کو برداشت نہیں کر سکتا تو میرے غصے، جلال اور قہر کو کیسے سہے گا--"!

یہ کہہ کر جنات کی ملکہ ذرا رکی--!-- پھر بولی۔

"--مجھے کچھ کھانے کو دو اور میری پسند کا مرد بھی دو--!"

قاضی صاحب بتاتے ہیں کہ اس کا رعب، دبدبا اور پاٹ دار بارعب آواز اور اس کے عریاں حسن کی تاب نہ لا کر میں بری طرح سہم چکا تھا-- جو سورتیں آیتیں یاد تھیں، وہ بھی اس وقت ٹھیک سے یاد نہ آتی تھیں-- باقی مزدور اپنی اپنی چھولداریوں میں خوف زدہ ہو کر چھپ گئے تھے۔ میں نے اس افیونچی مزدور سے کہا-- جا، جا کر

دیکھو، آج دال پکی تھی--- جو روٹی دال میسر ہے، ملکہ صاحبہ کو لا کر دے--- اس نے خیمے میں جا کر آواز لگائی--- دال روٹی موجود ہے قاضی صاحب--- لے آؤں---؟

قاضی صاحب کیا بولتے--- جنات کی ملکہ بولی---''وہ ساتھ میں جو گڑ رکھا ہے، وہ بھی لیتا آ---''

اس نے پوری ہنڈیا اور بیس پچیس روٹیاں اور دو تین سیر گڑ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر لیا اور بولی---'' جلدی نکل جاؤ، ورنہ میں تم سب کے دل اور کلیجے بھی کھا جاؤں گی---''!

یہ کہہ کر وہ جن ملکہ اٹھ کھڑی ہوئی، تب قاضی صاحب کی نگاہ اس کے پیروں پر پڑی تو دیکھا کہ اس کے پیر الٹے تھے اور پاؤں میں جھانجھریں، چھن چھناتی تھیں--- اس نے صحرا کی طرف جاتے ہوئے، پلٹ کر پھر کہا--- جلدی سے سامان اٹھاؤ اور نکل جاؤ اور خود رو ہی میں پھیلتے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

سامان کافی زیادہ تھا، اسے سمیٹنے اور مزدوروں کے حواس بحال کرنے میں کچھ دیر تو لگنا ہی تھی--- ابھی ہم اپنا سامان اسباب سمیٹ کر اونٹوں پر لاد رہے تھے کہ وہ ملکہ جن دوبارہ آن دھمکی--- وہ نہ جانے ہماری اُوڑھائی چادر کہاں پھینک آئی تھی--- دوبارہ آئی تو پھر الف ننگی تھی اور آتے ہی سیدھے میرے خیمے میں چلی گئی--- میں نے چپکے سے جھانک کے دیکھا تو گہری نیند سوئی پڑی تھی۔

ہم لوگوں پر اتنی گھبراہٹ سوار ہوئی کہ ہم نے فیصلہ کیا کہ سامان یہیں چھوڑتے ہیں اور اپنے اونٹ لے کر صحرا میں کہیں نکل جاتے ہیں؛ صبح روشنی میں آ کر اپنا سامان لے جائیں گے۔ یہ سوچ کر ہم سب وہاں سے نکل گئے۔

صبح دھوپ چڑھے جب قاضی اللہ دتہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سارا سامان غائب تھا--- جہاں وہ ملکہ جن رات کو سوئی تھی، وہاں چادر بچھے پر ہم بستری کی واضح علامات موجود تھیں--- زمین پر ہمارے پیروں کے نشانات صاف نظر آتے تھے مگر عورت کے پیروں کا ایک بھی نشان نہیں تھا---!

میں عالم خواب میں ہوں--- کبھی سوتا ہوں، کبھی جاگتا ہوں--- کوسٹر ہچکولے لیتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی جھولا سا جھلا رہا ہے--- دماغ جاگتا ہے مگر تھکن سے چور جسم سوتا ہے---

پہلو کے طلسماتی درخت کے پچھواڑے، وہ بوسیدہ، چھت بریدہ، فصیل قلعہ کے اندر ایک پراسراری آثار قدیمہ عمارت ہے--- وہ ''یعقوب مندر والا محل'' کا تباہ حال کھنڈر ہے--- جہاں کل بھی جنات رہتے تھے اور آج بھی وہاں جنات کا بسیرا ہے--- جب آپ لوگ دوپہر میں اس جنات کے رین بسیرے میں سرگشت کر رہے تھے تو کیا آپ کو

معلوم تھا کہ اس یعقو مندر والا محل کے کھنڈر میں جنات کا سردار آپ کو دیکھ رہا تھا! اس جن کا سر بڑا، داڑھی سرخ انگارہ ہے-- اسی نے تو آپ سے پوچھا تھا-- بابا کدھر پھرتے ہو-- تو آپ اور میں سمجھے تھے کہ کوئی سن رسیدہ، باولا بڈھا شاید کوئی دست سوال بڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے-- نہیں-- وہ دراوڑ کی قومِ جنات کا سردار تھا-- جس کی سرخ آنکھیں اور ٹیڑھے پاؤں اور بے دانتوں کے پوپلے منہ میں سانپ کی طرح لپ لپ کرتی زبان نے خوف زدہ کر دیا تھا-- اس نے قہر آلود نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پھر وہ یعقو مندر محل کے ایک بوسیدہ کواڑ دروازے میں داخل ہو گیا-- اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا-- بس ایک لومڑی بھاگ کر دیوار کے تنگ موکھلے سے پار نکل گئی تھی-- جنات کے سردار نے اتنے انسانوں کا ہجوم دیکھ کر لومڑی کا روپ دھارا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا--!

وہ بوسیدہ مندر اور گردوارہ یاد ہے آپ کو، جو قلعہ دراوڑ کی شمال مشرقی فصیل کے کونے پر آمنے سامنے ہے۔ جہاں کل دوپہر ہم تصویریں بناتے، دھوپ اور گرمی سے بے حال مندر کی بوسیدہ عمارت کے سائے میں ہانپ رہے تھے--!

اکثر شام کو مغرب اور عشاء کے عین درمیان میں، جب چاروں طرف کے کھنڈروں سے کالی بلیاں، لومڑیاں اور گیدڑ ایسے نکل آتے ہیں کہ جیسے مُردوں میں جان پڑ گئی ہو-- عین اُسی وقت ایک نوجوان لڑکی، سرخ جوڑا پہنے، زیورات سے آراستہ، کنگھی پٹی سے بال مانگ سجائے، گھنے، لمبے بالوں کی مانگ میں سندھور رچائے، ماتھے پر انگارہ تلک لگائے، ایک سینی میں سات چراغ جلائے سامنے کے خوفناک اور ہوش رُبا کھنڈر کی بوسیدہ گلی کی آڑ سے نکلتی ہے-- پہلے وہ سیدھی مندر کے اکلوتے چراغ جھروکے میں آتی ہے، بڑے ادب سے ماتھا ٹیک کر پرنام کرتی ہے اور سینی سے ایک روشن چراغ اٹھا کر جھروکے میں سجا دیتی ہے-- پھر وہ ادائے بے نیازی کے ساتھ گردوارے کے دروازے پر آتی ہے، ماتھا ٹیکتی ہے اور دوسرا چراغ دروازے کے پہلو میں رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کچھ اشلوک بڑبڑاتی ہے-- پھر وہ وہاں سے قلعہ کی اندھیری فصیل کے ساتھ ساتھ پراسرار قدموں سے چلتی ہوئی مشرقی کونے کی طرف آتی ہے-- جب وہ چلتی تو لگتا تھا کہ وہ ہوا میں نرمی روی کے ساتھ اڑ رہی ہے۔ اس کے پیروں میں چھنکتی جھانجھریں، دھیرے دھیرے چھن چھن کرتی ہیں-- اس کے ہر قدم کی دھمک کے ساتھ چھن چھناتی جاتی ہیں-- کونے کی بڑی فصیل کے نیچے کھڑے ہو کر ایک اداس نظر سے وہ اوپر، بہت اوپر کی طرف دیکھتی ہے-- وہاں خواب محل ہے، جہاں کبھی چاندنی راتوں میں رُومان پرورش پایا کرتے تھے، حریری پردے لہراتے اور مسہریوں کے کناروں پر چاندی کے کٹوروں میں گلاب اور موتیے کے پھول مہکا کرتے تھے اور سفید ابرق نازک

اندام بدن اپنی جوانی کی خوشبو سے مہکا کرتے تھے--وہ پُر اسرار، سرخ لباس حسینہ خواب محل کو ایک نظر دیکھ کر پھر سے سر جھکا کر قلعے کی مشرقی فصیل کے ساتھ ساتھ، جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتی ہوئی صحابہ کرام کی قبور کے احاطے میں آتی ہے--جھک کر آداب کرتی ہے--ایک ایک چراغ ہر قبر کے سرہانے رکھتی ہے، پھر دروازے میں سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہے۔

رات بڑھ گئی ہے--اندھیرا چھا چکا ہے--وحشت اور خوف نے ہر سمت اپنے خون آشام پنجے سے گاڑ دیئے ہیں-کوئی آدم زاد میلوں دکھائی نہیں دیتا اور وہ سرخ سہاگ کے جوڑے میں بجی نامعلوم اور سحر انگیز حسینہ ان چاروں قبروں کو کبھی کبھی نظر اٹھا کر دیکھ لیتی ہے۔

اس اتھاہ خاموشی میں اس کی سسکی جاگتی ہے--پھر وہ گھٹنوں میں سر دے کر سسک سسک کر، گھٹ گھٹ کر آہیں بھرتی ہے--اس کے آنسو خشک دہلیز کی ریت میں جذب ہو جانے لگتے ہیں--!

باہر صحرائی جھاڑیوں میں کالے بلے آپس میں لڑنے لگتے ہیں--بلیاں بڑی کرب ناک آواز میں چیخنے، رُلنے، رونے لگتی ہیں--!

سکوت اور خاموشی میں دراوڑ کی فصیلیں، جنات کے شہر میں تبدیل ہو جاتی ہیں--!!!

فیری میڈوز
سفر نامہ
آغا سلمان باقر
کشمیر
فردوسِ بریں
سفر نامہ
آغا سلمان باقر
دھماکہ لیک سوات
سفر نامہ
آغا سلمان باقر
کیلاش
میں چلم جوشی
سفر نامہ
(زیرِ طبع)
آغا سلمان باقر